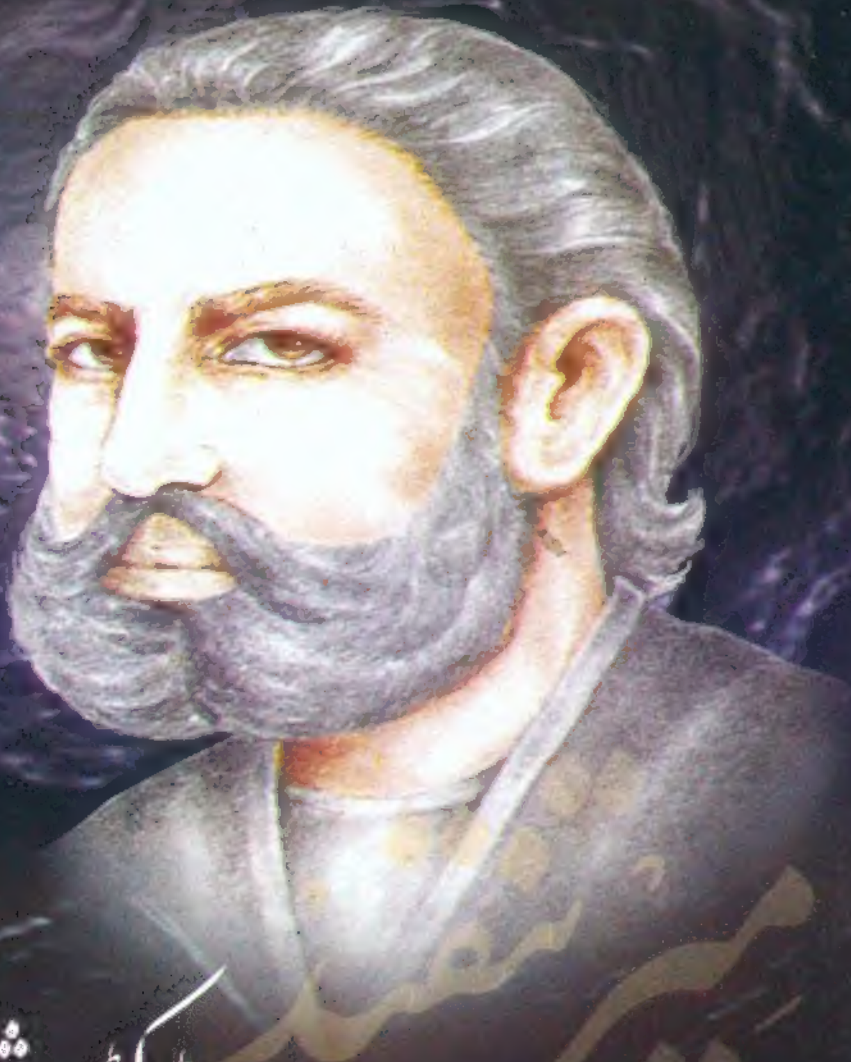
میر تنقید

تذکروں سے عصرِ حاضر تک



میر تنقید

ڈاکٹر ریشماں پروین

میر تنقید

تذکروں سے عصرِ حاضر تک

MEER TANQEED

(Tazkaron se Asre Hazir Tak)

by

Dr. Reshma Parveen

Years of Ist Edition 2009
ISBN 978-81-8223-487-1

نام کتاب	:	میر تنقید: تذکروں سے عصرِ حاضر تک
مصنفہ	:	ڈاکٹر ریشماں پروین
اشاعت اوّل	:	۲۰۰۹ء
کمپوزنگ	:	یونک کمپیوٹر سینٹر۲۔ شباب مارکٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ
قیمت	:	۳۰۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

پاپا: عطاء الرحمٰن

بابا: شارب ردولوی

اور

پروفیسر عقیل احمد صدیقی

کے نام

جن کی دُعاؤں، تربیت اور رہنمائی نے

مجھے اس منزل تک پہنچایا

ریشماں پروین

فہرست

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

حرفِ آغاز

میر تقی میرؔ اُردو کے عظیم شاعر ہیں۔ اُردو شعراء اور ناقدین سب نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ اس حیثیت سے ان کی شخصیت اور شاعری ہمیشہ گفتگو، تجزیہ، تنقید اور تشریح کا موضوع رہی ہے۔ میرؔ تنقید کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر جب مجھے تحقیقی مقالے کے لیے یہ موضوع دیا گیا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ احساس ہی میرے لیے قابلِ فخر تھا کہ میں اُن ناقدین کا تنقیدی مطالعہ پیش کروں جنھوں نے میرؔ جیسے ممتاز شاعر کے کلام پر اظہارِ خیال کیا۔ یہ آسان کام نہیں تھا اور شاید اس وقت مجھے ان دشواریوں کا اندازہ بھی نہیں تھا جو بعد میں پیش آئیں کیونکہ ایک طرف تو میرؔ جیسی عظیم شخصیت جس کا کلام اُردو شاعری کا شاہکار ہے اور دوسری طرف اُن کے کلام پر لکھنے والے ناقدین۔ غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچی کہ میرؔ پر تو اُردو تنقید کے آغاز سے ہی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تذکروں سے لے کر عصرِ حاضر تک شاید ہی کوئی دور ایسا گزرا ہو جب ناقدین نے ان کی شاعری پر قلم نہ اُٹھایا ہو خود میرؔ بھی اپنے زمانے کے اہم ناقد ہیں چنانچہ ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے تنقیدِ میرؔ کے مطالعے کے لیے اپنے مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب کو سہولت کی غرض سے تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ اوّل ان تذکروں میں پائی جانے والی تنقیدِ میرؔ سے متعلق ہے جو میرؔ کی حیات میں لکھے گئے جن میں بعض تذکروں کی حیثیت جوابی تذکروں کی ہے جو نکات الشعراء کے جواب میں لکھے گئے یا بعض ایسے تذکرے جو دکن میں لکھے گئے اور صرف جنوبی ہند کے شعراء کے ذکر تک محدود ہیں۔ ایسے تذکروں میں میرؔ یا شمالی ہند کے دوسرے شاعروں کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن میرؔ کے عہد یا زندگی میں لکھے جانے والے دوسرے تذکرے ایسے ہیں جن کی نقدِ میرؔ کے سلسلے میں بڑی اہمیت ہے۔ اس باب کے دوسرے حصّے میں میرؔ کی وفات کے بعد لکھے جانے والے تذکروں کا جائزہ لیا گیا ہے یہ تذکرے اس لیے بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں غیر جانبداری کے ساتھ میرؔ کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرؔ کی زندگی کے تعصّبات یا ان

سے بعض تذکرہ نگاروں کی ذاتی پرخاش کا اثر ان تذکروں پر نہیں ملتا۔ دوسرے اس عرصہ میں تنقیدی شعور میں جو بالیدگی اور پختگی آئی اس کا اثر نقدِ میر میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

پہلے باب کا تیسرا حصہ تاریخی شعور رکھنے والے تذکروں آبِ حیات، (۱۸۸۰ء) (اُردو) گلِ رعنا (۱۹۲۴ء) (اُردو) اعجازِ سخن اور جواہر سخن (۱۹۳۳) کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ جس طرح اُردو تنقید میں ان تذکروں کو ایک نیا موڑ قرار دیا جاسکتا ہے اسی طرح یہ تنقید میر میں ایک نئے رجحان کا پتہ دیتے ہیں۔ ان تذکروں میں دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی صورت تاریخی اور سوانحی ہے جس میں میر کی زندگی اور ان کی سوانح کا تاریخی مطالعہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ان کے حالاتِ زندگی کو اُن کے کلام پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تذکروں کے بعد اُردو میں جدید تنقید کا آغاز حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں مقدمے کی اشاعت کے بعد اردو تنقید نکتہ چینی اور خردہ گیری سے نکل کر محاسن و معائب کے تعین کے میدان میں آ گئی یہ ایک بہت بڑی جست تھی جو اُردو تنقید نے تذکروں کے عہد سے نکلنے کے لیے لگائی۔ حالی کے یہاں میر کا ذکر بہت کم ملتا ہے یوں بھی اگر دیکھا جائے تو حالی نے شخصیتوں کا ذکر کم کیا ہے۔ میر کا ذکر انھوں نے نیچرل شاعری کے سلسلے میں کیا ہے یہاں پر بھی چونکہ حالی روایتی شاعری سے گریز کر رہے تھے اور انھیں میر کے یہاں نیچرل شاعری کے عناصر نظر آئے لہٰذا انھوں نے میر کا ذکر کیا۔ یہ ذکر خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو لیکن نقدِ میر کے سلسلے میں ایک نئے مطالعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اسی عہد کے دوسرے بڑے ناقد شبلی کا موضوع تقریباً مختلف تھا۔ اسی لیے میر کا ذکر بھی شعر العجم اور ان کے مضامین میں نہیں ملتا ہے۔ کم و بیش اسی عہد میں امداد امام اثر کی کتاب ''کاشف الحقائق'' (۱۸۹۷ء) شائع ہوئی۔ میر کو وہ وارداتِ قلبیہ کا شاعر قرار دیتے ہیں اور اُن کے کلام میں داخلیت، سوز و گداز، خستگی، نشتریت اور رنگینی جیسی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔

مقالے کا تیسرا باب ''میر کے اہم ترقی پسند ناقدین'' ہے۔ اس باب میں ان ممتاز ترقی پسند ناقدین کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جنھوں نے کلام میر کو نئے مفاہیم و معنی عطا کیے ان ناقدین میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، سید اعجاز حسین،

علی سردار جعفری، اختر اورینوی، محمد حسن، عبادت بریلوی، ظ۔ انصاری، شارب ردولوی اور یوسف سرمست، کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

باب چہارم میر کے دوسرے اہم ناقدین سے متعلق ہے۔ یہ باب اس لیے بہت اہم ہے کہ نقدِ میر کی چھ دہائیوں کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس میں صفدر آہ کی ''فلسفہ میر'' (۱۹۳۶ء) سے شمس الرحمٰن فاروقی کی شعرِ شور انگیز (۱۹۹۴ء) تک میر شناسی کے مختلف ادوار اور مختلف رجحانات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

پانچواں باب میر پر مختلف رسائل کے خاص نمبر، مضامین کے مجموعے، میر کے کلیات اور متفرق مضامین پر مبنی ہے۔ میر پر کتنے مضامین لکھے گئے اور کن کن رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں۔ لیکن یہاں پر ان تمام خاص نمبروں اور مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے، جن تک رسائی ہو سکی۔

مقالے کے چھٹے باب میں میر تنقید کے مختلف ابعاد سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب کی نوعیت تمام ابواب کے خلاصہ بحث کی ہے یعنی میر تنقید کی جن نوعیتوں کی مختلف ابواب میں نشاندہی کی گئی ہے ایک نتیجے پر پہنچنے کے لیے انھیں اس باب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

مقالے کے آخر میں کتابیات شامل ہے جس میں حوالہ جاتی کتابوں کے علاوہ، مضامین و رسائل کی فہرست بھی دے دی گئی ہے جن سے اس مقالے کی تکمیل میں براہِ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل میں جن لوگوں کی کرم فرمائیاں شامل رہیں ان کا شکریہ نہ ادا کرنا ناسپاسی ہوگی، اس سلسلے میں سب سے پہلے پروفیسر عقیل احمد صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کی نگرانی میں، مَیں نے یہ مقالہ مکمل کیا۔ انھوں نے ہر مشکل موقع پر جس طرح میری مدد اور حوصلہ افزائی کی وہ میرے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے، اپنی علالت کے دوران بھی انھوں نے میرے مقالے کو پڑھا اور مشورے دیے۔

میں پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی بے انتہا مصروفیات کے باوجود ہمیشہ میرے موضوع میں دلچسپی لی اور میری تحقیق کے سلسلے میں مجھے بیش قیمت مشورے دیے۔

میں پروفیسر قیصر جہاں، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر قاضی جمال حسین کی ممنون ہوں کہ میں نے جب کبھی کسی علمی اور تحقیقی سلسلے میں ان کی طرف رجوع کیا تو ان حضرات نے ہمیشہ میری مدد کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

مجھے اپنے تمام اساتذہ خاص طور پر ڈاکٹر جمال آرا نظامی، پروفیسر سید محمد ہاشم، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر نیلم فرزانہ، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر طارق چھتاری اور اُن تمام اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جن کی رہنمائی مجھے حاصل رہی۔

میں اپنے بابا (پروفیسر شارب ردولوی) کی بھی ممنون و مشکور ہوں جن کی شفقت اور رہنمائی مجھے اس کام کی ہر منزل پر حاصل رہی۔ آپا (پروفیسر شمیم نکہت) نے ماں بن کر اور ارم نے چھوٹی بہن کی طرح ہمیشہ میری ہمت بڑھائی اور میری مایوسیوں کو حوصلے میں بدل دیا۔ میں عابد سہیل صاحب کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر موقع پر میری حوصلہ افزائی کی۔

اس موقع پر پروفیسر محمد شریف خاں صاحب (مرحوم) اور ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر (مرحومہ) کی یاد بار بار آرہی ہے جنھوں نے میری تعلیم کی ہر منزل اور مشکل پر میری مدد کی اور دشواریوں سے لڑنا سکھایا۔ آج اگر یہ لوگ ہوتے تو انھیں کتنی خوشی ہوتی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں مولانا آزاد لائبریری کے اُردو سیکشن کی انچارج شائستہ صاحبہ، شعبۂ اُردو کی سیمنار انچارج رابعہ آپا، میر باقر حسین، ایس۔ ایم۔ محسن جعفری، نسرین آپا اور سہیل صاحب، امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، پٹنہ کا شکریہ نہ ادا کروں جنھوں نے کتابوں اور رسائل کی فراہمی میں میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔

ان دوستوں اور ساتھیوں کا شکریہ کس طرح ادا کروں جن کی محبتوں نے مجھے ہر گام پر سہارا دیا، سنجیدہ، جیوتسنا، مرزا شفیق حسین شفق، ویدہی سنگھ، زبیر شاداب، نفیس احمد، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، کہکشاں، راشدہ، شائستہ، ارشد، رضا حیدر، حنا اور ثنا سب کا فرداً فرداً شکریہ کہ یہی میری کل کائنات ہیں۔

میں اپنے محترم دادا فضل الرحمٰن صاحب اور دادی خورشیدہ صاحبہ کی بھی ممنون و مشکور ہوں جن کی ہدایتیں ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ رہیں گی۔

زندگی کی کڑی دھوپ میں والدین اُن گھنے سایہ دار درختوں کی طرح ہیں جن کے

سائے میں مجھے ہمیشہ حقیقی سکون واطمینان ملا ہے۔ان کا شکریہ میں ادا نہیں کر سکتی، یہی سبب ہے کہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں میری زبان گنگ ہو چکی ہے۔ان مقدس ومحترم ہستیوں (والد عطاء الرحمٰن صاحب اور والدہ شاہدہ خاتون صاحبہ) کی محنتوں، شفقتوں، محبتوں کا کوئی بدل ممکن ہی نہیں یقیناً والدین اس جہان کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔میرے لیے یہ بات بے حد تکلیف دہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے وقت میرے پاپا میرے ساتھ نہیں ہیں مگر ان کا خلوص، اُن کی دعائیں سب انمول ہیں اور میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔میں اپنے پاپا کے لیے بس یہی کہہ سکتی ہوں۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

میں اپنے عزیز چچا مجیب الرحمٰن اور ذیشان احمد، بھائیوں شمس الرحمٰن، قمر الزماں، گلشن، اور بہن اسماء کی بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے تحقیقی مراحل کی تمام مشکلات کو میرے لیے آسان بنادیا۔

میں یونیک کمپیوٹر سینٹر، ندوہ روڈ، لکھنؤ کے انچارج جناب سید محمد نورالحسن صاحب کی بھی ممنون ہوں جن کی توجہ سے یہ مقالہ کمپوز ہو سکا۔

یہ مقالہ میری اوّلین کوشش ہے کیونکہ ادب میں کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہوتا خصوصاً تنقید وتحقیق کو کسی کوزہ میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ہر روز نئے نئے نکات سامنے آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔ ہمارے بعد کی نسلیں اس میں سے اور جواہر ریزے نکالیں گی۔شاید اس میں میری اس حقیر کاوش کو بھی کوئی مقام مل جائے۔

ریشماں پروین
لیکچرر کھن کھن جی، پی۔جی۔گرلس کالج
چوک، لکھنؤ

باب اوّل

نقدِ میرؔ کا نقشِ اوّل

تذکرے

میرؔ کی حیات میں لکھے گئے تذکرے

میرؔ کی وفات کے بعد لکھے گئے تذکرے

تاریخی شعور والے تذکرے

میرؔ اُردو کے اہم ترین شاعر ہیں اور شاید وہ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جن کی شاعرانہ حیثیت اُن کے عہد میں بھی تسلیم کی گئی اور آج تین سو سال گزرنے کے بعد بھی اسی طرح قائم ہے۔ان کی اس شہرت اور مقبولیت کے باوجود نقدِ میرؔ کا اثاثہ نسبتاً کم ہے۔حالانکہ اپنے عہد سے لے کر آج تک میرؔ ناقدین کی توجہ کا مرکز رہے۔قدیم تنقید میں بھی کلام میرؔ ناقدین کی توجہ کا مرکز رہا اور جدید زمانے میں تو اُن کے محاسنِ شعری پر مختلف انداز سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قدیم تنقید پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کا سلسلہ ہمیں تذکروں تک لے جاتا ہے۔تذکرے اُردو کے ناقدین اور محققین کی نگاہ میں بحث کا موضوع رہے ہیں۔بعض ناقدین اُن میں ظاہر کی گئی آراء کو تنقید کا درجہ نہیں دیتے۔ان کے خیال میں ''نکات الشعراء'' کے بارے میں ظاہر کی گئی ''فتح علی حسینی گردیزی'' کی رائے ''خردہ گیری ہمسراں وستم ظریفی با معاصرانست'' اس وقت کے بیشتر تذکروں کی تنقید پر عائد ہوتی ہے،بعض ناقدین اُردو تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں پاتے ہیں اور ان کی نگاہ میں تاریخی اعتبار سے تذکروں کی بڑی اہمیت ہے اگر تذکرے نہ لکھے گئے ہوتے تو اس عہد میں ہونے والے **Developments** کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔

تذکروں میں ظاہر کی گئی رائے بظاہر کتنی ہی تاثراتی یا ذاتی کیوں نہ ہو اس کے پیچھے تنقید کا ایک تصور ضرور ملتا ہے۔تذکروں میں استعمال کی گئی اصطلاحات کو ''خوردہ گیری ہمسراں'' قرار دے کر نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات سے کون سے تصور وابستہ ہیں اور ان کے پیچھے معنی کی کون سی کائنات پوشیدہ ہے۔

نقدِ میرؔ کا نقشِ اوّل بھی ہمیں اُردو تذکروں ہی میں ملتا ہے۔اُردو تذکروں میں میرؔ کے نکات الشعراء کو اوّلیت حاصل ہے جو ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں لکھا گیا ہے۔حالانکہ اسی سال دو اور تذکرے گلشن گفتار (خواجہ حمید اورنگ آبادی) مرقومہ ۱۱۶۵ھ مطابق

۱۷۵۲ء (فارسی) اور تحفۃ الشعراء (مرزا افضل بیگ خاں قاقشال) ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء (فارسی) بھی لکھے گئے مگر اوّلیت نکات الشعرا ہی کو حاصل رہی ''گفتار'' دراصل دکنی شعراء کا تذکرہ ہے اور اس میں صرف تیس شاعروں کا ذکر ہے جس میں سے ۱۵ شاعر دکنی الاصل ہیں۔ میر کا ذکر اس تذکرے میں نہیں ہے۔ اسی طرح تحفۃ الشعراء میں بھی کل ۶۲ شاعروں کا ذکر ہے اور یہ سب شاعر آصف جاہ اوّل اور ناصر جنگ کے عہد کے ہیں۔ اس تذکرے میں بھی میر کا ذکر نہیں ہے۔

شمالی ہند میں لکھے جانے والے تذکروں میں میرؔ کا ذکر ملتا ہے۔ اس عہد میں ساتھ ساتھ کئی تذکرے لکھے گئے نثار احمد فاروقی نے میرؔ کی آپ بیتی میں نکات الشعراء کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

''اس کی تالیف ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء سے پہلے ہو رہی تھی۔''[۱]

اسی زمانے میں سراج الدین علی خاں آرزو کے ''مجمع النفائس'' کا حوالہ بھی ملتا ہے یہ تذکرہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے تاریخ ادب اُردو میں لکھا ہے کہ

''اس کی سنہ تصنیف ۱۱۶۴ھ ہے۔''[۲]

اس طرح نکات الشعراء اور مجمع النفائس کا سنہ تالیف تقریباً ایک ہو جاتا ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنے تذکرے میں میرؔ کے بارے میں بھی رائے دی ہے اور ان کی شاعری کے متعلق تعریفی کلمات لکھے ہیں۔

> ''میر محمد تقی المتخلص بہ میرؔ۔۔۔۔۔۔ دراوّل بہ مشق اشعار ریختہ کہ بزبان اردو شعریست بطرز شعر فارسی توغل بسیار نمودہ، چنانچہ شہرۂ آفاقست و بعد آں بگفتن اشعارِ فارسی بطرزِ خاص گردیدہ، قبول خاطر ارباب سخن و دانایان این فن گشت، طبعش بہ مضامین تازہ و غیر مبتذل معنی پرواز است و اشعار ادا و انداز۔ از بسکہ ذہن مناسب و طبع ثاقب یافتہ، در ابتدائی مشق شعر رتبہ سخن را بپایہ انتہا رسانید۔۔۔۔۔۔ ہر چند میر دیوان مختصر (فارسی) دارد اما غزلہائے دردمندانہ و عاشقانہ می گوید''[۳]

مگر اس تذکرے کے سنہ تصنیف کا تعین نہیں ہے۔ خانِ آرزو کے بارے میں مشہور ہے کہ اواخر محرم ۱۱۶۸ھ/ نومبر ۱۷۵۴ء میں وہ اودھ کی طرف چلے گئے اور ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۵ء میں اثنائے سفر میں بیل گاڑی سے گر کر سخت مجروح ہوئے۔ کچھ زمانے کے بعد انتقال ہو گیا۔ ۴

اس عہد کا اہم ترین تذکرہ میرؔ کا نکات الشعراء ہے۔ میرؔ کا ذکر خود ان کے تذکرے میں چند سطروں میں ملتا ہے۔

فقیر حقیر میر محمد تقی میرؔ مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد
است بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہ جہاں آباد
است۔ (چندے از خود نوشتہ می آید) ۵

میرؔ نے نکات الشعراء میں اپنا ذکر سب سے آخر میں کیا ہے۔ اس تذکرے میں انھوں نے اس کا ذکر تو کیا کہ وہ اکبر آباد کے رہنے والے ہیں اور حالاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر شاہجہاں آباد میں مقیم ہیں۔ لیکن اپنی شاعری کے بارے میں کوئی رائے لکھنے سے گریز کیا۔ حالانکہ بالواسطہ انھوں نے اپنی شاعرانہ اہمیت کا احساس اس طرح دلایا ہے کہ ان تین سطروں کے بعد اپنے کلام کا ایک طویل انتخاب دے دیا ہے، جس میں غزلوں کے علاوہ قطعات، قطعہ بند اور رباعیات سب شامل ہیں۔ یہ انتخاب ۲۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ جب کہ اس کے نصف اشعار بھی انھوں نے کسی شاعر کے نہیں دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی شاعرانہ اہمیت کے اظہار کا ایک گوشہ اور تلاش کر لیا ہے جو خاتمہ کے نام سے نکات الشعراء کے آخری صفحہ پر درج ہے۔ بظاہر اس میں انھوں نے ریختہ کی قسمیں بتائی ہیں۔ اور اسے چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے جس کی چوتھی اور چھٹی قسم میں انھوں نے اپنی شاعری اور اپنی تعریف کا پہلو بڑی خوبصورتی سے نکال لیا ہے۔ ریختے کی چھٹی قسم کو وہ اپنی شاعری سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وہ انداز ہے جسے میں نے اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"حالانکہ ریختہ کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ان میں سے جو
کچھ فقیر کو معلوم ہیں لکھی جاتی ہیں۔ اوّل قسم وہ ہے جس کا ایک
مصرعہ فارسی کا ہوتا ہے اور ایک ہندی کا۔ مثلاً حضرت امیر رحمۃ اللہ

علیہ کا وہ قطعہ جو لکھا جا چکا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں نصف مصرع ہندی اور نصف فارسی ہوتا ہے جیسا کہ میر معز کا شعر جو درج کیا گیا۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں فارسی کے الفاظ وافعال استعمال کرتے ہیں ایسا کرنا برا ہے۔ چوتھی قسم جس میں فارسی کی ترکیبیں کام میں لاتے ہیں۔ بہت سی ایسی ترکیبیں ہیں جو ریختہ کی زبان کے لیے مناسب ہیں۔ اس لیے ان کا استعمال جائز ہے لیکن ان کو غیر شاعر نہیں جانتا۔ اور وہ تراکیب جو ریختہ کے موافق نہیں ان کا استعمال معیوب ہے۔ اوران کا جاننا بھی سلیقۂ شاعری پر منحصر ہے۔ فقیر نے بھی یہی اختیار کیا ہے۔ اگر فارسی ترکیب ریختہ کی گفتگو کے مطابق ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ پانچویں قسم ایہام ہے جس کا اس فن کے قدیم شعراء کے یہاں بہت رواج تھا۔ آج کل لوگ اس صنعت کو کم استعمال کرتے ہیں لیکن بہت سے لوگ اب بھی بہت صفائی اور شستگی سے اس کو باندھتے ہیں، ایہام کا مطلب یہ ہے کہ وہ لفظ جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے دو معنی رکھتا ہے، ایک قریب کے معنی اور دوسرے دور کے اور شاعر کو دور کے معنوں سے غرض ہوتی ہے اور قریب کے معنی کو وہ چھوڑ جاتا ہے۔ چھٹا طرز وہ ہے جو کہ ہم نے اختیار کر رکھا ہے اور وہ تمام صنعتوں پر حاوی ہے۔ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی اور خیال وغیرہ یہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں اور فقیر بھی اسی طرز سے خوش ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جو اس فن میں کسی خاص طرز کا مالک ہے ان باتوں کو سمجھتا ہے۔ مجھے عام لوگوں سے کوئی غرض نہیں ہے اور جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صرف میرے احباب کے لیے سند ہے، اس کا ہر ایک سے تعلق نہیں ہے چونکہ سخن کا میدان نہایت وسیع ہے اوراس دنیا کے تلون طبع سے آگاہ ہوں۔ اس لیے ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است ؎۶

یہ ایک بہت اہم بات ہے کہ نکات الشعراء میں میرؔ کا ذکر براہ راست نہ ہوتے ہوئے بھی پورے تذکرے پر حاوی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنا طویل انتخاب شامل کیا۔ اس انتخاب سے خود ان کے مذاقِ شعری کا اندازہ ہوتا ہے یعنی جو اشعار اپنے انھوں نے منتخب کیے وہ بعد کے زمانے میں بھی ان کے اچھے اشعار میں شمار کیے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ کو جو دسترس زبان اور شاعری پر تھی وہی شعر فہمی پر بھی تھی۔ اس کے علاوہ خاتمۂ کتاب کی شکل میں جو باتیں انھوں نے ریختہ کے بارے میں لکھیں وہ بھی توجہ کی مستحق ہیں۔ اس وقت تک کسی نے ریختہ کو اس طرح کی اقسام میں تقسیم نہیں کیا تھا۔ پھر خاص طور پر ریختے کی چھٹی قسم پر جب وہ پہنچتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ریختے کا وہ انداز ہے جو میں نے اختیار کیا اور پھر جس طرح اس انداز کی خصوصیات بیان کرتے ہیں، صنعتوں کے ساتھ صفائے گفتگو اور فصاحت و بلاغت کا ذکر کرتے ہیں اس سے ان کی تنقیدی بصیرت اور شعر شناسی کا احساس ہوتا ہے۔ میرؔ کی آراء کو صرف یہ سوچ کر کہ یہ ان کی رائے اپنے کلام کے بارے میں ہے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نہ تعلّی ہے اور نہ اپنے بارے میں میرؔ کی خوش فہمی۔ اس لیے کہ بعد کے ناقدین نے میرؔ کے کلام کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ میرؔ کی اپنی رائے کی کسی طرح نفی نہیں کرتے۔

میرؔ نے اپنے ہم عصروں کے بارے میں جو رائیں دیں اس میں ان کا تعصب ہوسکتا ہے لیکن اپنے انداز کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہے۔

نکات الشعراء کے بعد جو تذکرہ منظرِ عام پر آتا ہے وہ فتح علی حسینی کا تذکرہ ریختہ گویاں "گلشنِ راز" ہے۔ جو ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں فارسی میں لکھا گیا۔ یہ تذکرہ گردیزی نے میرؔ کے تذکرے کے جواب میں لکھا، اس کے باوجود انھوں نے میرؔ کے تذکرے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اکبر حیدری ریختہ گویاں کے مرتب کردہ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> "یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میرؔ کے نکاتِ الشعراء کے جواب میں لکھا۔ تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے میرؔ کے تذکرے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ غالباً یہ سکوت اس لیے برتا گیا کہ وہ اپنے تذکرے کی اہمیت کو بڑھانا اور نکات کی

اہمیت گھٹانا چاہتے تھے۔ اس طرح تذکرہ نویسی کا سہرا اپنے سر باندھنے کے متمنی تھے۔ معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ مقدمات گردیزی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر کے تذکرے سے بیزار تھے اور اسی لیے انھوں نے کم درجہ کے شعراء جیسے آبرو، بیان، حزیں، درد، سجاد، عزلت، اور یقین وغیرہ کے بکثرت اشعار نمونے کے طور پر درج کیے ہیں لیکن خدائے سخن کا ایک شعر اور وہ بھی معمولی درجے کا پیش کر کے اپنے دل کا بخار نکالا۔ گردیزی نے میر کے تذکرے کا بھی براہِ راست کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ان سے خوش نہیں تھے۔ ۷

خود گردیزی کے بیان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جس میں وہ تذکروں کی تنقید کو ''خردہ گیری ہمسراں ستم ظریفی با معاصرانست'' قرار دیتے ہیں۔ اپنے تذکرے کے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے:

''از ملاحظۂ تذکرہائے اخوانِ زمان کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویا (عہد محرر ساختہ اند وعلت غائے تالیف شان خردہ گیری ہمسراں و ستم ظریفی با معاصر انست در اظہار ما فی نفس الامر بایجاز پرداختہ، بلکہ از عدم اعتنا وقلت تتبع ذکر اکثر (نازک خیالانِ رنگیں نگار را از قلم انداختہ معہذا در تصحیح اخبار و تحقیق) احوال اعزہ اغلاط صریح بکار بردہ وخطاہائے نمایاں کردہ اند، بخاطر فاتر ریخت کہ تذکرۂ مرقوم ساز دو بے رودیدگی حروف تہجی بنویسد تا حاضراں راں تذکارے وغائباں را یادگار بود۔ ۸

اکبر حیدری کے علاوہ خود گردیزی کی تحریریں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ گردیزی کو نکات الشعراء کا علم تھا۔ حالانکہ ان دونوں تذکروں کے زمانۂ تصنیف میں بہت کم فرق ہے۔ نکات الشعراء کی تکمیل کا زمانہ کم وبیش ۱۱۶۵ھ قرار دیا گیا ہے اور ریختہ گویاں ۵ر محرم ۱۱۶۶ھ کو مکمل ہوا۔ اس طرح ان کے درمیان صرف چند ماہ کا فرق ہے۔ لیکن شواہد اس بات کو

ظاہر کرتے ہیں کہ گردیزی نے یہ تذکرہ میر کے بعد لکھا۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے لکھا ہے:

> ''یہ بات طے ہے کہ گردیزی نے میرؔ کے تذکرے کے
> جواب میں تذکرہ لکھا انھوں نے دیباچہ میں اس کا اظہار کیا ہے
> کہ بعض تذکروں میں معاصر شعراء کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے
> اور بعض اہم شاعروں کو جگہ نہیں دی گئی ہے اس لیے وہ ایک ایسا
> تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں جو انصاف پر مبنی ہو۔ گردیزی کا اصل
> مقصد انصاف نہیں تھا۔ اس لیے کہ تذکرۂ ریختہ گویاں میں بھی
> غیر جانبداری کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔'' 9

گردیزی میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سخن سنج بے نظیر میر محمد تقی میرؔ تخلص، زادگاہش اکبر آباد
> است و طبعش معنی ایجاد، شمع استعدادش برکردہ، شعلہ ادراک
> سراج الدین علی خاں آرزو است۔ فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمے
> آب دادہ، حقا کہ دراں تلاش معنی بیگانہ کردہ است و حرفِ آشنارا
> بروئے کار آوردہ۔'' 10

بہر حال گردیزی کو تذکرہ نگاری میں اوّلیت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن میرؔ سے اختلاف کے باوجود انھوں نے میرؔ کی شاعری کے بارے میں جو رائے دی تھی وہ میر کی شاعرانہ اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اور تنقید میرؔ کے سلسلے میں اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے میرؔ کو سخن سنج، اور معنی ایجاد قرار دیا ہے اور یہ دونوں چیزیں اگر تنقید کی اصطلاح کی شکل میں دیکھی جائیں تو بہت اہم ہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب ہم تنقید کا لفظ اس عہد کے بارے میں استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ تصور نہیں وابستہ کیا جاسکتا جو تنقید کا آج کا تصور ہے۔ اس زمانے میں ہمیں صرف اشارے ملتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ اشارے بلیغ ہیں اور ان کے اندر بڑی معنوی وسعت ہے، اس لیے سخن سنج، یا معنی ایجاد کو صرف خوبصورت تراکیب کہہ کر نہیں گزرا جاسکتا۔ معنی ایجاد کا لفظ شعر کی بہت بڑی خوبی یعنی معنی آفرینی کا احاطہ کر لیتا ہے۔

''تذکرہ ریختہ گویاں'' میں کلام میرؔ کے بارے میں گردیزی کی رائے میرؔ کے

کلام پر پہلی تنقید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے نکات میں میرؔ نے جو لکھا وہ ان کی اپنی رائے تھی لہٰذا اسے میرؔ کی تنقید میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ تذکروں میں پائی جانے والی تنقید کو اگر تنقید مانا جائے تو گردیزی میرؔ کے پہلے نقاد اور اُردو کے پہلے میرؔ شناس ہیں۔ جنھوں نے میرؔ کی شعری اہمیت کا اعتراف کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ میرؔ کے تذکرے اور خاص طور پر ہمعصر شعراء کے بارے میں ان کے رویے سے ناخوش تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کا بدلہ اس طرح لیا کہ انتخاب کلام میں میرؔ کا صرف ایک شعر منتخب کیا اور وہ بھی کمتر درجہ کا۔ جب کہ دوسرے شعراء کے کلام کے طویل انتخابات شامل کیے ہیں۔

میرؔ کی زندگی میں لکھے جانے والے تذکروں میں تیسرا تذکرہ مخزنِ نکات ہے جسے ۱۱۶۸ھ/ مطابق ۵۵۔۱۷۵۴ء میں قیام الدین قائم نے مرتب کیا۔ یہ تذکرہ بھی فارسی میں ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار اُردو شاعری کو ادوار میں تقسیم کیا گیا۔ قائم نے اس تذکرہ میں ہر دور کی ابتدا میں اس کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں، ساتھ ہی دکنی شعراء کا بھی ذکر کیا ہے۔ میرؔ کے متعلق قائم کی رائے ایک عام رائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے ان کی ذات کے بارے میں شمعِ انجمن، عشق بازاں، اور ''فروغ محفل سخن پردازاں'' تو ضرور لکھا لیکن شاعری کے بارے میں ''معجز طراز کرامت تحریر'' کہہ کر خاموش ہو گئے یعنی میرؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر انھوں نے توجہ نہیں کی۔ شاید ان کے کمالات کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا تھا اسے انھوں نے کافی سمجھا۔ ان کا کہنا ہے:

> ''شمع انجمن، عشق بازاں فروغ محفل سخن پروازاں، جامع آیات سخن داں، مجمع کمالات انسانی معجز طراز کرامت تحریر، محمد تقی المتخلص میر اصل و منشاء و لے دارالخلافت اکبرآباد است۔ درخدمت خان آرزو کہ خالوے او بود لختے دانش اندوختہ اوائل حال پیش ظہیر الدولہ بہادر می گزارند۔ چوں بادشکر آبی رسید رفیق راجہ ناگرمل گردید چنانچہ تا حال باغرو امتیاز دررفاقت اوست۔ 11

ظاہر ہے کہ قائم کے اس بیان سے میرؔ کی شاعرانہ عظمت یا اس عہد میں ان کی شعری اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد عبدالوہاب افتخار کا تذکرہ ''بے نظیر'' ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۷ء میں لکھا گیا مگر اس میں میرؔ کا ذکر نہیں ملتا۔

عنایت اللہ فتوت کا تذکرہ ریاض حسنی ۶۸-۱۱۷۳ھ / مطابق ۶۰-۱۷۵۴ء کے درمیان فارسی میں لکھا گیا۔ ریاض حسنی ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ حنیف نقوی کا خیال ہے کہ ''فتوت'' کے اس تذکرے کا ایک بڑا حصہ تذکرۂ گردیزی سے ماخوذ ہے۔ انھوں نے اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر دونوں تذکروں کے متن کا موازنہ بھی کیا ہے۔ میرؔ کے متعلق فتوت کی تحریر یقیناً گردیزی کے تذکرے کا عکس معلوم ہوتی ہے۔

گردیزی	فتوت
''سخن سنج، بے نظیر، میر محمد تقی میرؔ تخلص، زاد گاہش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد شمع استعدادش برکردہ شعلہ ادراک سراج الدین علی خاں آرزو است''	والا فکر بے نظیر، میر محمد تقی میرؔ زاد گاہش اکبر آباد است و فکرش رنگینی ایجاد۔ مصباح طبعش برکردہ تجلی کدہ ادراک سراج الدین خاں آرزو است۔''[۱۴]

فتوت کی میرؔ کے کلام کے بارے میں رائے ''نقدِ میرؔ'' کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اس میں وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جو گردیزی کے تذکرے میں ملتی ہیں۔

نقدِ میرؔ کے سلسلے میں اگر کسی تذکرے کو اہم قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ لچھمی نرائن شفیق کا تذکرہ چمنستان شعراء ہے۔ یہ تذکرہ ۷۶-۱۱۷۵ھ / مطابق ۶۳-۱۷۶۱ء کے درمیان لکھا گیا۔ تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ ''میرؔ اور گردیزی'' کے تذکروں کی مدد سے انھوں نے چمنستان شعراء کا آغاز کیا۔ اپنے اس تذکرے میں انھوں نے شعراء کے زمانہ ہائے وفات کا بھی تعین کیا۔ لچھمی نرائن اپنے تذکرے میں میرؔ کے لیے بیشتر ان اصطلاحات کو بروئے کار لاتے ہیں جو بعد میں کلام میرؔ کو پرکھنے کے لیے استعمال کی گئیں۔ وہ میرؔ کو ''میر میدانِ سخنوری'' شہنشاہ اقلیم معنی پروری، مضامین رنگین کے پیش کرنے والے اور نازک خیالی کے سرتاج جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ لچھمی نرائن کے تذکرے سے قبل گردیزی، قائم اور فتوت کے تذکروں میں میرؔ کا ذکر ملتا ہے مگر ان تمام مصنفین کے یہاں مختصراً ایک یا دو اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے۔ لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے کے ذریعہ کلام

میر کی کچھ اہم خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ جن پر بعد کے زمانے میں نقدِ میر کی بنیاد رکھی گئی۔ شفیق میؔر کے متعلق لکھتے ہیں:

''میر میدان سخنوری وشہنشاہ اقلیم معنی پروری است، اشعۂ آفتاب کلامش درمنبع الفاظ بہ نہایت درخشانی پیدا ولمعۂ ماہتاب معنیش بشب عبارت بکمال تابانی ہویدا۔ شبیر کلکش بہ تسخیر۔۔۔می پردازد و شہباز طبعش بچنگ فکر رسا بہ نخچیر ۔۔۔۔ مضامینِ رنگین می سازد ہزاران معنی بیگانہ غلام خیالش۔۔۔۔۔۔ پر فرحت مید ہد کمیابش نقطع طبع زادش چوں دررخ عزیز ومحترم وحرف رقم زدو قلمش مثالِ زرِ سفید رائج عالم۔ حقا کہ۔۔۔۔۔ و نازک خیالی سرتاج شاعراں این عصر و گل سرسبد۔۔۔۔۔حرف گیراں می نہد، وبریں کمال غریب او تذکرۂ نکات الشعراء من تصنیف میر گواہی می دید''۔۱۳

لچھمی نرائن شفیقؔ نے نازک خیالی میں میرؔ کو ''سرتاج شاعرانِ عصر اور گل سرسبد'' کہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ کی زندگی ہی میں ان کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کا شہرہ ہوگیا تھا۔ موہن لال انیس کا تذکرہ ''انیس الاحبا'' فارسی شعراء کا تذکرہ ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۹۷ھ/ مطابق ۱۷۸۲ء ہے مگر اس میں میرؔ کا ذکر نہیں ہے۔

لچھمی نرائن شفیقؔ کے بعد جو اہم تذکرہ سامنے آتا ہے وہ قدرت اللہ شوقؔ کا تذکرہ ''طبقات الشعراء'' ہے جس کا سنہ تصنیف ۷۷-۱۷۷۶ء/ ۸۹-۱۱۸۸ھ ہے۔ یعنی یہ تذکرہ میرؔ کے تذکرے کے ۲۲ سال بعد لکھا گیا۔

قدرت اللہ شوقؔ کے تذکرے سے پہلے کئی تذکرے بشمول نکات الشعراء لکھے جاچکے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تذکرے شوقؔ کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ اسی لیے شوقؔ کے تذکرے میں نہ صرف یہ کہ شعراء کی تعداد زیادہ ہے بلکہ شعراء کے کلام کے بارے میں جو رائے دی گئی ہیں وہ بھی تفصیلی ہیں۔

قدرت اللہ شوق نے میرؔ کا ذکر بھی قدرِ تفصیل سے کیا ہے اور سوداؔ کی ہم زمین غزلیں

ساتھ میں دے کر ایک طرح سے میر و سودا کے کلام کا تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر کے کلام کی ان خصوصیات کا انھوں نے احاطہ کیا ہے جن کا ذکر بعد کے زمانے میں میر کے کلام کی تنقید کے سلسلے میں ہوتا رہا ہے۔ میر کے بارے میں قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے:

محمد تقی تخلص میر متوطن اکبر آباد و ہمشیرہ زادہ سراج الدین علی خاں آرزو، مصنف تذکرہ شعرائے ہندوستان، صاحب دیوانِ مربوط وکلاں از اعاظم مستعدان، اکابر عالی فطرتانِ زمانِ خود است۔ شاعر پر مغز و ہمہ داں۔ استاد ہم چشماں، اکثر سخن طرازاں و معنی یاباں محاورات (و) روز مرات این فن از ایشاں اخذ نمودہ۔ از مغتنمات زمانہ و استاد یگانہ شہسوار سمند عرصۂ فصاحت، فارس مضمار بلاغت، مجمع قابلیت و ہنر صاحب طبع خوش فکر، سرآمد مستعدانِ عصر محاورہ دان متین، متلاشی مضامین رنگیں، متجسس الفاظ چرب و شیریں، ہر چند سادہ گو است، اما در سادہ گوئی تہ داری و پرکاری ظاہر و نمودار است۔ از مدتے بسبب افراط و تفریط روزگار و ناہنجار ہمراہ ناگرمل کہ دیوان تن و دخیل بادشاہی بود، در قلعۂ ڈیک شنیدہ می شود حق تعالیٰ زندہ دارد'' ۱۴

قدرت اللہ شوق میر کو شاعر پر مغز، و ہمہ داں، سخن طراز، محاورات و روزمرہ پر قدرت رکھنے والا، سمندِ عرصۂ فصاحت، فارس مضمار بلاغت صاحب طبع، خوش فکر، محاوراں دان و متین قرار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میر کی ایک اور اہم خصوصیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔ ''ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی تہہ داری و پرکاری او ظاہر و نمودار است'' شوق نے پہلی بار میر کو سادہ گو، پرکار شاعر قرار دیا اور روزمرہ اور محاورے پر ان کی گرفت کی طرف اشارہ کیا، عام طور پر تذکروں کی تنقید کو خوردہ گیری کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن میر کے سلسلے میں پہلی بار شوق کی رائے کو ایک متوازن تنقیدی رائے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر شوق کے الفاظ پر توجہ دی جائے تو متذکرہ اقتباس میں تقریباً ان تمام باتوں کا ذکر آ جاتا ہے جو جدید تنقید میں تفہیم میر اور میر کی تعیین قدر کے سلسلے میں لکھی جاتی ہیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> ''طبقات الشعراء میں جس طرح میر کے تجسس الفاظ اور تلاش مضمون کو اہمیت دی گئی ہے اس کے پس منظر میں اسی تذکرے میں موجود رائے ''ہر چند سادہ گو است اما در سادگی و پرکاری ہادارد'' کی نشان دہی بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس خیال کی بنیاد بھی خود میر کا یہ شعر ہو ۔
>
> کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
> ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا
>
> اس لیے کہ پرکاری کی نشاندہی، اور تجزیے کے ذریعہ اس پرکاری کا قرار واقعی ثبوت فراہم کیے بغیر تنقید اپنی کارکردگی مستحکم نہیں کرسکتی۔ ماضی قریب میں میر فہمی کی جو منظم کوششیں ہوئی ہیں ان کو وسیع معنوں میں میر کے تہہ دار اور پرکار شعری طریق کار کی تفہیم کے رجحان کے علاوہ کوئی اور جامع نام نہیں دیا جاسکتا۔ ۱۵

چنانچہ میر کی ابتدائی تنقید اور خاص طور پر میر کی زندگی میں لکھی جانے والی تنقید میں قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعراء ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

طبقات الشعراء کے بعد میر حسن کا تذکرہ شعرائے اُردو لکھا گیا اس کا سنہ تصنیف ۱۱۹۱ھ/ ۷۸۔۱۷۷۷ء ہے۔ میر حسن لکھتے ہیں:

> ''میر شعرائے ہندوستان وافصح فصحائے زماں، شاعر دلپذیر و سخن بے نظیر، میاں محمد تقی المتخلص بہ میر رفعت رواف کاخ بیانش از طاق سپہر برتر و گوہر کان ضمیرش از جوہر میر عالی گوہر، فکر عالیش در عین خوش آبی بہ طبع روانش بہ نہایت شادابی، چراغ نثرش روشن و ساخت نظمش گلشن، شعرش چوں در خوش آب و انداز سخنش بے حساب، صیقل ذکائے او زنگ زدائے آئینۂ خورشید پیش ضیائے او روئے رخشان ماہِ سفید، از استادان صاحب قدرت است۔ طرزش مانا بطرزِ شفائی، برادر زادہ سراج الدین

> علی خاں آرزو وہم از شاگردان اوست۔ متوطن اکبرآباد جواں محمد شاہی الحال در شاہجہاں آباد است۔ سن او قریب شست رسیدہ و تذکرہ متقدمین و معاصر از تالیف او بیادگار ماندہ است۔ رباعی و غزل و قصیدہ و ہجو و مدح ہمہ می گوید لیکن آنچہ گوید از غزلیات کہ بسیار بہ انداز و طرز او می ترادد بلکہ گرم بازاری اوست از ہمیں است بسیار صاحب دماغ است و دماغ او رامی زیبد۔ خدا ایش سلامت و با کرامت دارد۔"[۱۶]

میر حسن کی اس رائے میں میرؔ کے کلام پر کوئی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے۔ صرف ان کی تحسین اور مدح سرائی کی گئی ہے۔ میر حسن کی رائے سے میرؔ کے کلام کے بارے میں کسی خاص بات کا اندازہ نہیں ہوتا جب کہ ان سے پہلے شوقؔ اور شفیقؔ کے تذکروں میں میرؔ کی خصوصیات کا ذکر زیادہ تنقیدی بصیرت کے ساتھ ملتا ہے۔ اسی لیے میر حسن کے تذکرے کو نقدِ میرؔ کے سلسلے میں اہم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ میر حسن ان کی طبع رواں کو بے حد شگفتہ اور شاداب کہتے ضرور ہیں لیکن ان سے بھی محاسنِ کلامِ میرؔ پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔

میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کے ساتھ ہی لکھا جانے والا ایک اور تذکرہ ہے جو میرؔ کی زندگی میں لکھا گیا۔ یہ تذکرہ میر غلام حسن شورشؔ عظیم آبادی کا تذکرہ رموز الشعراء/ تذکرۂ شورش ہے۔ یہ ۱۱۹۱ھ/ ۸۔۱۷۷۷ء میں لکھا گیا۔ تذکرۂ شورش کلیم الدین احمد کی کوششوں سے سامنے آیا۔ اس تذکرے کے مطالعے سے پہلا خیال یہ آتا ہے کہ یہ تذکرہ گردیزی کے تذکرے کی طرح نکات الشعراء کے جواب میں لکھا گیا۔ نکات الشعراء میں میرؔ نے ریختہ کی چھ قسمیں بتائیں۔ شورش نے اس میں دو قسموں کا اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے میرؔ کے کلام پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے میرؔ پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی سیادت پر بھی سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ شورش کے تذکرے میں اگر میرؔ کے کلام پر اعتراضات کا علمی و ادبی سبب بتایا گیا ہوتا تب بھی ان کی رائے کو تنقید میں شمار کیا جا سکتا تھا لیکن وہ عیب جوئی اور خوردہ گیری سے آگے نہیں بڑھتے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> شاعرِ بے نظیر محمد تقی میرؔ تخلص شاگرد۔۔۔۔۔ آرزو

> متوطن اکبر آباد الحال در شاہجہاں آباد تشریف می دارند وفخر شاعراں دہلی خودرامی دانند۔ چنانچہ در تذکرۂ خودشعرِ شاعران ہندوستان غلط تلاش نمودہ مرقوم ساختہ اگرغلط بدست نیامدہ۔تاہم اعتراض بے جاواصلاح خود جاری نمودہ و زندہ و مردہ کسے را سلامت نگذاشتہ مگر بعض اعزہ کہ ازو مربوط بودند آں رامحفوظ داشتہ۔غرض عجب کسے است ودر تذکرہ خود را سید نوشتہ اند۔ مرد ماں می گویند کہ شیخ است۔چنانچہ کسے گفتہ۔
>
> شیخ تقی نام ہواور میر کہاوے دیگرے می گوید۔
>
> دلّی میں اک شیخ زادہ گنجے کا میر ہے
>
> سوائے ازیں سید فتح علی گردیزی درتذکرۂ خود تقی میر را سید نہ نوشتہ است پس ایشاں برائے استحکام سیادتِ کاذبہ تخودمیر تخلص نمودہ اند"۔[۱]

ان تذکروں میں بہاء الدین حسین خاں عروج کے تذکرے بہار و خزاں کا ذکر بھی آتا ہے جو۱۱۹۲ھ/ ۷۹۔۱۷۷۸ء میں فارسی میں لکھا گیا لیکن تلاش کے باوجود حاصل نہیں ہوسکا۔اس لیے میرؔ کے بارے میں انھوں نے کوئی رائے دی ہے یانہیں یااس رائے کی کیا نوعیت ہےاس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں ابوالحسن امر اللہ آبادی نے ''تذکرہ مسرّت افزا'' لکھا۔اس میں بھی شورش کے تذکرے کی طرح سے میرؔ کی شخصیت ان کے مزاج اورحسب نسب پر حملے کیے گئے ہیں۔اس تذکرے میں نکات الشعراء سے برہمی کا اظہار ملتاہے۔ابوالحسن امراللہ امیرالدین تذکرہ مسرت افزامیں میرؔ کاذکران الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''محمد تقی'' میرؔ تخلص میر میدانِ سخن وشیر بیشہ این فن است۔گوہر وجودش ازمعدن اکبر آباد برآمدہ،امّا قدر وقیمتش در بازار دہلی افزود ومشق سخن بخدمت سراج الدین علی خاں آرزو کردہ،شاید بارے قرابت خواہر زادگی دارد۔ بسبب رعونت

وگردن کشی کہ خلقی اوست زبانزدِ زبان آں وراں شدہ و باعث
عیب جوئی سخنوراں درزبانِ شاں افتادہ۔۔۔۔۔

تذکرۂ نکات الشعراء تالیف اوست۔ دراں عجب نکتہ
چینی درکلام شعرائے ریختہ نمودہ، بہ تحقیر و بے ادائی آوردہ اشعار
ایشاں رابے رتبہ وناپسندیدہ چیدہ ذکر کردہ۔۔۔۔چوں ہمت خود
بہ انتخاب اشعار ناپسندیدۂ شعرا گماشتہ بود، طبعش بہ ہمیں مرغوب
گشتہ ازیں جہت از اشعار خود ہم ہر چہ دراں تذکرہ نوشتہ۔ اکثر
بے ازاں بے رتبہ وناپسندیدہ است۔ دردیوانش بہتر ازیں اشعار
بہ نظر فقیر درآمدہ۔۔۔۔شنیدم کہ محمد تقی میرؔ سید نسبت، میر ناصر
مرحوم والد میر درد بمشاہدۂ جودت طبعش درعنفوان جوانی وآغاز
حالش می گفت کہ محمد تقی میر میداں سخنوری خواہد شد۔ ازآں روز
خودرا ملقب بہ میر ساختہ۔ ۱۸

ظاہر ہے کہ اس تذکرے میں بھی کسی تنقیدی رائے کے بجائے صرف عیب جوئی اور نکتہ چینی سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے تنقید میرؔ کے سلسلے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ سوائے اس کے کہ یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ میرؔ کی زندگی میں ایک گروہ ایسا تھا جو میرؔ کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسے لوگ نکات الشعراء کے بیانات اور میرؔ کی شخصیت ان کے نسب پر تو حملے کرتے ہیں لیکن میرؔ کی شاعری پر کوئی رائے نہیں دیتے۔ یا شاعری کے بارے میں صاف الفاظ میں کچھ لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔

مسرّت افزا کے بعد میرؔ کی زندگی میں لکھا جانے والا تذکرہ گلشنِ سخن ہے جو ۱۱۹۴ھ/مطابق ۱۷۸۰ء میں فارسی زبان میں لکھا گیا۔ اس تذکرے کے مصنف مرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی ہیں۔ گلشنِ سخن ۳۲۱ شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ ''گلزارِ ابراہیم'' کا چربہ ہے''۔ ۱۹

مبتلا میرؔ کو سراج الدین علی خاں آرزو کا شاگرد بتاتے ہوئے انھیں ریختہ گویاں کا سردار شمار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ غزل گوئی میں ان کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔

> ''میر محمد تقی متخلص بہ میر شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو وطنش اکبرآباد ونشونما در دارالخلافت شاہجہاں آباد یافتہ۔ ذکاء ذہن وعلو فطرت ودرستی نظم وصفائے فکرت از کلام دل نشیں میرہن وہویداست الحق دریں زماں سرآمد ریختہ گویاں می تواں شمرد۔ از اقسام فنون سخن گستری در غزل گوئی بے مثل واحدے را مجال نیست کہ دم از ہمسری او تواند کرد۔ ہر فرد غزلش کہ در شوخی و رعنائی برجستہ تراز غزالاں ختن است صحرائے دلہائے شکاریانِ نخچیر معانی را چراگاہ خود ساختہ۔ مسموع شد کہ در شاہجہاں آباد تا حالت تحریر ایں گلشنِ سخن کہ سن یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجریست بسلامت استقامت دارد تذکرۂ مختصرے مشتمل براحوال وانتخاب اشعار ریختہ گویاں تالیف نمودہ۔ دیوانِ فصاحت بیانش چہار پنج ہزار بیت۔'' ۲۰

مبتلا اپنے تذکرے میں میر کی تعریف تو کرتے ہیں ان کے ہر شعر کو شوخی و رعنائی میں غزالانِ ختن قرار دیتے ہیں۔ انِ کے تذکرے اور دیوان میں موجود اشعار کی تعداد بھی تحریر کرتے ہیں مگر کوئی ایسی بات کلام میر کے متعلق نہیں کہہ پاتے جس کے ذریعہ ہم میر کی شاعری کی کسی اہم خوبی سے واقف ہوسکیں۔ کیونکہ کسی بھی شاعر کے کلام کو محض بے مثال کہہ دینے سے اس کی شاعرانہ خصوصیات کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

گلشنِ سخن کی تصنیف کے چار سال بعد یعنی ۱۱۹۸ھ/مطابق ۸۴-۱۷۸۳ء میں تذکرہ گلزار ابراہیم سامنے آیا۔ یہ تذکرہ علی ابراہیم خلیل کی تصنیف ہے یہ تذکرہ بھی فارسی میں لکھا گیا۔ اس میں ۳۲۰ شاعروں کا ذکر ہے۔ گلزار ابراہیم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ علی ابراہیم خلیل نے صرف سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کیا بلکہ انھوں نے معتبر ذرائع سے مواد حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس تذکرے کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں شعراء کے حالات زندگی اور وفات کی تاریخ کا تعین کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ابراہیم نے اپنے معاصرین کے خطوط کے اقتباسات اور کلام کے نمونے بھی تفصیل سے دیئے ہیں۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''علی ابراہیم اردو کے واحد تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے شاعروں کے حالات اوران کے متعلق تاریخیں جمع کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں۔'' ۲۱

اسپرنگر نے اس تذکرے کی چار اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۔ شعراء کے حالاتِ زندگی اور وفات کی تاریخوں کی تعیین۔

۲۔ خط و کتابت کے ذریعہ واقعات زندگی کی فراہمی۔

۳۔ معاصرین کے حالات میں ان کے خطوط کے اقتباسات۔

۴۔ کلام کے نمونے مفصل دیئے ہیں۔

ان خصوصیات کے علاوہ گلزار ابراہیم کی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اس دور کے تاریخی حالات و واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ساتھ ہی اردو شاعری کی مختلف اصناف پر تنقیدی بحث بھی کی گئی ہے۔ میرؔ کے متعلق ابراہیم لکھتے ہیں:

''میر تقی میر''۔ ہنگام تحریر کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجریست۔ شنیدہ شد کہ در شاہجہاں آباد بسلامت استقامت دارد۔ ۲۲

''درستی سلیقہ نظم و استقامت ذہن و صافی فکر از کلامش ظاہر است ــــــــ میر مذکور را با ریختہ گویانِ اقرانِ خود فرق بعید درمیان است ــــــــ سحر کاریٔ سخن در طلسم سازیٔ خیال و جادو طرازیٔ بیان در شیوۂ مقال اوست۔ اگر چہ در ہمہ اقسام نظم ناطقہ ساز است لیکن بہ اتفاق ادا سبحان نغمہ دیگر بہ آہنگ غزل یا بش سامعہ نواز یست ۲۳

ابراہیم نے جس وقت یہ تذکرہ لکھا میرؔ شاہ جہاں آباد میں تھے۔ چنانچہ یہ پہلا تذکرہ ہے جس کے ذریعہ میرؔ کی جائے رہائش کا پتہ چلتا ہے کہ میرؔ ۱۱۹۶ھ میں کہاں تھے۔ ابراہیم نے میرؔ کی شاعری پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کے کلام سے ان کی فکر ظاہر ہے اور میرؔ اپنے زمانے کے ریختہ گویان میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہیں

خیال کے، اور جادوطرازی بیان میں معانی پرداز ہیں مقال کے، ابراہیم آگے لکھتے ہیں کہ اگرچہ میرؔ نظم کی تمام اقسام میں مہارت رکھتے ہیں مگر ان کی غزل سب سے خاص ہے۔ غرض یہ کہ گلزار ابراہیم کے ذریعہ ہمیں اس دور میں اردو شاعری میں میرؔ کے مرتبہ کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے۔ ساتھ ہی ان کی فکر اور غزل میں ان کی دوسرے شعراء پر فوقیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

گلزار ابراہیم ان تذکروں میں شامل ہے جن کا فورٹ ولیم کالج کے تحت اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ گلزار ابراہیم کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ اس ترجمہ کا نام ''گلشن ہند'' رکھا گیا۔ گلشنِ ہند کے مترجم مرزا علی لطف ابن کاظم بیگ خاں اردو فارسی کے ادیب و شاعر تھے۔ وہ اپنے والد سے فارسی شاعری میں اصلاح لیتے تھے۔ اور اردو میں شیفتہ کے بقول انھیں میرؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ لیکن لطف اس بات کی تردید کرتے ہیں۔ مگر گلشنِ ہند کو صرف ترجمہ کہنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ لطف نے شعراء کے حالات کے بارے میں بہت سے اضافے کردیئے ہیں۔ دوسرے فارسی متن کو اردو میں منتقل کرتے وقت اپنی طرف سے بعض باتیں بڑھادی ہیں۔ مگر بقول گارساں دتاسی ''یہ شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس کی زبان اردو ہے۔[۲۴]

گلشن ہند پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور سے مولانا شبلی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ اور دوبارہ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے گلزارِ ابراہیم کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ گلشن ہند میں گلزار ابراہیم کے تمام ۳۲۶ شعراء کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس تذکرے میں لطف نے صرف ۶۸ شاعروں کے حالات واشعار درج کیے ہیں۔

انھوں نے اپنے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ یہ تذکرہ ان اہم شعراء پر مشتمل ہے جو اپنے زمانے میں مشہور ومعروف تھے۔ دراصل انھوں نے اس تذکرے کو دو جلدوں میں منقسم کیا تھا پہلی جلد میں نامور شعراء کو رکھا اور دوسری جلد میں وہ کم معروف شعراء کے حالات درج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ پہلی جلد میں گلزار ابراہیم میں مذکور ۳۲۶ شعراء میں سے صرف ۶۸ ممتاز شعراء کا ہی ذکر کیا۔ انھیں ممتاز شعراء میں میر تقی میرؔ بھی ہیں۔ لطف میرؔ کے متعلق لکھتے وقت صرف ترجمہ پر قانع نہیں رہتے بلکہ کچھ ایسی باتوں کا بھی اضافہ کرتے ہیں جو اور

کہیں نہیں ملتیں۔ مثلاً میر کا فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں بلایا جانا مگر ضعیفی کی وجہ سے نہ لیا جانا۔ یا آصف الدولہ سے ان کا اختلاف ہونا وغیرہ۔ لطف میر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میر تخلص، نامِ نامی اس نگینِ خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے۔ متوطن اکبر آباد کے، سراج الدین علی خاں آرزو تخلص، آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتدائے سن شعور سے پرورش انھوں نے دارالخلافہ شاہ جہاں آباد میں پائی ہے اور خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے، فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ، تلخ و شیریں رکھتا ہے۔ تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال ہیں اور ریختہ گویان سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا تو تفاوت ہے، زمین اور آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی اور اس خراش سے عارض رقم کی مراد یہ ہے کہ ناقدردانی سے اغنیاء کی اور ناسمجھی سے اہلِ دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کا سد ہے اور ہواء شہرستانِ معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں پوچھتا آج ہے۔ جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتہ سے لکھنؤ کو گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی، لیکن علّت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔

زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے۔ اکثر اہلِ لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی چادر خواست حمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہلِ تمیز ہیں کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے نوجوان غور کے میں مویز ہیں۔ اب بھی جو بوجھ تمکنت معنی کا جرِ ثقیل طبع سے ترازو کر کے وہ دکھلاتا ہے، جوان اگر کوہ بوئیس ہے تو تحمل سے اس کے کمر چراتا ہے۔ بہر تقدیر غرض جب میرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دار فانی سے عالم باقی کو سدھارے تو میر مذکور شاہ جہاں آباد میں تھے۔ ۱۱۹۷ھ گیارہ سو ستانوے ہجری میں رایات عزم اس صاحبِ لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپئے مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی۔ لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد وزارت میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں۔ وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسام نظم میں یہ صدر نشین بارگاہ سخندانی، ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں ید بیضا رکھتا ہے قصیدہ تو ختم مرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرز مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے۔ خصوصاً دریائے عشق، جوان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قوم سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحب چار دیوان، خوش بندش وخوش بیان ہے۔ مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبت جریدۂ روزگار ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب افکار ہیں۔[۲۵]

لطف کے تذکرے میں میرؔ کا ذکر مفصّل طور سے آیا ہے مگر۔ لطفؔ میرؔ کے حالات

زندگی اس دور کے اقتصادی و معاشرتی حالات کا ذکر تو تفصیل سے کرتے ہیں مگر کلامِ میرؔ کے بارے میں صرف عام تعریفی کلمات سے کام لیتے ہیں کہ وہ سحر کاریِ سخن میں طلسم ساز ہیں۔ گذشتہ اور موجودہ شعراء میں نسبت خورشید و ماہ ہے وغیرہ۔ اس طرح وہ میرؔ کی شاعری کے متعلق کسی نئی خصوصیت کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ ان سے قبل لکھے گئے تذکروں میں جو باتیں کہی گئی ہیں انھیں کو دہراتے ہیں۔ خاص طور سے طبقات الشعراء کی وہ رائے جس میں انھوں نے میرؔ و سوداؔ کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ لطفؔ بھی لکھتے ہیں کہ ''میرؔ غزل میں ید بیضا رکھتے ہیں، قصیدہ تو ختم مرزا محمد رفیع پر ہوا ہاں طرز مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے'' لیکن لطفؔ کی اس رائے کو اہم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ تذکرہ تنقیدِ میرؔ کے سلسلے میں زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

گلزارِ ابراہیم کے ساتھ ساتھ ہی مصحفیؔ نے اپنا پہلا تذکرہ ''عقدِ ثریا'' کے نام سے ۱۱۹۹ھ/مطابق ۱۷۸۵ء میں فارسی میں لکھا۔ اس تذکرے میں میرؔ کا حال ان کے لکھنؤ پہنچنے سے قبل لکھا گیا۔ مصحفیؔ لکھتے ہیں۔

> ''میر محمد تقی میرؔ ہمشیرہ زادۂ سراج الدین علی خاں آرزوؔ، در فن شعر ریختہ مرد صاحب کمال است کہ مثل او از خاک ہند دیگرے سر بر نیاوردہ۔ چرخ پیر را سال ہائے دراز چرخ باید زد کہ ہمچو شخصے را بروئے کار آرد۔ شعر ہندی را نسبت بدیگر شعرائے ریختہ اش خوں در دل افتادہ، بلکہ اکثر اشخاص موزوں طبع کہ ریختہ اش شنیدہ و مزہ ایں زبان از زبان او دریافت کردہ، فارسی گوئی را برطاقِ بلند گزاشتند و توجہ بر ریختہ اند۔ در عہد فردوس آرام گاہ اکثر ارکان پایۂ تخت و کسانے کہ نسبت بہ سخن داشتند، او را تعظیم و توقیر بمراتب بہتر از دگراں می کردند۔ اکنون کہ بایں خرابہ کسے درمیان نیست و زمانہ قدردانان بکلی خالی شدہ۔ باوجود عیال داری توکل اختیار کردہ روئے نیاز بہ ایں نوکیسہ ہائے چند نمی آورد۔ از بسکہ ابنائے زمانہ کسے را مخاطب صحیح نمی پندارد و سخن بہر کس و ناکس نمی کند۔

ازیں جہت اعزّہ اورا کج خلق و برخود غلط وانصاف دشمن قرار می دہند۔ صیت سخنوریش تمام اطراف ہندوستان را فرا گرفتہ، شعر ریختہ اش از کہہ وتامہہ بر زبان دارند، وصادر وارد از ودیارے بدیارے بطریق ارمغان برند واز بس کہ از ابتدائے سخن گفتن نام ریختہ گوئی برآوردہ، دعوائے شعر فارسی چنداں ندارد۔ اگر چہ فارسی کم از ریختہ نمی گوید۔ می گفت کہ دو سال شغل ریختہ۔ موقوف کردہ بودم۔ دراں ایام قریب دو ہزار بیست فارسی تدوین یافتہ"٢٦

اس پورے اقتباس میں مصحفی میر کی شہرت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی ریختہ گوئی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے فارسی کلام کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر کلام میر سے متعلق کسی خاص نکتے کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ اس لیے اس اقتباس سے میر کی شاعری کی کسی خاص خوبی پر روشنی نہیں پڑتی۔ سوائے اس کے کہ میر فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر ان کی شہرت ان کی اردو شاعری کے سبب ہے۔

مصحفی کا دوسرا تذکرہ ''تذکرۂ ہندی'' ١٢٠٩ھ مطابق ٩٥-١٧٩٤ء فارسی میں لکھا گیا۔ مصحفی نے اپنے اس تذکرے میں گردیزی، میر حسن اور قدرت اللہ قاسم کے تذکروں کی طرف اشارے کیے ہیں مگر میر کے تذکرے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ وہ میر کے متعلق لکھے گئے اقتباس میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ میر ان پر بہت مہربان ہیں مگر میر کے تذکرے کا کہیں ذکر نہیں کرتے بہر حال لکھتے ہیں:

''میر محمد تقی میر تخلص کہ مفصل احوال ایشاں نیز در تذکرۂ فارسی سمت تحریر یافتہ۔ شخص صاحب کمال است، اکثرے درفنِ ریختہ اورا در پلۂ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند واکثر در غزل ومثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند ومرزا را در ہجو وقصیدہ بر وفضیلت می دہند۔ غرض ہر چہ ہست استادیٔ ریختہ برو مسلم است۔ اگر چہ دیوان فارسی ہم دارد اما در فارسی گویاں شمردہ نمی شو، در ہمہ ریختہ گویان ہند سند از کلامش می آرند واورا دریں فن مستثنیٰ میدانند۔ والحق کہ چنیں

است۔ از چند سال کہ از شاہجہاں آباد بہ پورب رسیدہ در سرکار نواب آصف الدولہ بہادر اعتبار و امتیاز دار۔ چہار دیوان ریختہ از خلعۂ فکرش ریختہ و مثنوی ہائے متعددہ و شکار نامہ ہائے بے نظیر نگاشتہ کلکِ ندرت طراز او بر صفحۂ زمانہ یادگار است بر فقیر بسیار مہربانی می فرماید۔ عمرش تخمیناً قریب ہشتاد است''۔ ۲۷

اس اقتباس میں مصحفیؔ میرؔ کو صاحب کمال شخص کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ لوگ ان کا شمار سوداؔ کے ہم پلّہ کرتے ہیں اور اکثر لوگ انھیں غزل و مثنوی میں سوداؔ سے بہتر قرار دیتے ہیں اور سوداؔ کو ہجو اور قصیدہ میں ان پر فضیلت ہے مگر اس کے باوجود ریختہ میں میرؔ کی استادی تسلیم شدہ ہے حالانکہ فارسی کا دیوان موجود ہے مگر اس کی اتنی شہرت نہیں۔ ہندوستان کے تمام ریختہ گو یاں ان کے کلام سے سند لیتے ہیں اور اس فن میں انھیں بہتر جانتے ہیں۔ مگر کہیں بھی گردیزی، لچھمی نرائن شفیقؔ اور قدرت اللہ شوقؔ کی طرح میرؔ کی شاعری پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے اور نہ ہی ان کی شاعرانہ خوبیوں کے متعلق کچھ لکھتے ہیں۔ رہی بات سوداؔ سے موازنے کی تو ان سے قبل دوسرے تذکرہ نگار بھی میرؔ و سوداؔ کا موازنہ کر چکے ہیں لہٰذا مصحفیؔ کے دونوں تذکرے میرؔ کی شاعری کے متعلق کسی نئی خوبی کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔

مصحفیؔ کے تذکروں کے بعد خوب چند ذکاء کا تذکرہ عیار الشعراء منظر عام پر آیا۔ اس تذکرے کے سنہ تصنیف میں اختلاف ہے۔ سید عبداللہ کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۰۸ھ میں لکھنا شروع کیا گیا اور ۱۲۴۷ھ تک زیرِ تصنیف رہا۔ جب کہ مختلف جگہوں پر اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۸ھ/ مطابق ۱۸۰۴ء ملتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کا خیال ہے:

''عیار الشعراء ۱۲۰۸ھ/ ۹۴-۱۷۹۳ء یا اس سے کچھ دن پہلے سے ۱۲۴۷ھ/ ۳۲-۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک مولف کی خصوصی توجہات کا مرکز بنا رہا۔ اور وہ چالیس سال کے اس عرصہ میں برابر اسے زیادہ مفید بنانے کی کوشش میں مصروف رہے۔''۲۸

عیار الشعراء کی جو خصوصیت اسے اس عہد کے دوسرے تذکروں سے ممتاز کرتی

ہے وہ اس کی وسعت و جامعیت ہے۔ اس تذکرے میں ساڑھے آٹھ سو شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے خود خوب چند ذکاء انیسویں صدی کے مشہور و معروف ادیب و شاعر تھے۔ خوب چند ذکاء کی وفات ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ انھوں نے یہ تذکرہ گارساں دتاسی کے مطابق اپنے استاد میر نصیر الدین عرف میر کلو (شاہ نصیر دہلوی) کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا۔ میرؔ کے متعلق خوب چند ذکاء لکھتے ہیں:

> "میر محمد تقی سلمہ اللہ تعالیٰ المتخلص بہ میرؔ۔ شاعر یست غرازاد و بومش خطہ اکبر آباد۔ ولے سر آمد شعرائے ہند است۔ غلغلۂ سخن در چار دانگ ہندوستان جنت نشان انداختہ وکلامش مدار ے بہم رسانده۔ چند دیوان ومثنویات و یک نسخۂ تذکرہ مختصر وقصائد و رباعیات ومخمس ومسدس وہجو ومدح ودیگر تصانیف بیشمار از و بروئے کار آمدہ۔ در لکھنؤ بصیغۂ استادی در سرکار فیض آثار نواب وزیر الممالک آصف الدولہ یحییٰ خان بہادر ہنر بر جنگ بمواجب دو صد روپیہ شرف اختصاص دارد۔ الیوم در نواح لکھنؤ بعقل ناقص ایں بندہ ہم چو او عدیل شاعر زبردست و سیر مشق و بسیار گو وخوش شیریں بیان وخوش زبان برنخاستہ غرض کہ در تالیف فارسی وعلی الخصوص در ریختہ گوئی با عقل لاثانی است۔ بندہ چشم آشنا نیست الا سخن آشنا۔
>
> از تصنیفات ــــــ تلاش او قریب او یک ہزار بیت انتخابی قابل نوشتن تذکرہ برآمدہ بود۔ از آنجا کہ مختصر نویسی شعار تذکرہ سازی است، لہٰذا عمداً بطوالت کلام نہ پرداخت وہمیں اختصار نمودہ ایں گوہر اشعار آبدار از اں اوستادِ زماں، دریا دل، کامل فن، آشنائے بحرِ مواجِ معانی وسخن سلکِ تسطیر در رشتۂ تحریر کشید۔"[۲۹]

خوب چند ذکاء میرؔ کو سرآمدِ شعرائے ہند، بسیار گو، خوش شیریں بیان وخوش زبان قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں کہ ان کی شہرت ہندوستان میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے خیال میں میرؔ کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے کلام کا طویل انتخاب کرنا چاہتے ہیں مگر طوالت

کی وجہ سے قاصر ہیں۔ خوب چند ذکاء میر کے شاعرانہ رتبے کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے واقف کرنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقتباس کے آخر میں وہ انھیں استادِ زماں، کامل فن، آشنائے بحرِ مواج معانی جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ تذکرہ میر کی زندگی میں لکھنا شروع ہوا۔ اس کے سنہ تصنیف کو لے کر اختلاف ہے لیکن ہمیں اس تذکرے کی سنہ تصنیف سے بحث نہیں۔ ہمارا مدعا تو یہ دیکھنا ہے کہ تذکرہ نگار نے میر کے متعلق کیا کہا۔ اقتباس سے یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ خوب چند ذکاء اپنے تذکرے میں وہی سب دہراتے ہیں جوان سے پہلے کہا جا چکا ہے۔ صرف ایک لفظ کا اضافہ کرتے ہیں کہ میر آشنائے بحرمواج معانی ہیں۔

خوب چند کے عیار الشعراء کے بعد عہد میر میں شیخ وجیہہ الدین عشقی عظیم آبادی کا تذکرہ ''تذکرہ عشقی'' کے عنوان سے لکھا گیا اس تذکرہ کا سنہ تصنیف ۱۲۱۵ھ/ مطابق ۱۸۰۰۔۱۸۰۱ء ہے یہ فارسی میں لکھا گیا۔ تذکرہ عشقی ابھی کچھ برس پہلے تذکرۂ شورش'' کے ساتھ کلیم الدین احمد کی کوشش سے دو ''تذکرے'' کے عنوان سے دو جلدوں میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس تذکرے میں ۴۳۸ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔

میر کے بارے میں عشقی لکھتے ہیں:

''میر مجلسِ سخن پروری میر محمد تقی میر تخلص ہمشیرہ زادہ و تربیت کردہ سراج الدین علی خاں آرزو از خوش گویان و متوطنان خطۂ اکبر آباد است تا حال در قلمرو ہندوستان چنیں غزل سرائے ادا بند زبان داں برنخاستہ شہرہ حسن اوصاف آں سخن گستر قاف تا قاف رسیدہ۔ و آوردۂ روشن بیانی آں والا گہر آویزۂ گوش گردیدہ فروغ رائے میر ابخلائے اش بازار سخن دانی سخنوران معاصر رایک قلم سرد نمودہ و غدوبت کلام سحر نظامش طوطیان شکر خارا داغ حسرت ہر دل افزودہ جمع مستعدان فن ریختہ اورا باستادی قبول می دارند و کلامش را دلیل دلپسندی پندارند۔ معتد امیر موصوف مدتے در سواد شاہجہاں آباد کہ مجمع ذی جواہران ہفت اقلیم است طرح

استقامت انداختہ۔ وبہ ہنگامہ افروزی بزم قیل وقال پرداختہ۔
در آخر باستدعائے نواب آصف الدولہ بہادر وارد شہر لکھنؤ
گردیدہ باعز از واکرام می گزارند خدایش سلامت باکرامت
دارد۔"۳۰؎

تذکرۂ عشقی کے مولف میرؔ کو میرؔ مجلس سخن پروری کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ سراج الدین علی خاں آرزو کے بھانجے اور آگرہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ میرؔ کے دہلی سے لکھنؤ جانے کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ دوسرے کچھ تذکرہ نگاروں کی طرح انھوں نے بھی صرف میرؔ کی سوانح پر زور دیا۔ ان کی شاعری کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ پورے اقتباس سے صرف ادابند اور زبان داں کے علاوہ کوئی ایسا لفظ سامنے نہیں آیا جس سے کلامِ میرؔ کی خصوصیات واضح ہو سکیں۔

تذکرہ عشقی کی تصنیف کے بعد اعظم الدولہ سرور کا تذکرہ "عمدۂ منتخبہ" تالیف ہوا۔ اس کے مصنف اعظم الدولہ سرور متوفی ۱۲۵۰ھ/ فروری ۱۸۳۵ء شعر وسخن سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ اس تذکرے میں (۹۹۶) نوسو چھیانوے شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عیار الشعراء اور مجموعۂ نغز کی طرح یہ ایک طویل تذکرہ ہے جو میرؔ کی حیات میں لکھا گیا۔ اس تذکرے کے تحریر ہونے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک سرور اس میں اضافے کرتے رہے۔ سرور نے اپنے تذکرے میں زیادہ سے زیادہ شعراء کے حالات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ممتاز وغیر ممتاز کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

عمدۂ منتخبہ کا سال تصنیف ۱۲۲۴۔۱۲۱۶ھ/ مطابق ۱۸۱۰۔۱۸۰۱ء ہے یہ فارسی زبان میں ہے۔ سرور میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

میر تخلص، میر محمد تقی، ہمشیرہ زادہ سراج الدین علی خاں
آرزو اصلش از اکبرآباد۔ مدتے در دارالخلافہ استقامت
ورزیدہ۔ آخرہا کساد بازاری (ورق ۲۴۳ ب) ایں جا دیدہ،
رخت اقامت بہ لکھنؤ برد۔ ودر سرکار نواب وزیر الممالک۔۔۔۔
مرحوم بہ علاقہ دوصد روپیہ ماہواری ملازم شد۔ تعریف اشعارش

> محتاج بہ شرح و بست نیست۔ مہارتے تمام در فصیح گوئی و فنون شاعری دارد و بلند تلاشاں ایں فن شاعر مسلم الثبوت می شمارند و بہ استادی او قائل اند۔ وضع وردیہ، شعر گوئی بہ نہجے کہ دارد کسے را میسر نہ شدہ است۔ بسیار عزیزیان تلاش تتبع زبان او کردند۔ لیکن بہ آن نہ رسیدند۔ فی الواقع مرتبہ، شاعری او دریں زمانہ بسیار بلند است و پایۂ او دریں فن کم از رفیع السودا نیست بلکہ در غزل گوئی رجحان دارد۔[۳۱]

عشقیؔ کی طرح سرورؔ بھی میرؔ کی سوانح کا ذکر کرتے ہیں کہ میرؔ اکبر آباد کے رہنے والے ہیں۔ زمانے کی گردش انھیں دہلی سے لکھنؤ لے گئی۔ ان کے کلام کی شہرت چاروں طرف پھیلی ہے سوداؔ سے موازنہ بھی کرتے ہیں اور غزل میں میرؔ کو فوقیت دیتے ہیں۔ مگر ایک اہم بات جس کی طرف کسی دوسرے تذکرہ نگار نے اشارہ نہیں کیا، سرورؔ کے یہاں جس کی نشاندہی ہوتی ہے وہ میرؔ کی زبان ہے۔ سرورؔ لکھتے ہیں کہ میرؔ کی زبان کا تتبع بہت لوگوں نے کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی ان تک نہ پہنچ سکا۔ سرورؔ کا اشارہ میرؔ کی زبان کی اس خصوصیت کی طرف ہے جسے بعد میں سہل ممتنع کا نام دیا گیا۔ چنانچہ سرورؔ کے تذکرے سے ہمیں کلام کی ایک اہم خصوصیت کا پتہ چلتا ہے جس پر بعد میں تنقید میرؔ کی بنیاد رکھی گئی۔

عشقیؔ اور سرورؔ کے تذکرے کے بعد ''مجمع الانتخاب'' تصنیف کیا گیا۔ اس تذکرے کے مصنف کے نام میں اختلاف ہے۔ کہیں شاہ محمد کمال لکھا ہے اور کہیں شاہ کمال الدین حسینی۔ اس تذکرے کا سال تصنیف ۱۲۱۸ھ/۴-۱۸۰۳ء ہے یہ فارسی میں لکھا گیا۔ شاہ کمال میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''میر محمد تقی صاحب میر تخلص ہم عصر و ہم طرز مرزا رفیع السودا مرحوم و مغفور مرد صاحب کمال و مغتنم روزگار والحق است کہ ایں ہر دو صاحبان موجد زبان ریختہ و استاد مسلم الثبوت اند۔ بعد انتقال مرزا محمد رفیع سودا نواب آصف الدولہ مرحوم میر صاحب مذکور را از شاہجہاں آباد باعزاز طلبیدہ بہ صیغۂ شاعری بجائے مرزا

ممتاز و سرفراز ساختہ بخوبی او قاتش بسر شدہ۔ فقیر از ہماں ایام ربط و اتحاد دارد و میر صاحب بر حال فقیر بسیار عنایت و اشفاق دلی می فرمودند جایں حد کہ نقل پنج دیوان ہندی و یک دیوان فارسی بفقیر دادہ بودند۔ موجود ہستند بعد از وفات آصف الدولہ بعہد سعادت علی خاں سر رشتۂ روزگار از سرکار وزیر موقوف شدہ مگر فقیر میر صاحب معز الیہ را ہنوز بخیر و خوبی بہ لکھنؤ گذاشتہ آمدہ است حق تعالیٰ سلامت دارد، عمرش از ہشتاد متجاوز خواہد بود۔ وایں چند غزلہائے از ہمہ دیوانہائے مذکور بانتخاب در آوردہ۔ مثنوی موسوم بہ جذب عشق (دریائے عشق درج کی ہے نام غلط لکھا ہے۔

۲۔ انتخاب دیوان پنجم میر صاحب موصوف کہ نام دیوان زادہ نبادہ اند۔ ۲۳؎

مجمع الانتخاب کے اقتباس میں میر و سودا کا موازنہ، دونوں شاعروں کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے۔ میر کس طرح سودا کے انتقال کے بعد لکھنؤ پہنچے خود مولف کے میر سے تعلقات، میر کی ان پر مہربانی سے لے کر میر کی عمر، ان کے دیوان، سب کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، مگر کلام میر سے متعلق پورے اقتباس میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے جسے تنقیدی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہو۔ لہٰذا مجمع الانتخاب صرف میر کی سوانحی تصویر ہمارے سامنے لاتا ہے۔

میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعہ نغز میر کی زندگی میں لکھے جانے والے تذکروں میں ایک اہم تذکرہ ہے جو میر کی شاعری اور ان کے حالات زندگی دونوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ میر قدرت اللہ قاسم انشاء، مصحفی اور جرأت کے معاصرین میں تھے۔ تذکرہ مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۷ء میں فارسی میں لکھا گیا۔ اس تذکرے میں تقریباً ۷۰۰ شعراء کا ذکر ہے۔ آب حیات کا ماخذ بھی یہی تذکرہ بتایا جاتا ہے۔ میر کے بارے میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں:

سخن سنج طبع ذکی میر محمد تقی است اصلش از مستقر الخلافہ اکبر آباد و لے در اکثرے از ایام عمر گرامی در دار الخلافہ شاہجہاں آباد و صانہا اللہ عن الشر والفساد است۔ در آخرہا بہ بلدہ لکھنؤ طرح اقامت افگندہ بہ صیغۂ شاعری بمواجب مبلغ دو صد روپیہ ملازم سرکار

دولت مداد۔نواب غفراں مآب وزیر الممالک آصف الدولہ یحیٰی خان بہادر گشتہ۔پسر شوہر ہمشیرہ سخن پرداز بدیہہ گو سراج الدین علی خاں آرزو است۔نسبت تلمذ ہم بجناب افادہ انتساب خاں مشارٌ الیہ دارد۔امابنا بر نخوتے کہ در سرش جاگرفتہ ازیں امر کہ فی الحقیقت فخر و لے است اباءکلی بمیان آرد از کبر و غرورش چہ برطرازم کہ حدے ندارد واز نخوت وخودسریش چہ برگارم کہ سینہ قلم حقائق رقم می فگارد بر شعر کسے گرہمہ اعجاز باشد وکلام شیخ شیراز باشد سر ہم نمی جنباند تا بہ تحسین خود چہ رسد و بہ سخن احدے اگر چہ معجز طرازی بودو گفتہ اہلی شیرازی گوش ہم فرانمی دارد، امکان چیست کہ حرف آفریں بزبانش رود۔در تذکرۂ خود ہمہ کس رابہ بدی یاد کردہ در حق شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ و لے شاعرے است از شیطان مشہور تر وسزائے ایں کردار ناہنجار از کتریں شاعر بواجی یافتہ کہ و لے ہجو ہائے متعددہ اوکردہ کہ بعضے ازاں بغایت رکیک و پردہ درافتادہ وقطع نظر از تذکرہ اژ درنامۂ برشتہ نظم کشیدہ کہ دراں خود را اژدہائے مردم خوار وشعرائے دیگر را حیوانات مسکیں وخوار قرار دادہ ودر جواب آں ہر سخن ساز صاحب امتیاز ہجوئے در نہایت رکاکت بروئے کار آمدہ۔۔۔۔۔۔۔

بہر حال از۔نہا گذشتہ میگویم وحق نمی پوشم محمد میر شاعرے است بے نظیر، اوسخن سنجے است، خوش تقریر، عندلیب خوش نوائے باغ فصاحت بلبل ہزارداستان، گلزار بلاغت، شیر بیشۂ سخن وری، ہنر بر صحرائے ہنر گستری، شہسوار عرصۂ سخن طرازی فارس مضمار نکتہ پردازی، جادو کلام معانی آفریں، سحر بیان، صنائع بدائع آگیں۔ میر اقلیم شیریں زبانی، دبیر قلمرو عذب البیانی، طرز گفتارش بے بدل انداز اشعارش ضرب المثل، زعم بعضے آں کہ سرآمد شعرائے

فصاحت اما مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی سخن بوئے نرسانیدہ اما
حق آنست کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا دریائے است بیکراں و میرؔ نہر است عظیم الشان در
معلومات قواعد فن میر را بر میرزا برتری است و در قوتِ شاعری مرزا را
بر میر سروری مخمس کلام دواوین متعددہ مملو ہر گونہ سخن و مثنویات متوافرہ
مشحوں چندین صنائع بدائع فن بر صفحہ روزگار ثبت فرمود۔ ۳۳

قدرت اللہ قاسم نے جہاں ایک طرف جی کھول کر میرؔ کی تعریف کی ہے، وہیں انھیں شیطان سے زیادہ مشہور بھی قرار دیا ہے جو ایک طرح سے ہجو ملیح کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے میر کا سودا سے موازنہ کیا ہے اور سودا کو دریا اور میرؔ کو نہر عظیم الشان قرار دیا ہے۔ موازنہ میں جو جملے انھوں نے لکھے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ قدرت اللہ قاسم کی نگاہ میں سودا کو میرؔ پر بعض معنوں میں برتری حاصل تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ میر کو شاعر بے نظیر، خوش تقریر اور عندلیب نوائے باغ فصاحت بلبل ہزار داستاں، گلزار بلاغت اور بشہ سوار عرصہ سخن طرازی قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کی نکتہ دانی، کلام آفرینی، اور صنائع بدائع کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی نگاہ میں میرؔ کو زبان پر بھی قدرت حاصل تھی اور معنی آفرینی پر بھی اس طرح مجموعہ نغز کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر اپنے عہد کے ایک بلند پایہ شاعر تھے گو کہ بعض معاملات میں سودا کو ان پر فوقیت حاصل تھی اور بعض معاملات میں میر کو سودا پر فوقیت تھی۔

میرؔ کی زندگی میں مکمل ہونے والا آخری تذکرہ غلام محی الدین مبتلا میرٹھی کا تذکرہ طبقات سخن ہے جو ۱۲۲۲ھ/ ۸۔۱۸۰۷ء میں فارسی میں لکھا گیا۔ میر کے متعلق مبتلا تحریر فرماتے ہیں:

"سید عالی نسب والا حسب امت کہ خواہر سراج الدین علی
خاں آرزو در حبالۂ نکاحش بود۔ و بہ آرائش ظاہر آراستہ و پیرایشِ
باطن پیراستہ۔ دہلوی است و بزرگانش را وطن اکبر آباد است۔ او در

دارالخلافہ زیست پاکیزہ می کرد۔ سایہ اخلاقش تہیدستان بے مایہ را
ظل ہما بود کہ بہ یمن تربیت ذرہ را خورشید و مورچہ را جمشیدی فرمود
بسیارے ہنرمندان از فیض صحبتش بہ کام دل رسیدند و بہ فضائل
چارگانہ از ذات مبارک او کامیاب گردیدند چوں از تابِ آفتاب
حوادث پناہے نہ دید، در عرصۂ بادشاہ گرامی عنان عزیمت بہ جانب
لکھنؤ کشید نواب وزیر وجود کرامت آمود او را بہ مراتب سعادت فائز
دیدہ وچشمے حق بینی و گوشے حق شنو پسندیدہ خاطر حقیقت زاے و سینہ
معرفت خیزش را خوش می داشت و بہ حسن سیرت و درستی عقل و راستی و
صحت فکر و سلامت طبع او را بر دیگر سخنوران حضور مرجع می انگاشت۔
آخر کہ بلبل جان نواب بانالۂ دردناک از گلستان پرخار منزل فنا بہ
جانب چمنستان بے آزار بقا پرواز کرد۔ او ہماں جا مقیم شد۔ سال عمر
بہ صدر سیدہ باشد۔"[۳۴]

مبتلاؔ کے تذکرے سے میر اور آصف الدولہ کے تعلقات، میرؔ کا لکھنؤ، جانا اور آصف الدولہ کے حلقے میں شامل ہونے کا پتہ چلتا ہے لیکن میرؔ کے کلام پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی، حالانکہ یہ ان کی زندگی میں لکھا جانے والا آخری تذکرہ تھا اور اس سے پہلے کے تذکروں میں میرؔ کے کلام پر تفصیل سے تبصرہ کیا جا چکا تھا لیکن مبتلاؔ نے ان سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ اس طرح مبتلا کی رائے کو تنقید میر میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

اس تمام بحث سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نکات کے بعد تذکرہ طبقات سخن تک تقریباً ۲۵ تذکرے لکھے گئے جن میں تقریباً ۲۳ تذکروں میں میرؔ کا ذکر موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تذکروں میں بعض جگہوں پر معاصرانہ چشمک بھی ہے اور بعض جگہوں پر میر سے ذاتی اختلافات بھی لیکن اگر ان اختلافات اور ذاتی مخالفتوں کو علاحدہ کر دیا جائے اور صرف ان آراء کو پیش نظر رکھا جائے جن میں میرؔ کے کلام کے بارے میں کوئی رائے دی گئی ہے تو محسوس ہوگا کہ میر اپنی زندگی میں ایک روایت (Legend) کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی زندگی میں اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا جائے لیکن ان

تذکروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی زبان روزمرہ اور محاورہ، تشبیہہ اور استعارات، نازک خیالی ومعنی آفرینی سب کا اعتراف اس عہد کے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے اس طرح میرؔ کی تنقید کے سلسلے میں ان تذکروں کی اپنی ایک اہمیت ہے اور اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

میرؔ کے سلسلے میں اُردو تذکروں کو حیات میر میں لکھے جانے والے تذکرے اور بعد میرؔ لکھے جانے والے تذکروں میں تقسیم کرنے کا اصل مقصد یہی تھا کہ یہ دیکھا جاسکے کہ میرؔ کی زندگی میں ان کی کیا اہمیت تھی۔ میرؔ کے بعد ان کے کلام پر رائے دینا اور ان کے محاسن یا معائب کی جستجو زیادہ آسان کام ہے لیکن اگر کسی کی زندگی میں اس کی اہمیت اور بڑائی کا اعتراف کیا جاتا ہے تو یہ زیادہ اہم بات ہے۔

میر کے انتقال کے بعد لکھے جانے والے تذکروں کی تعداد بھی ان کی زندگی میں لکھے جانے والے تذکروں کی تعداد سے کم نہیں ہے۔ محققین نے فارسی واردو میں لکھے جانے والے تذکروں کی تعداد تقریباً ۸۱ بتائی ہے۔ اس میں سے ۲۵ تذکرے میرؔ کی حیات میں لکھے گئے اور تقریباً ۵۶ تذکرے میر کے انتقال کے بعد لکھے گئے۔ میرؔ کے انتقال کے بعد لکھا جانے والا پہلا تذکرہ مفتی صدرالدین آزردہ کا ''تذکرہ آزردہ'' ہے، یہ تذکرہ ۳۳۔۱۲۲۶ھ/ ۱۸۔۱۸۱۱ء میں تصنیف ہوا۔ ڈاکٹر مختارالدین آرزو کا خیال ہے کہ آزردہ نے یہ تذکرہ ۱۲۲۹ھ اور ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۳۔۱۸۱۷ء کے درمیانی زمانے میں لکھا تھا۔ مختارالدین آرزو نے اس تذکرے کو مرتب کرتے ہوئے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

> ''مولانا صدرالدین آزردہ کے تذکرۂ شعراء تصنیف کرنے کا ذکر ہمیں صرف شیفتہ کے ہاں ملتا ہے۔ سوداؔ کے ترجمے میں اضطراراً لکھتے ہیں۔
>
> ''اشعار منتخب ایشاں (سوداؔ) باید نگریست کہ در چہ رتبت عالی ومکانت ضخیم جلوۂ ظہور گرفتہ دیدل علی ذالک ما قال اشرف الافاضل، فخرالاماثل، قدوۃ المحققین مولانا محمد صدرالدین المتخلص بہ آزردہ در تذکرۂ خود کہ بایجاز واختصار تمام درحال ارباب نظم ریختہ نوشتہ است۔ تحت ترجمہ میر تقی المتخلص بہ میرؔ شرح کلام

ولے ہیٹ قال ''پستش اگر چہ اندک پست است، ۔ اما بلندش
بسیار بلند۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ آزردہ نے ایک تذکرہ
''شعرائے اُردو'' بھی مرتب کیا تھا لیکن اور کسی نے اس سے
استفادہ کا ذکر نہیں کیا۔ بظاہر یہ ضائع ہوگیا۔ ۳۵

اپنی رائے کے ساتھ ساتھ مختار الدین آرزو لالہ سری رام خمخانہ جاوید کی رائے کا بھی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایک تذکرہ شعرائے ریختہ ان کی یادگار ہے، مگر نایاب ہے۔'' ۳۶

اسی صفحے پر مختار الدین آرزو آگے لکھتے ہیں۔

''حسن اتفاق سے اس تذکرے کے ابتدائی ۴۴ صفحات
کا ایک خطی نسخہ کسی طرح کورلس کرسٹی کالج، کیمبرج انگلستان کے
کتب خانے میں پہنچ گیا (مخطوطہ نمبر ۱۵۹) اور یوں دست برد
زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ اسی کے عکس سے یہ متن مرتب کر کے ہدیہ
ناظرین کیا جارہا ہے۔'' ۳۷

مختار الدین آرزو کا مرتب کردہ جو تذکرہ ہمیں ''تذکرہ آرزردہ'' کی شکل میں ملتا ہے اس میں حرف ''الف'' سے لے کر ''ق'' تک کے شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ ''ق'' کے بعد ''ک'' سے ''ے'' تک کا حصہ غائب ہے۔ لہٰذا میرؔ کے متعلق صدرالدین آرزردہ نے کیا لکھا ہمیں براہ راست تو ان کی تحریر نہیں ملتی البتہ شیفتہ کے یہاں سوداؔ کے ذکر میں صدرالدین آزردہ کے حوالے سے میرؔ کا ذکر ملتا ہے۔ خود مختار الدین آرزو بھی میرؔ کے سلسلے میں ''گلشن بے خار'' کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''تذکرے سے کسی خاص تنقیدی شعور کا بھی پتہ نہیں
چلتا بیشتر شعراء کے لیے مروّج ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں
۔۔۔۔اس پر ان کی اس رائے کا بھی اضافہ کر لیجئے جو شیفتہ نے
گلشن بے خار میں میرؔ سے متعلق نقل کی ہے کہ

''پستش اگر چہ اندک پست است، امابلندش بسیار بلند''۳۸؎

حالانکہ آزردہ کا تذکرہ میر کی وفات کے بعد لکھا گیا پہلا تذکرہ ہے مگر اس تذکرے کے آخری صفحات نایاب ہونے کے سبب میر کے متعلق آزردہ کی رائے پر ہمیں شیفتہ کی رائے سے استفادہ کرنا ضروری ہوگیا۔ شیفتہ نے بھی مندرجہ بالا صرف ایک سطر کا ذکر کیا۔ لہٰذا آزردہ کے تذکرے میں ہمیں میر کی شاعری پر خاطر خواہ تنقید نہیں ملتی اس لیے اس تذکرے کی اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ وفاتِ میر کے فوراً بعد لکھا گیا۔

تذکرۂ آزردہ کے بعد ''بینی نرائن'' کا تذکرہ ''دیوان جہاں''

۱۲۲۷ھ/۱۳-۱۸۱۲ء اردو زبان میں منظر عام پر آیا، اس تذکرے کو مرتب کرتے ہوئے کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

> ''بینی نرائن مہاراجہ لکشمی نرائن کا فرزند اور بھائی کھیم نرائن کا، یہ شخص عالم آدمی تھا۔ درمیان لاہور کے رہتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بنام ''دیوان جہاں'' کے تصنیف کی ہے جس میں اچھے اچھے شعراء اردو کو جن کے اس کو بہم آئے ہیں لکھے ہیں۔۔۔۔۔
> کلکتہ میں مشہور ہندوستانی زبان داں روبک صاحب کی خواہش سے بیچ ۱۸۱۴ء کے کتاب دیوانِ جہاں مذکور تصنیف کی تھی۔''۳۹؎

بینی نرائن نے اپنے تذکرے میں ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے وہ شعراء کا ذکر صرف ایک یا دو سطروں میں کرتے ہیں خود میر کا ذکر بھی انھوں نے ایک ہی سطر میں کیا ہے۔ البتہ ۲۷ اشعار کا انتخاب ضرور دیا ہے۔ بینی نرائن میر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میر تخلص، نام محمد تقی۔ لکھنؤ میں وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مرحوم کے پاس نوکر تھے۔ قریب اسی برس کے ہو کے وفات پائی۔''۴۰؎

اس تذکرے میں بھی میر کے بارے صرف ابتدائی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے کلام کے متعلق بینی نرائن کسی قسم کا تنقیدی اشارہ نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ تذکرہ تنقید میر میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

خیراتی لال بے جگر کا تذکرہ، ''تذکرۂ بے جگر'' ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء فارسی میں لکھا گیا۔ اس تذکرے میں قدماء سے لے کر معاصرین تک کا ذکر ہے۔ بقول فرمان فتح پوری اس تذکرے کا صرف ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کا خیال ہے کہ زیرِ نظر نسخے کی کتابت ۱۲۴۱ھ میں ہوئی اور اضافہ وترمیم کا سلسلہ کم از کم ۱۲۴۲ھ/ ۲۷۔۱۸۲۶ء یا اس کے بعد کے قریبی زمانے تک جاری رہا۔ حالانکہ اس تذکرے کے سنہ تصنیف میں اختلاف ہے۔[۴۱]

خیراتی لال بے جگر میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''درفنِ سخن امیر، میر محمد تقی متخلص بہ میرؔ۔ شاعر است کہ در رنگیں خیالی طبیعتے دارد شرمشقِ بہار کشمیر و در شعر فارسی و ہندی دست قدرتے کثیر۔۔۔۔۔ بعد بقطع مراحل، نود و شش از سنینِ عمر در سال یک ہزار و دو صد و بست و پنج ہجری بوصال جانانِ حقیقی پیوست۔''[۴۲]

حالانکہ خیراتی لال بے جگر میرؔ کو فنِ سخن کا امیر کہتے ہیں اور رنگین خیالی کو ان کی طبیعت کا خاصہ بتاتے ہیں مگر تفصیل سے کلام میرؔ پر اظہار خیال نہیں کرتے۔ لہٰذا ہم ان کے تذکرے کو میرؔ کی وفات کے بعد لکھے گئے ابتدائی تذکروں کے تحت تو اہم قرار دے سکتے ہیں مگر تنقیدی اعتبار سے یہ تذکرہ اہم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

البتہ ''دستور الفصاحت'' وفات میرؔ کے بعد لکھے گئے تذکروں میں اہم تذکرہ ہے۔ دستور الفصاحت ۱۲۴۹ھ/ ۳۴۔۱۸۳۳ء میں فارسی میں لکھا گیا۔ اس کے مولف احد علی خاں یکتاؔ ہیں۔ یہ تذکرہ پہلی بار ۱۹۴۳ء میں ہندوستان پریس رام پور سے شائع ہوا دستور الفصاحت تذکرہ کے علاوہ دریائے لطافت کے طرز کی ایک علمی و ادبی تالیف ہے جس میں مقدمہ وخاتمہ کے علاوہ پانچ ابواب ہیں۔ میرؔ کے متعلق احد علی خاں یکتاؔ لکھتے ہیں۔

''متکلم سحر کار، شاعر جادو کردار، سلطان اقلیم فصاحت، فرمان فرمائے کشور بلاغت، مونس و غم خوار جماعۂ عشاق نام برآوردہ باوستادی درتمام آفاق سلطان الظرفا، سید الشعراء مملکت

سخن را امیر، سید محمد تقی المتخلص بہ میرؔ نوراللہ مضجعہ، شاعر بے بود، ہر قوت بر جمیع اقسام سخن قادر۔ ہمہ وفائق سخنوری عالم و ماہر، غزل را بطرزے گفتہ کہ ہیچکس نمی تواند۔ بلکہ دریں باب ملک الشعراء ہم حرف است۔ چوں کلامش بسبب وسعت، جامع اکثر کلمات محاورہ افتادہ، افادہ سند ازاں نسبتِ بکلام میرزا زیادہ تر است، اما تقلید و پیروی او نہایت دشوار۔ اگر چہ کلام فصاحت نظامش۔ مثل سعدی بظاہر آسان نظر می آید، ولے ممتنع است۔ بیشتر شعراء مقلد او ہستند و مطلق طرزش نمی یابند۔ بخلاف مرزا محمد رفیع کہ باوجود کمال پختگی کہ دارد، تقلیدش ہر صاحب فہمے را ممکن۔ و برشستگی کلام و نزاکت معانی میرؔ راچہ گویم؟ باستادی و معلومات ایں مسلم الثبوت راچہ نویسم؟ سلمائے اعتبار میرؔ دریں فن بالیلائے شہرت میرزا دریک محل سوار، و آفتاب شہرۂ ایں ہر دو بے عدیل، بچرخ غلو دریک درجہ گرم اشتہار۔ لہٰذا نواب آصف الدولہ مرحوم و مغفور ہم بعد رحلت مرزا، میرؔ را از شاہجہاں آباد فخریہ طلب داشتہ بمنصب عالی ملازمت ساخت واز خاطر داری و پاس مشارٌ الیہ دقیقہ فرو نمی گذاشت۔''۴۳

دستور الفصاحت کے مصنف میرؔ کو دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح متکلم سحر کار، شاعر جادو کردار، سلطان اقلیم فصاحت فرمان فرمائے کشور بلاغت جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں وہ انھیں مملکت سخن کا سردار قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ میرؔ تمام اقسامِ سخن پر قادر ہیں۔ ان کی سی غزل کوئی نہیں کہہ سکتا۔ وہ غزل کے ملک الشعراء ہیں۔ ان سے سودا کے مقابلے میں سند لینے میں زیادہ فائدہ ہے۔

مگر سب سے اہم بات جس کی وجہ سے دستور الفصاحت کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ حیات میرؔ میں لکھے گئے تذکرے عمدہ منتخبہ کے مولف اعظم الدولہ سرور کلام میرؔ کی جس خوبی کو کوئی نام نہیں دے پائے تھے مگر بعد میں میرؔ تنقید میں وہی خوبی کلام میرؔ کی

ایک اہم خصوصیت ٹھہری۔ احد علی خاں یکتانہ صرف اس کا ذکر کرتے ہیں بلکہ اسے ایک نام بھی دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں میرؔ کی تقلید و پیروی بہت دشوار ہے، اگر چہ ان کے کلام کی فصاحت کا نظام سعدی کی طرح ظاہری طور پر آسان نظر آتا ہے مگر ممتنع ہے۔ بہت سے شاعروں نے اس کی تقلید کی مگر اس کا سا طرز نہیں پاسکے۔ سودا کے برخلاف کہ پختگی کے باوجود ان کی تقلید ہر صاحب فہم کے لیے ممکن ہے۔ میرؔ کے کلام میں سوز اور نزاکت معانی کا کیا کہنا۔ اس کے بارے میں کیا لکھوں۔ وغیرہ۔

شیفتہؔ اپنے عہد کے مشہور و معروف ادیب اور سخن فہم تھے۔ ان کی رائے اس عہد کے شعراء کے لیے ہمیشہ معتبر سمجھی گئی ان کا تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مومنؔ خاں مومنؔ کے شاگرد تھے۔ وہ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتیؔ تخلص کرتے تھے۔ شیفتہؔ نے اپنے تذکرے کا آغاز ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں کیا اور ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۴ء کے آخر تک یہ تذکرہ مکمل ہوگیا۔ شیفتہ کے تذکرے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعراء کے کلام کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میرؔ کے بارے میں ان سے منسوب یہ جملہ کہ ''پستش بغایت پست و بلندش'' اس قدر مشہور ہے کہ آج بھی لوگوں کی زبان زد ہے۔ حالانکہ اس کی حقیقت کچھ اور ہے۔ شیفتہؔ نے کسی اور طرح یہ جملہ لکھا تھا لیکن مشہور وہ اس طرح ہوگیا۔ انھوں نے میرؔ کے بارے میں لکھا ہے:

> ''میر تخلص افصح فصحا اشعر شعرا سخنور عالی مقام محمد تقی نام از اہل اکبر آباد خواہر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو ست لطافت با طبیعتش ہمزاد ست و با کلامش حرف غیر رمزیہ بلبل و فغاں خا و طوطی ناطقہ شکر بارش رونق بازار عنادل شکستہ و صفر خامہ گلستان نگارش نالہ برلب مرغ بستانی بستہ صفحہ خیالش بجلوہ ریزی لالہ عذاران افکار دلاویز چون اندیشہ عاشق قطعہ گلزار است و رشحہ قلمش در شگفانیدن گلہای مضامین تازہ ہمرنگ ابر نو بہار صد آہ دردناک بتاثیر یک مزراع او نیست و ہزار عزایم تسخیر ہم فسون نیم بیتش گو حلاوت سخنش بکام مشتاقان گوارا اتر از شہد لعل شکر بار است و نمک گفتارش بمذاق

شوریدہ طبعان بامزہ تراز پستہ تبسم دلدار نظمش اگر سحر است سحر حلال است وفکرش اگر از قوت ملکیسی است از چہ اعجاز مثال بافنون نظمیہ ربط تمام دار دلا سیما در غزل سرائی و مثنوی گوئی گومی سبقت میر باید پست و بلند کہ درکلامش بینی در طب ویابس کہ درابیاتش بنگری نظر نکنی داز نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند فرد شعر گر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست۔ درید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست۔ ریختی سخن دریذباب سخت ترجمہ مرزا رفیع سودا گزشت وبغایت چیدہ وسرہ است فلتیذ کرشش دیوان ریختہ بااصناف سخن نظم کردہ مسدس کہ بمضامین واسوخت گفتہ غازہ شہرت بررودارد از اقسام شاعری در قصیدہ فکر خوشی نداشتہ چند انکہ غزلش بلند مرتبہ تر است ہمچناں قصیدہ اش پست پایہ تر در بدوحال بشاہجہاں آباد آمد وتمتع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ میگزرانید وما تحیاج از سرکار نواب الممالک بہادر می یافت ہمدردان جابسیرہ ملک عدم شتافت دیوانہایش ملاحظہ شد۔‘‘۴۴

شیفتہؔ اقتباس کی ابتداء میں میرؔ کو افصح فصحاء، اشعر شعرا کہتے ہیں۔ پھر ان کا تعلق اکبر آباد اور سراج الدین علی خاں آرزو سے بتاتے ہوئے ان کے کلام کی خصوصیت پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ لطافت ان کی طبیعت کی ہمزاد ہے ان کے قلم کا رشحہ گلہائے مضامین تازہ ابر نو بہار کی طرح کھلاتا ہے۔ سینکڑوں دردناک آہیں اس کے ایک مصرع کی تاثیر کے برابر نہیں ہیں خاص طور سے غزل اور مثنوی میں سبقت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی لکھتے ہیں کہ پست و بلند کہ درکلامش بینی و رطب ویابس کہ درابیاتش بنگری نظر نہ کنی واز نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند۔

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
درید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

اگر شیفتہؔ کے تذکرے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ میرؔ کے متعلق پست و بلند کا مسئلہ سب سے پہلے آزردہ نے اپنے تذکرے میں اٹھایا۔

صدرالدین خاں آزردہ کے تذکرے کا نام بھی ''تذکرۂ آزردہ'' ہے اور یہ تذکرہ شیفتہ کے تذکرے سے قبل ۳۳۔۱۲۲۶ھ/ مطابق ۱۸۔۱۸۱۱ء میں لکھا گیا۔ شیفتہ نے سودا کا ذکر کرتے وقت اس فقرہ کو آزردہ کے حوالے سے اس طرح نقل کیا:

''آزردہ، در تذکرۂ خود۔۔۔۔نوشتہ است تحت ترجمۂ
میر تقی المتخلص بہ میرؔ در شرح کلام وے لے حیث قال پستش اگرچہ
اندک پست است اما بلندش بسیار بلند'' ؎۴۵

مگر میرؔ کے متعلق لکھتے وقت شیفتہ نے اس بات کو ان الفاظ میں لکھا۔ جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ میرؔ کے پست و بلند سے متعلق فقرہ دراصل آزردہ کا ہے اور شیفتہ نے آزردہ کا حوالہ دے کر اس فقرے کو نقل کیا ہے اور خود جب اپنی رائے دی ہے تو اس فقرے کی اصلاح کر کے دی ہے کہ اچھائی اور برائی یا کمی اور بیشی ہر کلام میں ہوتی ہے جہاں تک میرؔ کے بارے میں تنقید کی بات ہے شیفتہ میرؔ کے کلام میں مضامین کی تازگی اور دردانگیزی کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں اور اس عہد میں رائج تنقید کی زبان میں میرؔ کی شاعری کی خصوصیات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ اور ان کی غزل اور مثنوی کو جادواثر قرار دیتے ہیں۔ ماہنامہ نقوش کے میرؔ نمبر میں عنایت حسین خاں مجہور کے تذکرے مدائح الشعراء کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تذکرہ گلشن بے خار کے بعد ۱۲۵۳ھ/ ۳۸۔۱۸۳۷ء میں فارسی میں لکھا گیا۔ اس کے نام ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں شعرا کی تعریف کی گئی ہے۔ میرؔ کے سلسلے میں صرف تین سطریں لکھی گئی ہیں جس میں انھیں شاعر یگانہ، اور وحید زمانہ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ ان کے کلام پر کوئی تنقیدی رائے یا ان کا کوئی تفصیلی ذکر تذکرے میں نہیں ملتا۔

اس کے بعد گارساں دتاسی کے تذکرے کا ذکر ہے جو ''تذکرہ تاریخ ادب ہندوستان'' کے نام سے فرانسیسی زبان ۸۷۔۱۲۵۶ھ/ مطابق ۷۰۔۱۸۳۹ء میں لکھا گیا۔ اس تذکرے کا اُردو ترجمہ منشی کریم الدین ابن سراج الدین پانی پتی نے فیلن کے ساتھ مل کر ۱۸۴۷ء میں کیا اور طبقات الشعراء ہند اس کا نام رکھا۔ کریم الدین نے تعلیم و تاریخ ادب کی کئی

کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں تعلیم النساء، گلستانِ ہند، طبقات الشعرائے ہند اور تذکرہ گلدستۂ نازنیناں وغیرہ شامل ہیں۔ بقول فرمان فتح پوری:

''تذکرہ کے آخری صفحہ میں لکھا ہے۔تمام ہوا تذکرہ طبقات الشعرائے ہند مولف مولوی کریم الدین ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء ظاہر ہے کہ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں تذکرہ مکمل ہوا ہے'' یہ تذکرہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے سید اشرف علی کے زیر اہتمام ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء میں بڑی سائز پر شائع ہوا۔اس کے نسخے اکثر بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں اور اس کے سرورق پر عبارت درج ہے۔

تاریخ شعراء کا مسٹر فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے گارساں دتاسی کی تاریخ ۱۸۴۸عیسوی میں ترجمہ کیا اور نوسو چونسٹھ شاعروں اُردو گو کے اشعار اور حال بھی دواوین مختلف میں سے منتخب کر کے اس میں مندرج کیا گیا۔''۴۶؎

آگے لکھتے ہیں:

اس ٹکڑے سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ اس تذکرہ کے تکملہ کا سال ۱۸۴۸ء ہے لیکن یہ درست نہیں ۔ جیسا کہ اختتامیہ اور بعض اندرونی اندراجات سے پتہ چلتا ہے کریم الدین نے اسے ۱۸۴۷ء کے آخری ایام میں مکمل کیا اور اگلے سال ۱۸۴۸ء میں یہ چھپنا شروع ہوگیا۔ اس طرح ۱۸۴۷ء کو سال تصنیف اور ۱۸۴۸ء کو سال طباعت خیال کرنا چاہئے۔''۴۷؎

کلیات میر مرتبہ ظل عباس عباسی اور میر کے نقوش نمبر میں طبقات الشعرائے ہند کا میر سے متعلق اقتباس دیکھا جاسکتا ہے۔ میر کے بارے میں کریم الدین گارساں دتاسی کی تحریر کا ان الفاظ میں ترجمہ کرتے ہیں۔

''میر تخلص، افصح فصحائے محمد تقی نام، اکبرآبادی ہے۔وہ

سراج الدین علی خاں آرزو کا بھانجا تھا۔ یہ وہی شاعر ہے جو کہ بنام میر مشہور ہے۔ شعر اس کا تمام شعراء شائقین اور متاخرین سے بیشک بہت اچھا ہے تمام فنون نظمیہ وہ جانتا تھا خصوصاً غزل اور مثنوی اس کی سب سے بہتر ہے آج کے زمانہ تک تمام شعراء اس کے اچھے ہونے میں شک نہیں کرتے یہ شاعر واقع میں ایسا ہی ہے۔ اگر اس کو بادشاہ شعراء کا کہیں تو بجا ہے۔ چھ دیوان ریختہ معہ مسدس ومخمس وغزل ورباعی وقطعہ وغیرہ کے اس کے موجود ہیں۔ میر کا قصیدہ اچھا نہ ہوتا تھا قصیدہ گوئی میں سودا کو میر پر فوقیت ہے اور غزل میں میر کو سودا پر۔ ابتداء حال میں درمیان شاہجہاں آباد کے آیا۔ ناکام پھر لکھنؤ کو چلا گیا۔ سرکار نواب وزیر الممالک میں ملازم ہوا۔ اس کی تصنیف نو مثنویاں، چھ دیوان، ایک تذکرہ نکات الشعراء ہے۔ اوّل جب دلّی میں تھا، خواجہ میر درد کے گھر میں مشاعرہ ہوتا تھا، پھر بموجب خواہش درد کے، میر مجلس مشاعرہ اپنے مکان پر منعقد کرنے لگا۔ میں نے تمام دیوان اور مثنویات اوس کے خوب دیکھے ہیں۔"۴۸

گارساں دتاسی نے چوں کہ یہ تذکرہ فرانسیسی قارئین کے لیے اسی زبان میں لکھا تھا لہٰذا ان کا مقصد اردو شاعروں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنا تھا۔ میر کے بارے میں بھی انھوں نے ان کی شہرت اور ان کے چھ دواوین کے ذکر کے ساتھ ان کے مختصر حالات تحریر کر دیئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ترجمہ میں میر کو افصح الفصحاء کہا گیا ہے۔ فرانسیسی میں گارساں دتاسی نے اس کے لیے کون سے الفاظ استعمال کیے اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے کہ میر کی فصاحت کے سلسلے میں یہ جملہ گارساں دتاسی کا ہے یا کریم الدین کا بہر حال ترجمے میں یہ اسی طرح موجود ہے۔ گارساں دتاسی نے میر کی تعریف کی ہے لیکن ان کے کلام پر کوئی مبسوط رائے نہیں دی ہے جو تنقید میر میں اضافہ کر سکے۔

گارساں دتاسی کے تذکرے "تاریخ ادب ہندوستان" کے بعد امام بخش صہبائی کا

تذکرہ ''انتخاب دواوین'' منظرِ عام پر آیا۔ یہ تذکرہ ۶۰۔۱۲۵۸ھ/۴۴۔۱۸۴۲ء میں لکھا گیا۔ امام بخش صہبائی دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ وہ غالب مومنؔ اور سرسید کے ہم عصر تھے۔ دہلی کالج کے پرنسپل بوتر مس کی فرمائش پر انھوں نے ۱۸۴۲ء میں یہ تذکرہ تصنیف کیا تھا۔ یہ تذکرہ ۴۴ میں شائع ہوا۔ اس تذکرہ میں پہلی بار شعراء کے کلیات و دواوین کو سامنے رکھ کر شعراء کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ہر شاعر کا کلام تقریباً ۱۲۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ شعراء کے حالات صہبائی نے مختصراً لکھے ہیں۔ یہ تذکرہ دستیاب نہ ہوسکا۔ اس لیے صہبائی کے میرؔ کے متعلق خیالات کا بیان ممکن نہیں۔

''نتائج الافکار'' قدرت اللہ گوپا مئوی کا تذکرہ ۵۸۔۱۲۵۷ھ/۴۲۔۱۸۴۱ء میں مدراس سے شائع ہوا۔ میرؔ کے متعلق قدرت اللہ لکھتے ہیں:

> محمد تقی تخلص میرؔ خانِ آرزو کے بھانجے۔ ریختہ گوئی میں اپنے عہد میں بے نظیر تھے۔ کلام شیریں کہتے اور فصاحت اور بلاغت میں مشہور تھے پہلے دہلی آئے اور بڑی عزت سے زندگی بسر کی اس کے بعد لکھنؤ گئے اور وزیر الممالک آصف الدولہ کی سرکار سے متوسل ہوکر گزر اوقات کی صورت ہوئی ہر چند میرؔ کو ریختہ سے شغف تھا چنانچہ ریختہ کے چھ دواوین مختلف اقسام سخن پر ترتیب دیئے اس کے ساتھ فارسی میں دستگاہ تھی اور ایک دیوان فارسی دو ہزار اشعار پر مشتمل یادگار چھوڑا۔ تیرہویں صدی کے اوائل میں انتقال کیا۔[۴۹]

قدرت اللہ میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات فصاحت اور بلاغت قرار دیتے ہیں اس کے علاوہ کلام میرؔ کے متعلق کچھ نہیں لکھتے ان کا تذکرہ نقدِ میرؔ کے سلسلے میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتا۔

انتخاب دواوین کے ساتھ ساتھ ہی منشی کریم الدین ابن سراج الدین پانی پتی کا تذکرہ ''گلدستۂ نازنینان'' لکھا گیا۔ یہ تذکرہ اُردو زبان میں ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۶۱۔۱۲۶۰ھ/۴۵۔۱۸۴۴ء ہے۔ میرؔ کے متعلق منشی کریم الدین لکھتے ہیں:

"میر تخلص، افصح فصحا اور ابلغ بلغا اور اشعر شعراء ہند اور سخنور عالی مقام محمد تقی نام ہے۔ یہ شاعر خواہر زادہ سراج الدین۔ علی خاں آرزو کا ہے۔ چھ دیوان ریختہ باصناف سخن منظوم کیے ہوئے اس کے ہیں اور واسوخت اس شاعر کا بہت مشہو راور معروف ہے۔ ہر چند اقسام شاعری سے سب اصناف پر قادر تھا۔ لیکن جس قدر غزلیات اس شاعر بے بدل کی شہرت یافتہ ہوئے ہیں اسی قدر قصائد نے پستگی رتبہ حاصل کی۔ دارالخلافہ شاہجہاں آباد میں اوّلاً ابتدائے حال میں آیا۔ لیکن سبب برگشتگیٔ طالع ناکام و مایوس گیا۔ آخر ایام زیست لکھنؤ میں جا کر بسر کیے اور رہا محتاج سرکار نواب وزیر الممالک بہادر سے پایا۔ المختصر لکھنؤ ہی میں راہی عدم داعی اجل کو لبیک اور سعدیک کہتا ہوا دوڑا اور مدح اس کی جتنی لکھیے کم ہے۔ کیونکہ یہ شاعر ایسے ہی پایہ کا گزرا ہے۔"[۵۰]

کریم الدین میر کو فصحاء میں سب سے فصیح اور بلغاء میں سب سے زیادہ بلیغ اور شعراء میں سب سے بڑا شاعر اور عالی مقام سخن ور قرار دیتے ہیں۔ میر شاعروں میں ان کی نگاہ میں سب سے افضل شاعر تھے۔ کریم الدین کی رائے میر کے بارے میں ایک متوازن رائے قرار دی جاسکتی ہے۔ حالانکہ تنقید میر کے سلسلے میں فصاحت و بلاغت کے عام الفاظ کے علاوہ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے محاسن کلام میر پر تفصیلی روشنی پڑ سکے۔ اس تذکرے میں ایک خاص بات اور ہے کہ کریم الدین نے پہلی بار واسوخت کا ذکر کیا ہے۔

گلشنِ ہند، انتخاب دواوین، اور گلدستہ نازنیناں کے بعد چوتھا تذکرہ اُردو میں "خوش معرکۂ زیبا" لکھا گیا۔ یہ تذکرہ ۱۲۶۰۔۶۱ھ/ مطابق ۴۷۔۱۸۴۴ء میں لکھا گیا۔ اس کے مولف سعادت خاں ناصر ہیں۔ تذکرے کی اہم خصوصیت یہ ہے یہ قدیم تذکروں کی طرز پر لکھا گیا ہے اور اس میں مولف نے شاعر کے ساتھ اس کے شاگردوں کا ذکر بھی خاص طور پر کیا ہے۔

اس تذکرے میں میر کا ذکر تو بہت تفصیل سے ہے مگر صرف سوانحی اعتبار سے

مولف نے ان کا ذکر کیا ہے۔ میر کے کلام پر انھوں نے کوئی رائے نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ''استادِ استاداں۔ امام شرع سخنوراں تھے۔ ۵۱

''خوش معرکہ زیبا'' کے بعد احمد حسین سحر لکھنوی کا تذکرہ ''بہارِ بے خزاں'' ہے جس کا سنہ تالیف ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء ہے اس تذکرے کو ڈاکٹر نعیم نے ۱۹۶۸ میں مرتب کر کے علمی مجلس دہلی سے شائع کرا دیا ہے۔

ڈاکٹر نعیم احمد نے احمد حسین سحر کے تنقیدی شعور کے بارے میں ''بہار بے خزاں'' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

> ''سحر ایک ایسا تنقیدی شعور رکھتا تھا جس نے لفظی بازی گری کے اس دور میں ہی اس کو یہ عرفان بخشا تھا کہ اعلیٰ اور زندہ رہنے والی شاعری کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ جس شعر میں فکر تازہ کا لطف نہ ہو اسے درج کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میں نے اس تذکرے میں کوئی ایسا شعر شامل نہیں کیا جس میں کوئی لفظ دلچسپ نہ ہو یا بندش رکیک ہو۔'' ۵۲

سحرؔ کے تذکرے سے ایک اور بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ میرؔ اکبر آباد ہی میں کسی ''پری تمثال'' پر عاشق ہو گئے تھے عام طور پر ان کے عشق کا واقعہ اور سبب دیوانگی ان کے دہلی کے کسی تعلق پر بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں خود ان کی طویل مثنوی ہے۔ بہارِ بے خزاں میں جس طرح سے اس کا ذکر آیا ہے وہ بعض شبہات پیدا کرتا ہے اس لیے کہ مصنف بہارِ بے خزاں نے ان کے اکبر آباد سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ کے سفر کو اس عشق کے سلسلے میں ''عزیزوں کی لعنت ملامت سے بچنے کا ایک سبب قرار دیا ہے جب کہ ان دونوں سفر کے درمیان طویل عرصہ حائل ہے اور لکھنؤ کے سفر کا سبب وہ معاشی حالات تھے جن سے اس وقت دہلی کا ہر ہنر مند گزر رہا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ سحر لکھنوی نے عمومی انداز سے میرؔ کے عشق پر تبصرہ کر دیا۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''مشہور ہے کہ وہ اپنے شہر (اکبر آباد) میں کسی پری تمثال ان کے اپنے ہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی آخر ان کا عشق مشک کی طرح

چھپائے نہ چھپ سکا اور انھیں یہ خوف ہو گیا کہ کہیں وہ بدنام اور ان کی محبوبہ رسوا نہ ہو جائے اس لیے وہ عشق کی تشہیر اور عزیزوں کی لعنت ملامت سے ڈر گئے اور اکبر آباد چھوڑ کر مختلف مقامات کو ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔۔۔۔۔وہ جب تک زندہ رہے محبت کا طوق ان کی گردن میں رہا اور جنون کی زنجیر ان کے پیر میں پڑی رہی۔" ۵۳

(ترجمہ ڈاکٹر نعیم احمد)

سحر کے تذکرے کی زبان بے حد شاعرانہ ہے لیکن وہ جو بات کہتے ہیں اس میں ایک گہرائی ضرور ہے وہ عام تذکرہ نگاروں کی طرح رسمی طور پر کوئی بات نہیں کہتے۔ ان کی استعارہ آمیز زبان سے کبھی مفہوم میں کوئی دشواری ہو وہ الگ ہے لیکن ان کے یہاں ایک اچھا تنقیدی رویہ ملتا ہے۔ انھوں نے میر کے بارے میں لکھا ہے:

میر تخلص، محمد تقی نام، از اہل اکبر آباد، خواہر زادۂ سراج الدین علی خاں آرزو ہم دوش مہ وشاں پری جلوۂ نکتہ دانی وہم آغوش دوشیزگانِ شوخ ادائے معنی است۔ دیوانہ طرزِ دلکش و دل آویز، آشفتۂ مضمون عاشقانہ و درد انگیز، مجنون بہار حسن لیلائے دل فریبی، فرہاد تلخ کام، شیریں ادیان، مجنونِ برشتہ۔ جگر شمع رویاں، ہم بستر ناکامی و ہم یاس و حرماں بودہ۔ کلام شور انگیزش لختِ دل و پارۂ جگر تفتہ، دودمانِ معنی آشنا در آتش انداختہ و روزمرّہ گفتگو بے ساختہ او لطف حسن بندشِ دیگراں از دل ہا برداشتہ۔۔۔۔۔۔ چند مثنوی ہاو شش دیوان ریختہ دارد وبہ فارسی ہم سلیقہ داشتہ۔ القصہ تاثیر کلام قیامت زآتش تاثیرے دارد کہ ہم چو خدنگ خارا شگاف از سینہ بروں می جہد۔" ۵۴

اب تک تذکروں میں میر کے بارے میں جو تنقیدی آراء ملتی ہیں ان میں شاید سب سے اہم رائے احمد حسین سحر لکھنوی کی ہے۔ سحر نے میر کی شاعری کی تمام صفات وہ ادائے معنی سے متعلق ہوں یا میر کی نکتہ دانی سے یا ان کی دردانگیز عشقیہ شاعری سے یا ان

کی معنی آفرینی، روزمرہ اور بندشِ الفاظ پر ان کی گرفت۔ میرؔ کے تمام محاسنِ کلام پر احمد حسین سحر لکھنوی نے چند جملوں میں تذکرۂ بہار بے خزاں میں احاطہ کرلیا ہے۔ آج میر کی شاعری کی بنیاد ان کے جس کلام شور انگیز پر رکھی جارہی ہے اس کی طرف بھی پہلی بار اس تذکرہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تذکرہ بہار بے خزاں قدیم تنقید میرؔ کے سلسلے میں اہم ترین تذکرہ ہے اس کی طرف شاید اس لیے توجہ نہیں دی جاسکی کہ یہ تذکرہ دیر میں شائع ہوا۔ ورنہ اگر غور کیا جائے تو میر کے کلام پر ایسی تنقیدی بصیرت کا تبصرہ میر کے عہد میں لکھے جانے والے تذکرے یا ان کے بعد لکھے جانے والے تذکروں میں کہیں نہیں ملتا۔ احمد حسین سحر کی زبان استعاراتی اور تمثیلی ہے لیکن اہل نظر اور ناقدین میر کی توجہ کی مستحق ہے۔

گلستان بے خزاں میر قطب الدین باطن اکبرآبادی کا تصنیف کردہ ہے باطن نے عربی فارسی کی تعلیم نظیرا کبرآبادی سے حاصل کی تھی یہ تذکرہ اردو زبان میں لکھا گیا۔ اصل میں یہ تذکرہ گلشن بے خار کے جواب میں لکھا گیا۔ کیونکہ باطن نظیرا کبرآبادی کے شاگرد تھے اور نظیرا کبرآبادی کے متعلق شیفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ ''ان کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں'' ان اشعار کی بناء پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں۔ باطن کا یہ تذکرہ ۶۵۔۱۲۶۱ھ/ ۴۹۔۱۸۴۵ء میں لکھا گیا۔ میر کے بارے میں لکھتے وقت بھی باطن شیفتہ پر تنقید سے باز نہیں آتے۔ لکھتے ہیں:

گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب
ازحکیم میر قطب الدین باطن اکبرآبادی (نولکشور، ۱۲۹۱ھ)

میر تخلص مرشد شعرا درۃ التاج اساتذہ فلک احتشام درغرر بحر اوستادانِ رفیع احترام، لولوے شاہوار فصیحانِ ارفع التزام، جناب میر محمد تقی نام والا دودمان عالی خاندان، ملک مالوفہ ابر نیساں بار، فخر دہلی درمکنون ہمشیرہ زادۂ سراج الدین علی خان آرزو واساتذۂ جدید وقدیم جن کے سب شاعر معتقد ہیں جو جاہل ان کی نسبت الفاظ اہانت لکھے اوس سے گفتگو فصاحت خادمۂ

کلک جادو نگار بلاغت کنیز خامہ طوبیٰ اطوار، محاورات روز مرہ غاشیہ بردار، طبع شوخ گوہر بار، مضمون عاشقانہ سحاب فکر سے ترشح کرتے ہیں، نباتات کیمیا خصلت مرز بوم شعر میں نشو ونما اوترتے ہیں۔ اہتزازِ نسیم طبع نے وہ گلہائے بوقلموں کھلائے جن کی نکہت سے مشام سیاراں عنبر سر ہو جائے، عنادل طبع سخن سنجانِ عصر شاخ مضارع رنگین پر پروانہ وار نثار، طوطی نوا سنج زبان خوش گویانِ کلام کے روبرو صورتِ آئینہ بصد شکل حیراں و پر اضطرار، زبان گویا کا کام نہیں کہ ان کے لب ولہجہ کے روبرو گفتگو کرے۔ ناطقہ کو تاب کہاں کہ یارا بات کہنے کا ہو، روبرو اف یا تو کرے۔ صفیر خامہ چمنستانِ دیوان میں رشک صدائے بلبل ہزار داستاں، نوائے کلِک و زبانِ بوستانِ نظم میں روکش نغمۂ طوطی خوش زباں، جس مرتبہ صفت لکھیے مناسب اور بجالاریب فیہ جس قدر تعریف کیجئے زیبا۔ صاحبِ گلشنِ بے خار آنحضرت استاد کی خدمت میں بھی بے ادبی کے الفاظ لاتے ہیں، صفت کی عبارت لکھتے لکھتے پھر وہی ژاژ خائی کی طرف لے جاتے ہیں اور ایسے ایسے فقرات تحریر فرماتے ہیں، پست و بلند کہ درکلامش بینی و رطب ویابس کہ درابیاتش بنگری نظر نہ کنی واز نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند، شعر

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در یدِ بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست

اس فقرے کا فقرۂ دیگر دوسرے چہرہ تصویر کا اور ہی رنگ ہے، ان کے اس بیان کا نئے طرز کا ڈھنگ ہے: ''درقصیدہ فکرِ خوش نداشتہ چنداں کہ غزلش بلند رتبہ تر است ہم چناں قصیدہ اش پست پایہ تر در بدحال شاہجہاں آباد آمدہ وتمتع نیافتہ ناکام برگشتہ الخ جب ایسے صاحب کی نسبت یہ عبارت ہو تو اوروں کی کیا

حالت ہو۔ میر گلشنِ بے کار و گلستان بے خزاں سے جھوٹ سچ
دونوں کا معلوم ہوگا: فریقین کا نیک و بد سیاروں کو مفہوم ہوگا، مرشد
شعرا نے چھ دیوان فکر شایستہ سے آمادہ کیے کہ شش جہت میں
جواب نہیں، ان کے برابر نظم اردو میں کسی شاعر کی کتاب نہیں۔ قیام
اپنا لکھنؤ میں اختیار کیا۔ سرکار نواب وزیر الممالک میں روزگار کیا۔ یہ
اشعار نتائج افکار شریفہ سے زیب جریدہ کیے۔ فی الحقیقت شنیدہ
نہیں بلکہ دیدہ کیے، گرمیِ کلام سے عدو کباب ہے، آتشِ حسرت
میں خاک وہ خانہ خراب ہے، کلام میر ہی افسر برخورد و کبیر ہے،
اوستاد کا ارشاد ہے، جس کے فیض سے ہر شاگرد اوستاد ہے۔ صفحۂ
کاغذ دبستانِ سخن ہے، سطحِ قرطاس گلستان سخن ہے، جب پڑھتے اور
گنتے ہیں تو نظارہ کے دامن دامن پھول چنتے ہیں۔ اس گلشن کے
سیاروں کا دل باغ باغ ہے۔ بہار دیکھیے، تو غیر خزاں نصیب ذلیل
خوار کے دل پر داغ ہے۔ رہروانِ منزل نظم کے خضر کا کلام ہے۔
اس طریق سے جادہ کاغذ پر انتظام ہے۔ ۵۵

باطن میرؔ سے متعلق اقتباس کا آغاز فارسی میں کرتے ہیں اس کے بعد کی زبان اُردو ہے۔ باطن میرؔ کے بارے میں بہت کچھ لکھتے ہیں کہ وہ مرشدِ شعرا ہیں۔ اساتذۂ فلک احتشام ہیں۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں وغیرہ مگر جب میرؔ کے کلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو اس کی وضاحت نہیں کرتے۔ آخر میں شیفتہؔ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے میرؔ کی تعریف پر اقتباس ختم کرتے ہیں۔

اس تذکرے کے بعد اسپر نگر کا تذکرہ ''یادگار شعراء'' لکھا گیا۔ مگر اس تذکرے میں تعجب کی بات ہے کہ ''میر سوز'' کا تو ذکر ملتا ہے مگر ''میر تقی میر'' جیسے اہم شاعر کا ذکر اسپر نگر نے نہیں کیا ہے۔ اسپر نگر کے بعد لکھے گئے تذکرے مخزنِ شعرا کا مواد کوشش کے باوجود نہیں مل سکا۔ مگر اسی دور کا تذکرہ سید محسن علی محسن موسوی کا تذکرہ سراپا سخن ہے یہ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء میں شائع ہوا میرؔ کے متعلق محسن صرف دو تین سطروں پر اکتفا کرتے ہیں:

شاعر مشہور میر تقی میر مغفور خلف میر عبداللہ ہمشیرہ زاد ہے
اور شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو باشندہ اکبر آباد، مقیم لکھنؤ،
چھ دیوان ہندی مع قصائد اور مثنوی ایک دیوان فارسی ۔۔۔۔ان
سے یادگار ہے۔'' ۵۶

ان تمام تذکروں کے بعد گلشن ہمیشہ بہار (فارسی) منظر عام پر آیا۔ اس کے مصنف نصر اللہ خاں خویشگی ہیں۔ ان کا یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ/ ۵۵۔۱۸۵۴ء میں لکھا گیا۔ میر کے بارے میں نصر اللہ خاں خویشگی لکھتے ہیں:

''میر تخلص، سرخیل بلغائے عظام، افصح فصحائے کرام
شاعر والا مقام در نظم و نثر ذوالاحترام میر تقی نام مردے ترانہ سنج،
لطیفہ گو ہمشیرہ زادہ سراج الدین علی خاں آرزو است۔ اولاً
شاہجہاں آباد دماغ فارغ البال می بود۔ محتاج نہ بودہ مگر روزی از
خوان احسان وزیر می یافت وہم درآنجا بسرت ملک عدم
شتافت۔۔۔۔۔۔۔آں سر آمد سخنوراں است۔'' ۵۷

اس اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نصر اللہ میر کے متعلق صرف چند جملوں پر اکتفا کرتے ہیں مگر انھیں سر آمدِ سخنوراں کہہ کر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

گلشن ہمیشہ بہار کے بعد دو تذکرے نسخہ دلکشا، از جنم جی مترا رمان (مرقومہ ۱۲۷۱ھ/ ۵۵۔۱۸۵۴ء اردو) اور منتخب التذکرہ از جنم جی مترا رمان مرقومہ ۱۲۷۱ھ/ ۵۵۔۱۸۵۴ء اردو کے علاوہ گلستان سخن مرزا قادر بخش صابر شاگرد امام بخش صہبائی کا تذکرہ ۱۲۷۱ھ/ ۵۵۔۱۸۵۴ء میں لکھا گیا۔ اس میں صرف ان شعرا کا ذکر ہے جو اس وقت حیات تھے۔ اور دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تذکروں کے علاوہ مخزن نکات کا اُردو ترجمہ سید محسن علی نے ۱۲۷۱ھ/ ۵۵۔۱۸۵۴ء میں اردو میں کیا۔ مخزن نکات کے ترجمہ کے بعد اسی دور میں ریاض الفردوس محمد حسین شاہجہاں پوری نے لکھا۔ انھوں نے یہ تذکرہ ۱۲۷۶ھ/ ۶۰۔۱۸۵۹ء میں اُردو میں لکھا۔ یہ تمام تذکرے نایاب ہیں اور ان کے مندرجات تک رسائی نہیں ہو سکی۔

عبد الغفور خاں نساخ نے اُردو میں دو تذکرے لکھے۔ پہلا قطعہ منتخب اور

دوسرا سخن شعرا۔ پہلے تذکرے کا سنہ تصنیف ۱۲۷۶ھ/ ۶۰-۱۸۵۹ء ہے اور دوسرے کا ۱۲۸۱ھ/ ۶۵-۱۸۶۴ء دونوں اُردو زبان میں لکھے گئے۔ سخن شعرا میں قدماء سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک کے تقریباً سارے شعراء کا ذکر ہے۔ آخری دس صفحات میں صرف شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

> میرؔ تخلص میر محمد تقی اکبر آبادی ولد میر عبداللہ ہمشیر زادہ و شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو، عنفوان شباب میں دہلی میں گئے تھے۔ وہاں سے لکھنؤ میں جا کر سکونت اختیار کی، نواب آصف الدولہ بہادر کی سرکار سے ان کا وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ سن بارہ سو پچیس ہجری میں فوت کی۔ سوائے قصیدہ کے جمیع اصناف سخن پر قادر رہے۔ اشعار ان کے بغایت مرتبہ رتبہٗ بلند رکھتے ہیں۔ فرط اشتہار سے حاجت بیان نہیں، مثنوی و غزل گوئی میں اوستاد مسلم الثبوت گزرے۔ ان کی استادی سے کسی کو انکار نہیں۔ جو درد کہ ان کے کلام میں ہے، کسی شاعرِ ریختہ گو کے کلام میں نہیں۔ ان کے چھ دیوان ریختہ مع قصائد و مثنوی نظر سے گذرے۔ ایک دیوانِ فارسی اور ایک تذکرۂ شعراء اور ایک رسالہ فیضِ میرؔ بھی ان سے یادگار ہیں۔ (ص ۴۷۹) ۵۸

عبدالغفور نساخ خاں نے اپنے تذکرے میں میرؔ کا ذکر کرتے وقت دوسرے کچھ تذکرہ نگاروں کی طرح میرؔ کے حالات زندگی پر اظہار خیال کیا ہے مگر کلام میرؔ سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ ''جو درد میر کے کلام میں ہے کسی شاعر ریختہ گو کے کلام میں نہیں ہے۔ چنانچہ عبدالغفور خاں نساخ کا تذکرہ بہت تفصیلی تو نہیں مگر میرؔ کی ایک اہم خصوصیت درد انگیزی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سخن شعراء کے بعد لکھے گئے تذکروں بہارستان ناز، تذکرۂ ناز، فرح بخش، انتخاب یادگار، تذکرۂ شعرائے رام پور وغیرہ میں میرؔ کا ذکر نہیں ملتا۔ ان میں سے کچھ تذکرے تو شاعرات کے متعلق لکھے گئے اور کچھ علاقائی ہیں مثلاً تذکرہ نادری، الٰہ آبادی

شعرا کا تذکرہ ہے ''فرح بخش'' بھوپال سے تعلق رکھنے والے شعراء سے متعلق ہے۔

سخن شعراء کے بعد فدا علی عیش کے تذکرے مجموعہ واسوخت/شعلہ جوالہ کا ذکر آتا ہے۔ یہ تذکرہ ۸۵۔۱۲۸۲ھ/ ۶۹۔۱۸۶۵ء (اردو) میں لکھا گیا میرؔ کے متعلق فدا علی عیش لکھتے ہیں:

> ''تخلص ہے بلبلِ ہند ملک الشعرا میر محمد تقی کا۔ خلف الرشید تھے میر عبداللہ کے اور ہمشیر زادہ اور شاگرد رشید تھے سراج الدین علی خاں آرزو کے۔ مولد ان کا دہلی ہے اور مسکن لکھنؤ، یہیں وفات پائی۔ سات دیوان اردو مع قصائد اور مثنویات وغیرہ اور ایک دیوان فارسی اور ایک تذکرہ اور ایک رسالہ میر فیض ان سے یادگار ہے''۵۹

فدا علی اپنے اقتباس میں میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھتے ہیں حالانکہ میرؔ کے والد کا نام اکثر تذکروں میں میر عبداللہ ملتا ہے مگر تحقیق کے بعد میر کے والد کا نام علی متقی لکھا گیا ہے۔ پھر فدا علی لکھتے ہیں کہ میرؔ دہلی میں پیدا ہوئے صحیح نہیں۔ چنانچہ یہ تذکرہ اپنے اندراجات کے سلسلے میں مشکوک ہے۔ کیونکہ میر کی پیدائش اکبر آباد میں ہوئی۔ آگے لکھتے ہیں کہ میر کے سات دیوان اُردو میں مع قصائد اور مثنویات وغیرہ اور ایک دیوان فارسی اور ایک رسالہ میرؔ فیض ان سے یادگار ہے''۔

فدا علی عیش کے یہاں میر کے اُردو کے سات دیوان کا ذکر ہے جب کہ میرؔ کے اُردو زبان میں صرف چھ دیوان ہیں۔ میر کے سلسلے میں فدا علی کے تمام بیانات مشتبہ ہیں۔ یہ بات پورے طور سے واضح ہوتی ہے کہ مولف نے لکھتے وقت محض اپنے حافظہ پر بھروسہ کیا، ورنہ جس سنہ میں یہ تذکرہ تصنیف ہوا اس وقت تو میرؔ پر کافی تذکرے لکھے جا چکے تھے۔ بہر حال فدا علی کا یہ تذکرہ میرؔ کی شاعری کے سلسلے میں بھی کسی اہم نکتے کو سامنے نہیں لاتا۔

فدا علی کے تذکرے کے بعد شمیم سخن حصہ اوّل از عبدالحئی صفا مرقومہ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء اردو اور خزینۃ العلوم از درگا پرشاد نادر مرقومہ ۱۲۸۸ھ/۷۲۔۱۸۷۱ء (اُردو) اور عروس الافکار از نصیر الدین احمد نقش مرقومہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء (فارسی) نگارستان بشیر،

تذکرہ، ارمغان گوکل پرساد، طور کلیم وغیرہ تذکرے بھی نایاب ہیں۔

بھوپال میں چار تذکرے فارسی میں لکھے گئے پہلا تذکرہ شمع انجمن ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء ہے۔جس کے مولف نواب صدیق حسن خاں صاحب ہیں۔اسی سلسلے کی تین کڑیاں نگارستان سخن ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء، ''صبح گلشن'' ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء اور روزِ روشن ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء ہیں۔اصل میں یہ چاروں تذکرے ''شمع انجمن'' کے تتمہ کے طور پر شائع ہوئے۔ نگارستان سخن' صدیق حسن خاں کے بڑے بیٹے نورالحسن خاں کے نام سے ''صبح گلشن'' ان کے چھوٹے بیٹے سید علی حسن خاں کے نام سے شائع ہوا۔ان ضخیم تذکروں کی تالیف کے بعد پھر بھی بہت سے شعراء شمولیت سے رہ گئے تو اس کا تتمہ ''روز روشن'' مظفرِ حسین صبا کے نام سے تالیف ہوا۔ان چاروں تذکروں میں سے صرف ''شمع انجمن'' میں میرؔ کا ذکر ملتا ہے۔

ان تذکروں کے بعد سید علی حسن خاں کا تذکرہ ''بزم سخن'' ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں فارسی زبان میں لکھا گیا اس میں قدماء سے لے کر معاصرین تک کا ذکر ہے میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''میرؔ۔ محمد تقی میر عبداللہ (میر عبداللہ غلط ہے)
> خواہر زادہ وتلمیذ سراج الدین علی خاں آرزو باشندۂ اکبرآباد بود۔ بالآخر بتقرر وظیفہ کہ از سرکاری لکھنؤ می یافت بہ لکھنؤ سکونت ورزید، استاد مسلم الثبوت بودہ است کسے را ازوے انحرافی نیست، خسرو اقلیم سخنوری وسخندانی ست وموجد الفاظ ومعانی چمن آرائے گلشن سخن است و بہار افزائے گلبن فن در جمیع اصناف سخن جز بہ قصیدہ قادر بود، علی الخصوص در مثنویات وغزلیات نظیرے نہ داشت المختصر در ۱۲۲۵ھ آنجہانی شد، کلیات مشتمل بر مثنویات و دیوان وتذکرہ شعراء قصائد ازوئے یادگار ماندہ۔''۶۰

سید علی حسن کا تذکرہ میرؔ کی وفات کے تقریباً ۷۰ سال (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) بعد لکھا گیا۔وہ کہتے ہیں کہ میرؔ مسلم الثبوت استاد ہیں۔کوئی ان سے انحراف نہیں کرسکتا۔اقلیم سخنوری کے خسرو ہیں، موجد الفاظ ومعانی ہیں، چمن آرائے گلشن سخن ہیں۔اور فن کے باغ

کی بہار بڑھانے والے ہیں۔

سید علی حسن اپنے تذکرے میں جس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ یہ کہ میرؔ موجد الفاظ و معانی ہیں۔ موجد الفاظ و معانی کے فقرے میں بڑی وسعت ہے۔ ایک طرف جہاں سید علی حسن میرؔ کی ایک اہم خوبی ہمارے سامنے لاتے ہیں کہ وہ نئے نئے الفاظ ایجاد کرتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف میرؔ کو معنی ایجاد بھی قرار دیتے ہیں۔ یعنی کلام میرؔ میں نئے نئے معنی و مفہوم موجود ہیں۔

اُردو تذکرہ نگاری کی تاریخ تقریباً ۱۲۸ سال پر مشتمل ہے نکات الشعراء ۱۷۵۲ء میں لکھا گیا اور سید علی حسن کا تذکرہ، تذکرہ بزم سخن ۱۸۸۰ء میں مکمل ہوا۔ نکات الشعراء اور بزم سخن کے درمیان ۱۲۸ سال کا عرصہ ہے۔ سید علی کے تذکرے پر اُردو میں روایتی تذکرہ نگاری کا عہد ختم ہو جاتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اُردو میں ایک نئی فکر کو فروغ ہوا۔ اور دھیرے دھیرے بیاض نویسی اور تذکرہ نگاری ختم ہوتی گئی۔

۱۸۸۰ء میں لکھی جانے والی ایک بہت اہم کتاب محمد حسین آزاد کی آب حیات ہے۔ آب حیات تذکرہ اور ادبی تاریخ کو جوڑنے والی ایک کڑی ہے اس میں شاعروں کا ذکر ضرور ہے۔ لیکن اسے تذکرے میں شمار کرنا مناسب ہی نہیں غلط ہوگا۔ آب حیات کے پہلے صفحہ پر اس کتاب کا نام اس طرح درج ہے۔

"آب حیات یعنی مشاہیر شعرائے اردو کی سوانح عمری
اور زبان مذکور کی عہد بہ عہد کی ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان۔"

از
شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد
سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور۔[۱۱]

اس سے اندازہ ہوگا کہ آزاد نے خود آب حیات کو تذکرہ نہیں کہا ہے۔ آب حیات میں تاریخ زبان کے ابتدائی نقوش بھی ملتے ہیں اور تاریخ ادب کی ابتدائی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ آب حیات میں محمد حسین آزاد نے شاعری کے تین ادوار قائم کر کے ادبی تاریخ کی پہلی بنیادی اینٹ رکھی۔ ان ادوار میں انھوں نے پہلی بار شعراء کا ذکر بہت تفصیل

سے کیا ہے اور پہلی بار ان کے سوانحی حالات جمع کرنے اور ترتیب دینے کی کوشش کی۔

اب تک تذکرہ نگاروں نے رسماً کسی کی پیدائش یا حالات کے بارے میں کچھ لکھ دیا ورنہ اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ آزاد نے نہ صرف شعراء کے حالات زندگی یکجا کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کی حلیہ اور شکل و شباہت کا بھی نقشہ کھینچا۔ آب حیات ہمارے لیے ادبی تاریخ وتنقید کا اچھا خام مواد ہے۔

آب حیات میں محمد حسین آزاد کے بہت سے بیانات اور ان کے پیش کیے ہوئے بعض حقائق پر جدید محققین نے سوالیہ نشانات قائم کیے ہیں اور آب حیات کی غلطیوں کی تفصیل سے نشاندہی کی ہے۔ یہاں پر ان تحقیقی کوتاہیوں پر گفتگو میرا موضوع نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد نے بعض بیانات تحقیق کے بغیر لکھ دیئے یا اس وقت ان کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ ان کی صحت کی تصدیق کر سکتے۔ اس کے علاوہ آزاد نے بعض باتیں اپنے اسلوب نگارش کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے بڑھا دیں۔ اور واقعہ میں قصہ نگاری کو شامل کر دیا۔ لیکن جن شعراء کے کلام کے بارے میں انھوں نے رائے دی ہیں وہ رائیں محمد حسین آزاد کی اپنی رائیں ہیں اور یقیناً وہ ان کی تنقیدی بصیرت، سخن فہمی اور باریک بینی کی نشاندہی کرتی ہیں، میر کے بارے انھوں نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کی زندگی، ان کا اکبرآباد سے دہلی آنا، دہلی سے لکھنؤ جانا اور اس سلسلے میں کئی قصے کہانیاں، آب حیات میں ملتی ہیں لیکن اسی تفصیل کے ساتھ انھوں ے میرؔ کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ اور ان کے محاسن کلام کی طرف بلیغ تنقیدی اشارے کیے ہیں۔ ان کے کلام کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''غرض ہر چند کہ تخلص ان کا میرؔ تھا، مگر گنجۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے۔ قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں دیکھا۔ اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑایا۔ ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے۔'' ۶۲

ان کے اس بیان سے اس عہد میں میر کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آزاد نے میرؔ کے چھ دواوین کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے اشعار کی تعداد اور مصحفی کے تذکرے کا

حوالہ بھی دیا ہے۔ آزاد میر کے کلام میں فصاحت اور اثر انگیزی کے ساتھ بہتر نشتر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غزلوں کے دیوان، اگرچہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں۔ اُردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں۔ ستر اور دو بہتر نشتر ہیں۔ باقی میر صاحب کا تبرک ہے لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے۔ کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس سے مبالغہ تعریف میں یہی سنا جاتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے انھوں نے زبان اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی ہے اتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل اصول غزلیت کے لحاظ میں سودا سے بہتر ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔ اور فکر کو بجائے کاہش کے لذّت بخشتا ہے۔ اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دلعزیز ہے۔ حقیقت میں یہ انداز میر سوز سے لیا ہے۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا۔''[۶۳]

محمد حسین آزاد میر کے کلام کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس میں فصاحت اور نشتریت کے ساتھ روزمرہ کی اہمیت بھی ہے جسے انھوں نے ''گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا'' یہ جملہ خود بہت بڑا جملہ ہے۔ اور آزاد کے تنقیدی شعور کو ظاہر کرتا ہے۔ میر نے زبان کا جس طرح استعمال کیا اس کا احساس رفتہ رفتہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بڑھتا گیا اور آج میر کی جس صفت پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ ان کا روزمرہ اور زبان کا استعمال ہے۔ آزاد نے جن الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا۔ یعنی گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دینا وہ میر کی ایک بہت بڑی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے جسے آزاد نے محسوس کیا۔

آزاد نے آبِ حیات میں ان تمام اصناف سخن پر روشنی ڈالی ہے جن پر میر نے طبع آزمائی کی ہے اور ان تمام اصناف سخن پر انھوں نے تبصرہ کیا ہے کہ ان میں میر کی کیا اہمیت ہے یا اس مخصوص صنف میں میر نے کتنی کامیابی حاصل کی۔ قصیدہ واسوخت، مناقب، مثنویاں اور ان مثنویوں پر الگ الگ اظہار خیال کر کے آزاد نے میر کے کلام پر تنقیدی رائے دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مجموعی طور پر میر کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دے کر باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعراء کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔ گویا اردو کے سعدی ہیں۔ ہمارے عاشق مزاج شعراء کی رنگینیاں، اور خیالات کی بلند پروازیاں، ان کے مبالغوں کے جوش وخروش سب کو معلوم ہیں، مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان میں سے بھی میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش ونشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا۔ وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اس کا دکھڑا سناتے چلے گئے جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں کیونکہ ایسے مضامین اور شعراء کے لیے خیالی تھے ان کے حالی تھے۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی، زارنالی، حسرت مایوسی، ہجر کے لباس میں خرچ ہوئے۔ ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا نہیں، حسرت واندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے بس۔ جو دل پر گذرتے تھے وہی زبان

سے کہہ دیتے تھے کہ سننے والوں کے لیے نشتر کا کام کر جاتے تھے
ان کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں۔ مگر
چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آبِ حیات بہاتے ہیں جو لفظ منہ
سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔'' ۶۴

اس طرح آبِ حیات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں تک تنقید میرؔ کا تعلق ہے، محمد حسین آزاد نے بڑی احتیاط اور تنقیدی توازن کے ساتھ میرؔ کے کلام کا جائزہ لیا۔ اس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آبِ حیات تنقید میرؔ کے سلسلے میں تذکروں کے بعد پہلا قدم ہے۔

آبِ حیات کے بعد مولانا حکیم سید عبدالحیٔ کا تذکرہ ''تذکرہ شعرائے اُردو موسوم بہ گلِ رعنا'' کے عنوان سے ۶ر ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ یہ تذکرہ بھی تاریخی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عبدالحیٔ نے اس تذکرے میں جہاں میرؔ کے متعلق آزاد کے قائم کردہ بہت سے مفروضات کی تردید کی ہے وہیں چند نئی باتوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ مثلاً آزاد نے میرؔ کو بد دماغ / نازک مزاج قرار دیا تو عبدالحیٔ نے نہایت مہذب انسان۔ لکھتے ہیں:

''نکات الشعرا کی مدد سے نیز تذکرہ نویسوں کی تحریر سے
میرؔ صاحب میں جو اوصاف ہمیں نظر آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ
نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند، اور وضعدار
آدمی تھے۔ میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ہر کام متانت اور
آہستگی کے ساتھ کرتے، بات بہت کم کرتے اور وہ بھی آہستہ
آواز میں، نرمی اور ملائمت مزاج میں قناعت اور غیرت حد سے
بڑھی ہوئی صلاحیت و برسر کاری کے ساتھ عادات و اطوار نہایت
سنجیدہ و متین، ہر وقت محویت کا عالم طاری، اپنے خیالات میں
ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے۔'' ۶۵

عبدالحیٔ نے نکات الشعراء کے ذکر میں لکھا ہے کہ محمد حسین آزاد کی یہ رائے کہ میرؔ

ولی کو "شاعر یست از شیطان مشہور تر" قرار دیتے ہیں۔ صرف خیال پر مبنی ہے۔ نکات الشعراء کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ میر نے ولی کے متعلق ایسی کوئی رائے نہیں دی ہے بلکہ وہ ولؔی کے لیے لکھتے ہیں:

"از کمالِ شہرت احتیاج تعریف ندارد۔" ۶۶

عبدالحی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ نکات الشعراء میں ایسا کوئی ذکر ولؔی کے متعلق نہیں ہے جس کی وجہ سے میرؔ کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکے۔ مگر اس کے باوجود آبِ حیات کی تنقیدی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ عبدالحی میر کی سوانح پر تو تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں مگر کلامِ میرؔ کے سلسلے میں صرف اتنا لکھتے ہیں:

> "میر صاحب کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان ریختہ غزلوں کے ہیں، چند صفحے ہیں جن میں فارسی کے عمدہ اور متفرق اشعار پر اردو مصرع لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے، رباعیاں، مستزاد چند صفحے، پانچ قصیدے، چند مخمس، اور ترجیع بند، شکایت زمانہ میں دو واسوخت، ایک ہفت بند، بہت سی مثنویاں، ایک دیوان فارسی کا ہے، جن میں دو ہزار شعر ہیں، میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں، قصیدے کے مردِ میدان نہیں، آزاد نے ٹھیک لکھا ہے کہ ان کے قصیدے کم ہیں، اور اسی قدر درجہ میں کم ہیں، واسوخت لاجواب ہیں، فارسی میں فغانی یا وحشی، اردو میں میر صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے۔" ۶۷

حکیم عبدالحی کا یہ اقتباس ہمیں صرف ان اصناف سے روشناس کراتا ہے جن پر میرؔ نے طبع آزمائی کی۔ میر کی شاعری کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟ یا میر کو کس وجہ سے عظیم شاعر تسلیم کیا گیا۔ عبدالحی اس کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ آزاد نے جس طرح میرؔ کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے وہ نقدِ میر میں خاص اہمیت رکھتا ہے مگر عبدالحی کلام میرؔ پر کسی قسم کی تنقیدی رائے دینے کے بجائے صرف میر کے سوانحی حالات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کا تذکرہ گلِ رعنا میرؔ کی سوانح کے اعتبار سے تو اہم ہوسکتا ہے مگر میر کی شاعری پر کوئی گرانقدر

رائے نہ دینے کے سبب تنقید میر میں کوئی مقام نہیں رکھتا۔

''تذکرہ اعجازِ سخن'' شیر علی خاں سرخوش کا تصنیف کردہ ہے اپنے دیباچے میں ہی انھوں نے اس طرف اشارہ کردیا ہے کہ وہ آزاد، حالیؔ اور شبلیؔ کے نقشِ قدم پر چلنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں، مگر جہاں کہیں اختلاف کا موقع آیا ہے اس سے گریز نہیں کرتے۔ مثلاً آزاد سے ان کو یہ شکایت ہے کہ ''انھوں نے پنجابی زبان کا اُردو کے ساتھ جو آبائی تعلق ہے اس پر کما حقہٗ توجہ نہیں کی ہے'' حالیؔ کے مقدمہ شعرو شاعری میں بیان کردہ اصولوں کو بھی انھوں نے مختصراً بیان کیا ہے جس میں اخلاقی یا نیچرل شاعری کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں حالیؔ سے قبل اُردو میں عشقیہ شاعری کا دور تھا ان کے دیوان کے مقدمے کی اشاعت سے اُردو میں اخلاقی اور نیچرل شاعری کے دور کی ابتداء ہوئی۔ میر کے یہاں آزاد کی طرح وہ بھی بہتر نشتر کا ذکر کرتے ہیں۔ میر نے نکات الشعراء کے آخر میں شاعری کی جن چھ قسموں کا بیان کیا ہے شیر علی خاں سرخوش ان تمام قسموں کا بیان کرتے ہوئے کلام میر سے مثالیں بھی دیتے ہیں۔ مثلاً شاعری کی چھٹی قسم جس کے بارے میں میر نے لکھا ہے کہ ''یہ وہ انداز ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کا ترجمہ شیر علی نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''ششم۔ وہ انداز جو اکابر شعراء نے عموماً اختیار کر رکھا ہے اور ان میں میرا بھی شمول ہے۔ یعنی تجنیس، ترصیع، تشبیہ، معاملہ بندی، صفائی گفتگو اور فصاحت و بلاغت وغیرہ کا التزام اپنے کلام میں مثلاً ؎

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اس شعر میں ایک اور دو صنعت، صنعتِ تجنیس کے خیال سے لائے گئے ہیں [۶۸]

اسی طرح نیچرل شاعری کے ضمن میں میرؔ کی تشبیہ کو نیچرل قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل شعر مثال میں دیتے ہیں ؎

چار دیواریٔ عناصر میرؔ
خوب جاگہہ ہے پر ہے بے بنیاد

حالی کی تنقید کے زیر اثر وہ میرؔ کی ایک مثنوی ''جھوٹ کی مذمت'' کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر چہ میرؔ کی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں یہ بہتر نہیں ہے۔ میر و مرزا کا تقابل کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ''سودا کا کلام صنعتوں سے یا نزاکت زبان سے عموماً عاری ہے وہ تو صاف صاف ایک کھری بولی کلام میں کھپانا جانتا ہے مگر میر صاحب دلی کے روڑے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں ان کو یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ کوئی بات ایک لوچ اور خاص دہلویوں جیسے استعاروں۔ لب ولہجہ اور بعض محدود محاوروں سے خالی نہ ہو۔'' ۶۹

شیر علی خاں کی اس بات سے اتفاق ممکن نہیں کہ میرؔ استعاروں اور لب ولہجہ پر خاص توجہ دیتے ہیں یہ ضرور ہے کہ میرؔ کی زبان سادہ و سلیس اور سہل ممتنع ان کی اہم خصوصیت ہے مگر اس کی وجہ دہلویوں کے استعارے یا محدود محاورے نہیں ہیں بلکہ میرؔ کے اس انداز میں بھی ایک معنوی تہہ داری پوشیدہ ہے۔ بہر حال شیر علی کا تذکرہ میرؔ کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ''نیچرل'' ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی کا مرتب کردہ تذکرہ/انتخاب ''جواہر سخن''
۱۹۳۳ء میں شائع ہوا یہ تذکرہ چھ جلدوں اور ایک بسیط مقدمے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر تاراچند نے اس کے تعارف میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ ہندوستانی اکیڈمی (صوبہ متحدہ الہ آباد) کی چھ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

> ''اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ نے ۱۹۲۷ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کے سربرآوردہ سخنوروں کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے، ضرورت یہ تھی کہ ایک ایسا جامع انتخاب مرتب ہو جس میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب ہو بلکہ وہ ہر صنفِ سخن پر جاری ہو، اس میں تاریخی اصول بھی مدِ نظر رہے تاکہ شعرا اور اس کے زمانے کا تعلق عیاں ہو جائے اور زبان کی تدریجی ترقی کی منزلیں نگاہ

کے سامنے آجائیں۔'' ۷۰ے

اس انتخاب کی وہی نوعیت ہے جو صہبائی کے تذکرے ''انتخاب دواوین اردو کا'' کی ہے اور چونکہ یہ انتخاب تاریخی اعتبار سے کیا گیا ہے اور شعراء کے کلام پر تبصرہ بھی ہے اس لیے اسے تاریخی تذکروں میں شامل کیا گیا ہے۔

اس تذکرے/انتخاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولوی محمد مبین کیفی کو اس کا مرتب مقرر کرنے کے بعد اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے چھ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی اس انتخاب پر نظر ثانی کے لیے مقرر کی۔ ہر رکن کو ایک جلد سپرد کی گئی ان ارکان میں سید محمد سلیمان ندوی، مسعود حسن رضوی ادیب، جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا نعیم الرحمٰن اور مرزا محمد عسکری شامل تھے۔

محمد مبین چریا کوٹی نے اپنے تذکرے/انتخاب میں میرؔ کی زندگی کے حالات، نازک مزاجی، خودداری، بیباکی اور قناعت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے وہ ''درد و تاثیر'' کو ان کی شاعری کی اہم خصوصیت قرار دیتے ہیں۔

> ''میر صاحب کو فطرت نے ایک درد بھرا دل عطا کیا تھا، جن گودوں میں انھوں نے تربیت پائی، جن تکلیفوں میں ان کی زندگی بسر ہوئی اور جو انقلابات ان کی آنکھوں نے دیکھے، ان سب کے اثر نے ان کو سراپا درد بنا دیا تھا۔۔۔۔۔۔ میر کے لیے شاعری نہ کوئی صفت تھی نہ تفنن طبع کا ذریعہ بلکہ شاعری ان کی ذات کا ایک جز اور ان کی طبیعت کا ایک عنصر تھی وہ شاعر پیدا ہوئے تھے۔ اپنی شاعری کا موضوع بیشتر وہ خود ہی ہیں۔۔۔۔ ان کی شاعری ان کے قلبی واردات کی صحیح تفسیر ہے۔۔۔۔۔ میرؔ کی شاعری سے میر کی سچی تصویر تصور کی آنکھوں سے سامنے آجاتی ہے۔'' ا ۷ے

مبین چریا کوٹی کا میرؔ کے کلام پر کیا گیا تبصرہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ اپنے تنقیدی نقطۂ نظر میں محمد حسین آزاد اور عبدالحق سے متاثر تھے، انھوں نے ان دونوں ناقدین کی طرح میرؔ کی شاعری کا سلسلہ ان کی شخصیت اور وارداتِ قلبیہ سے جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ میرؔ کے سلسلے

حالی کی تنقید کے زیرِ اثر وہ میرؔ کی ایک مثنوی ''جھوٹ کی مذمت'' کا ذکر کرتے ہیں۔اگرچہ میرؔ کی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں یہ بہتر نہیں ہے۔میر و مرزا کا تقابل کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ''سودا کا کلام صنعتوں سے یا نزاکت زبان سے عموماً عاری ہے وہ تو صاف صاف ایک کھری بولی کلام میں کھپانا جانتا ہے مگر میر صاحب دلی کے روڑے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں ان کو یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ کوئی بات ایک لوچ اور خاص دہلویوں جیسے استعاروں۔لب ولہجہ اور بعض محدود محاوروں سے خالی نہ ہو۔''۶۹

شیر علی خاں کی اس بات سے اتفاق ممکن نہیں کہ میرؔ استعاروں اور لب ولہجہ پر خاص توجہ دیتے ہیں یہ ضرور ہے کہ میرؔ کی زبان سادہ و سلیس اور سہل ممتنع ان کی اہم خصوصیت ہے مگر اس کی وجہ دہلویوں کے استعارے یا محدود محاورے نہیں ہیں بلکہ میرؔ کے اس انداز میں بھی ایک معنوی تہہ داری پوشیدہ ہے۔بہر حال شیر علی کا تذکرہ میرؔ کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ''نیچرل'' ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی کا مرتب کردہ تذکرہ/انتخاب ''جواہرِ سخن'' ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا یہ تذکرہ چھ جلدوں اور ایک بسیط مقدمے پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر تارا چند نے اس کے تعارف میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ ہندوستانی اکیڈمی (صوبہ متحدہ الٰہ آباد) کی چھ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔مزید لکھتے ہیں:

> ''اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ نے ۱۹۲۷ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کے سربرآوردہ سخنوروں کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے،ضرورت یہ تھی کہ ایک ایسا جامع انتخاب مرتب ہو جس میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب ہو بلکہ وہ ہر صنفِ سخن پر جاری ہو، اس میں تاریخی اصول بھی مدِ نظر رہے تا کہ شعرا اور اس کے زمانے کا تعلق عیاں ہو جائے اور زبان کی تدریجی ترقی کی منزلیں نگاہ

کے سامنے آ جائیں۔''۷۰

اس انتخاب کی وہی نوعیت ہے جو صہبائی کے تذکرے ''انتخاب دواوین اردو کا'' کی ہے اور چونکہ یہ انتخاب تاریخی اعتبار سے کیا گیا ہے اور شعراء کے کلام پر تبصرہ بھی ہے اس لیے اسے تاریخی تذکروں میں شامل کیا گیا ہے۔

اس تذکرے/انتخاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولوی محمد مبین کیفی کو اس کا مرتب مقرر کرنے کے بعد اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے چھ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی اس انتخاب پر نظر ثانی کے لیے مقرر کی۔ ہر رکن کو ایک جلد سپرد کی گئی ان ارکان میں سید محمد سلیمان ندوی، مسعود حسن رضوی ادیب، جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا نعیم الرحمٰن اور مرزا محمد عسکری شامل تھے۔

محمد مبین چریا کوٹی نے اپنے تذکرے/انتخاب میں میرؔ کی زندگی کے حالات، نازک مزاجی، خودداری، بیباکی اور قناعت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے وہ ''درد و تاثیر'' کو ان کی شاعری کی اہم خصوصیت قرار دیتے ہیں۔

> ''میر صاحب کو فطرت نے ایک درد بھرا دل عطا کیا تھا، جن گودوں میں انھوں نے تربیت پائی، جن تکلیفوں میں ان کی زندگی بسر ہوئی اور جو انقلابات ان کی آنکھوں نے دیکھے، ان سب کے اثر نے ان کو سراپا درد بنا دیا تھا۔۔۔۔۔میر کے لیے شاعری نہ کوئی صفت تھی نہ تفنن طبع کا ذریعہ بلکہ شاعری ان کی ذات کا ایک جز اور ان کی طبیعت کا ایک عنصر تھی وہ شاعر پیدا ہوئے تھے۔ اپنی شاعری کا موضوع بیشتر وہ خود ہی ہیں۔۔۔۔ان کی شاعری ان کے قلبی واردات کی صحیح تفسیر ہے۔۔۔۔۔میرؔ کی شاعری سے میرؔ کی سچی تصویر تصور کی آنکھوں سے سامنے آ جاتی ہے۔'' ۷۱

مبین چریا کوٹی کا میرؔ کے کلام پر کیا گیا تبصرہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ اپنے تنقیدی نقطۂ نظر میں محمد حسین آزاد اور عبدالحق سے متاثر تھے، انھوں نے ان دونوں ناقدین کی طرح میرؔ کی شاعری کا سلسلہ ان کی شخصیت اور وارداتِ قلبیہ سے جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ میرؔ کے سلسلے

میں انھوں نے کوئی نئی بات تو نہیں کہی مگر پھر بھی یہ تذکرہ نقدِ میر میں اہمیت رکھتا ہے۔

اُردو شعراء سے متعلق فارسی و اُردو میں لکھے گئے تذکروں کی تعداد کم و بیش ۷۸ ہے۔ ان میں کچھ تذکرے نایاب ہیں اور کچھ تذکرے ایسے ہیں جو جو اب تک شائع نہیں ہوئے۔ بہرحال ان تذکروں میں میرؔ سے متعلق جس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ تذکرے نہ لکھے گئے ہوتے تو میرؔ کی شاعری کی بعض اہم خصوصیات جن پر آگے چل کر نقدِ میرؔ کی بنیاد رکھی گئی۔ وہ اس عہد میں زیرِ بحث نہ آتیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے میر کے کلام کے متعلق ان اصطلاحات کا استعمال آج سے بہت عرصہ پہلے کیا جس وقت کسی قسم کے تنقیدی معیار کا تعین نہیں ہوا تھا۔

اب ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تذکروں میں پائی جانے والی تنقید کو تنقید قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ یہ بحث کافی پرانی ہو چکی ہے کہ تذکروں کی کوئی تنقیدی اہمیت ہے یا نہیں ہے۔ خود تذکرہ نگاروں نے شاعری کے بارے میں بعض جگہوں پر جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے ان کی گہری تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے پہلے تذکرے ''نکات الشعراء'' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جس میں میر نے شاعری کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے چھ قسموں یا طرز میں تقسیم کیا۔ اور چھٹے طرز کو سب سے زیادہ اہم قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''چھٹا طرز وہ ہے جو کہ ہم نے اختیار کر رکھا ہے اور وہ
> تمام صنعتوں پر حاوی ہے، تجنیس، ترصیع، تشبیہہ، صفائی گفتگو،
> فصاحت، بلاغت، ادا بندی اور خیال وغیرہ سب اسی ضمن میں
> آتے ہیں۔''۲ے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ کو شعر کی جمالیاتی اور فنی قدروں کا شعور تھا ورنہ میرؔ اس تفصیل کے ساتھ شعر کی ان خصوصیات کا ذکر نہ کرتے۔

میرؔ کے علاوہ دوسرے تذکرہ نگار مصحفی بھی شاعر کا ''موزوں طبع'' ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں:

> ''طبیعت کی موزونیت کے ساتھ شاعر کے اندر شاعری

کا فطری رجحان ہونا ضروری ہے۔ استاد کے ذریعہ کی گئی اصلاحات کلام کے محاسن و معائب کی تمیز اور زبان و محاورے کی صحت کا شعور پیدا کرتی ہیں۔ فصاحت بیان، بلاغت کلام، بندش کی چستی، الفاظ کی شیرینی، زبان اور محاورے کی صحت ان کے نزدیک شعر کی اہم خصوصیات ہیں''۔ ۳ے

اس کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہوگا کہ اس عہد میں بھی شاعری اور زبان کے معیار کا ایک اعلیٰ تصور اس عہد کے اہم شعراء اور تذکرہ نگاروں کے سامنے تھا۔ لیکن ہمارے بعض ناقدین تذکرے کی تنقید کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ مثلاً کلیم الدین احمد کا خیال ہے۔

''تنقید کی ماہیت اور اس کے مقصد اور اس کے صحیح اسلوب سے بھی تذکرہ نویس واقفیت نہ رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔ان تذکروں کی اہمیت تاریخی ہے ان کی دنیائے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تاریخی اہمیت اور تنقیدی اہمیت میں مشرقین کا فرق ہے۔۔۔۔۔۔ جہاں تک تنقید کا واسطہ ہے ان تذکروں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔''۴ے

کلیم الدین احمد تذکروں کی تنقید کو جب سطحی قرار دیتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ تذکرے کب لکھے گئے۔ اس وقت زبان اور شعر و ادب کی کیا نوعیت تھی وہ تذکروں کو بھی جدید مغربی تنقید کے پیمانوں پر تولتے ہیں اور اسی لیے اسے رد کر دیتے ہیں۔ جو انصاف کے منافی ہے۔ تذکروں کو جدید علم اور تنقیدی رجحانات کے تحت پرکھنا درست نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ:

''ان کے اندر سختی سے کسی ایسی چیز کی تلاش کرنا جو ادبی فنی یا تنقیدی نقطۂ نظر سے مکمل ہو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ دیکھنا ہے کہ انفرادی اور شخصی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود کس حد تک ان میں غیر شعوری طور پر وہ عناصر پیدا ہو گئے ہیں جن کو ادبی، فنی یا تنقیدی اہمیت حاصل ہے۔''۵ے

عبادت بریلوی تذکروں کی تنقید کو مانتے تو ہیں لیکن اسے ''غیر شعوری'' قرار دیتے ہیں حالانکہ اگر تذکروں کی ''نکتہ چینی'' اور ''خوردہ گیری'' شعوری ہے اور اس وجہ سے تذکرہ نگار پر اعتراض کیا جاسکتا ہے تو جہاں وہ محاسن کلام کا ذکر کرتا ہے یا کسی شاعر کے بارے میں توصیفی کلمات لکھتا ہے وہ غیر شعوری کیوں کر ہوسکتے ہیں۔ پھر تذکرہ نگار ایک طرح سے شاعری کے بارے میں اپنی پوری فنی بصیرت کا اظہار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اظہار غیر شعوری نہیں ہوسکتا۔ عبادت بریلوی بھی تذکروں کے بارے میں عام طور پر رائج خیال سے متاثر رہے انھوں نے تذکرے کی اہمیت کو تو محسوس کیا لیکن اس پر کھل کر رائے دینے سے گریز کیا۔ تذکرے بڑا تنقیدی کارنامہ نہیں ہیں۔ اس بات میں دو رائے نہیں ہوسکتی لیکن اپنے عہد کی تنقیدی بصیرت کا بہت بڑا ثبوت ہیں اور اس تنقید کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے اس سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اور تذکروں کی تنقیدی اصطلاحات کی روشنی میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اسے ایک غیر جانبدارانہ رائے قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> تذکروں میں تنقید کے سلسلے میں جو بات غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہے وہ اس کا ایجاز واختصار ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت رائے زنی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض موقعوں پر یہ رائے زنی ہی ہے لیکن اسی کے ساتھ اس پر نگاہ رکھنی ضروری ہے کہ تذکرہ نگار جن الفاظ یا اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے اس کا ایک وسیع پس منظر ہے اس لیے وہ سہ حرفی یا چہار حرفی لفظ یا چند لفظوں سے بنا ہوا جملہ صرف وہی معنی نہیں دیتا جو اس لفظ کے ظاہرا یا لغوی معنی ہیں بلکہ وہ اپنے پورے سیاق وسباق کی ترسیل کرتا ہے۔ اس لیے وہ رائیں جو چند لفظوں کے استعمال کی وجہ سے مختصر نظر آتی ہیں۔ اتنی مختصر بھی نہیں ہیں۔ مثلاً جدید اصطلاحات میں اگر یہ کہا جائے کہ غالبؔ کے یہاں تفکر ہے، انیسؔ کے کلام میں بڑی بلاغت ہے، فانیؔ قنوطی شاعر

> تھے، فیضؔ کی عظمت ان کے نظریۂ حیات میں پوشیدہ ہے، فراقؔ احساس و جمال کے شاعر ہیں، وغیرہ وغیرہ، تو ہر جملہ اس شخص کے بارے میں ایک تنقیدی نظریے اور رجحان کو پیش کرتا ہے اور اپنے اختصار کے باوجود اس شاعر کے فن کو سمجھنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے کہ آج، تفکر، بلاغت، قنوطی، نظریۂ حیات احساس جمال وغیرہ صرف معمولی الفاظ ہی نہیں بلکہ پوری ایک فکر، نظریہ اور تنقیدی رویّے کی نشاندہی کرتے ہیں اسی طرح تذکروں میں استعمال کیے جانے والے الفاظ کو بھی دیکھنا ہوگا۔''۶ے

تذکروں کا مطالعہ ہمیں آج کے پس منظر میں نہیں بلکہ اس عہد کے پس منظر میں کرنا چاہئے جب تنقید کے اصول و معیار مقرر نہیں تھے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے تذکروں کا مطالعہ کیا جائے گا تو اس کے نتائج زیادہ کارآمد ہوں گے۔

میرؔ کے سلسلے میں تذکروں کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ جن اصطلاحات کا استعمال میرؔ کے کلام کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں نے کیا۔ وہی اصطلاحات جدید دور میں بھی میرؔ پر تنقید کی کلید بنیں، تذکرہ نگاروں نے کہیں ان خصوصیات کو نام دیا اور کہیں صرف ان کی نشاندہی کردی۔ میرؔ کے متعلق اقتباسات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ میرؔ کے کلام پر اس دور میں تذکرہ نگار کس طرح غور وفکر کے بعد اظہار خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> تذکرہ نویسوں نے تنقید کی ماہیت اور اس کے مقصد سے تذکروں میں بحث نہیں کی ہے (کیونکہ) یہ ان کا میدان ہی نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے کلام پر جو رائیں دی ہیں ان سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ تنقید کے مفہوم سے واقف تھے اور اس کا شعور بھی رکھتے تھے۔ (ان کے یہاں) تنقید ہے لیکن اجمال کے ساتھ معیار ہیں لیکن وہ آج کل کے معیاروں سے مختلف ہیں۔ اس لیے تذکروں میں صرف تنقیدی روایات اور تنقیدی شعور کی

تلاش کرنا چاہئے۔ تنقید کے مکمل اور بہترین نمونوں کو ڈھونڈھنا
بے سود ہے۔'' ۷ے

ڈاکٹر محی الدین قادری زور جن کا شمار اُردو کے اہم محققین اور ناقدین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی تذکروں کی تنقیدی اہمیت کا اعتراف کیا ہے بلکہ ان کے Approach کو زیادہ سائنٹفک قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے تذکروں کی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے انھیں تین زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ اول وہ تذکرے جو کسی شاعر نے لکھے دوسرے وہ تذکرے جو کسی بڑے شاعر کے معتقد نے لکھے اور تیسرے وہ تذکرے جو کسی سخن فہم نے لکھے۔ ڈاکٹر زور تیسری قسم کے تذکروں کو زیادہ اہم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''اس قسم کے تذکروں میں غیر جانبدارانہ رائیں ملتی ہیں''۔ لیکن پہلی قسم کے تذکروں کا بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''قسم اوّل کے تذکرے چونکہ خود بڑے شاعروں کے
قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کو اہم ادبی تنقید کا درجہ بھی
دیا جاسکتا ہے۔'' ۸ے

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی رائے بھی کم و بیش یہی ہے۔ انھوں نے تذکروں میں تنقید سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بعض جدید نقادوں کا یہ خیال ہے کہ اردو کے تذکروں
میں تنقید ہے ہی نہیں لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ اس زمانے
کے معائرِ تنقید جدا تھے۔۔۔۔۔ اس زمانے میں ادبی تنقید کا بڑا
مقصد یہ تھا کہ ادب کو متروکات اور غیر فصیح الفاظ کے نقطۂ نظر سے
دیکھا جائے اور اردو شاعری کو فارسی شاعری کے رتبہ پر پہنچایا
جائے۔۔۔۔ یہی سبب ہے کہ تذکروں میں ہمیں نقدِ شعر کے
متعلق مفصل جزئیات نہیں ملتیں۔'' ۹ے

پروفیسر شارب ردولوی نے تذکروں کے اختصار اور اس وقت کے تنقیدی رویے کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”(تذکروں میں پائے جانے والے الفاظ) بظاہر سیدھے سے الفاظ ہیں لیکن ان کے پس پردہ اس عہد کا پورا تنقیدی نظام ہے تذکرہ نگار کے پاس ان الفاظ کو استعمال کرنے کے لیے کچھ معیار تھے۔ اور اس وقت کا قاری انھیں عام طور پر سمجھتا تھا۔ قادر سخن، صاحب کمال، نکتہ پرداز، بسیار خوش فکر، متصرف ملک زور طلب بلاغت، اپنے اندر پورا نظام بدیع و بیان اور جمالیات وفن رکھتے تھے۔ آج تنقید میں ایک بات کو کئی کئی جملوں اور پیراگراف میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس وقت تذکرہ نگار انھیں مختصراً پیش کرتا تھا۔ اس کے تفصیل سے رائے نہ دینے کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ اوّل تذکرہ کا اختصار زیادہ تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے وہ جو بات اس وقت کے قاری تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ الفاظ کافی تھے۔“ ۸۰

اس بحث سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کلیم الدین احمد کے علاوہ اردو کے اہم ناقدین نے تذکروں کی تنقیدی اہمیت کو رد نہیں کیا ہے۔ یہ رائے مختصر ہے، غیر جانبدارانہ نہیں ہے، صرف توصیفی یا تنقیصی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عہد کے تنقیدی تصور اور تنقیدی معیار کو پیش کرتی ہے۔ اور ان کے تنقیدی جملوں اور اصطلاحات سے بہت سے شعراء کے کلام پر تنقید میں جدید ناقدین نے بھی روشنی حاصل کی ہے۔

اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد کہ تذکروں میں پائی جانے والی تنقید یا شعراء کے بارے میں رائیں خود اپنی ایک اہمیت رکھتی ہیں۔ اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تذکروں میں میر کے بارے میں جو اظہار خیال کیا گیا اسے نقدِ میر میں کس درجہ پر رکھا جاسکتا ہے۔

میر کے بارے میں عہد میر میں لکھے گئے تذکرے یا بعد میر ضبط تحریر میں آنے والے تذکروں میں میر کی شاعری کے بارے میں جو اظہار خیال کیا گیا اس کا تفصیلی ذکر اس باب میں آچکا ہے۔ یہاں اسے دوبارہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میر نے اپنی زندگی ہی میں اتنی اہمیت حاصل کرلی تھی کہ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ان کے کلام کا معترف نہ رہا ہو

سب نے اپنے اپنے خیال، سلیقے، سخن فہمی کے معیار، اور تنقیدی بصیرت کے مطابق ان کی تعریف کی۔ ان کے تذکرے نکات الشعراء سے کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچی اور تذکرہ نگاری میں پہلے ہی تذکرے کے بعد گروہ بندی کی سی شکل پیدا ہوگئی لیکن اس گروہ بندی کا اثر میرؔ کی اہمیت کو کم نہیں کرسکا۔ کسی تذکرہ نگار نے اپنے تذکرہ میں میرؔ کے اشعار کا انتخاب بہت کم دیا۔ کسی نے ان کی شاعری کے بارے میں واضح طور پر رائے نہیں دی ایسے معدود چند تذکرے ملتے ہیں ورنہ ان کے پہلے مخالف فتح علی حسینی گردیزی بھی انھیں سخن سنج بے نظیر'' و طبعش معنی ایجاد'' قرار دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ قیام الدین قائم، ''جامع آیات سخندانی'' ''معجز طراز کرامت تحریر'' لچھمی نرائن شفیقؔ ''مضامین رنگین'' می سازد، ہزاراں معنی بیگانہ غلام خیالش'' قدرت اللہ شوقؔ شہ سوار سمندِ عرصہ فصاحت، فارسِ مضمارِ بلاغت، خوش فکر، محاوراں داں، متلاشی مضامین رنگیں، سادہ گو، تہہ داری و پرکاری رکھنے والا قرار دیتے ہیں۔ میر حسنؔ افصح فصحائے زماں اور قدرت اللہ قاسم انھیں شاعر بے نظیر، عندلیب باغ فصاحت اور بلبل گلزارِ بلاغت، شیر تیشہ سخنوری، معنی آفریں، سحر بیان، صنائع بدائع آگیں، میر اقلیم شیریں زبانی، دبیر قلم واشعارش، ضرب المثل سرآمد شعرائے فصاحت، قرار دیتے ہیں۔ اب ان الفاظ و اصطلاحات کے پیچھے چھپے ہوئے بدیع و بیان اور جمالیات وفن کے پہلوؤں پر نظر ڈالیے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ یہ تنقیدی جملے یا تراکیب نقدِ میرؔ کی بنیاد ہیں۔ ان میں میرؔ کی شاعری کے اکثر پہلوؤں کا ذکر آگیا ہے۔

یہ تذکرے میرؔ کی زندگی میں لکھے گئے اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی کی صلاحیتوں یا اس کے ہنر کا اعتراف خود اس کے زمانہ زندگی میں کم کیا گیا ہے۔ لیکن میرؔ کے بارے میں لوگوں نے دل کھول کر اظہار خیال کیا ہے۔ اسی طرح حیاتِ میرؔ کے بعد لکھے جانے والے تذکروں کا حال ہے۔ عام طور پر کسی شخصیت کے معیار و اقدار کا تعین اس کے انتقال کے بعد بہتر طریقے پر کیا جاتا ہے اس لیے کہ اس کے بعد اس کی شخصیت کا تاثر نہیں رہتا اور غیر جانبداری سے اس کے کلام کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

میرؔ کے انتقال کے بعد لکھے جانے والے تذکروں کا بھی تفصیلی ذکر آچکا ہے۔ جس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کے انتقال کے بعد ان کے بارے میں جن آراء کا اظہار کیا گیا وہ ان رایوں سے بہت مختلف نہیں ہیں جو ان کی زندگی میں دی گئیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کے بعد ان کے کلام پر زیادہ تفصیل اور زیادہ گہرائی سے اظہار خیال کیا گیا یہاں پر صرف چند اہم تذکروں کی روشنی میں گفتگو کی جائے گی، مثلاً دستور الفصاحت کے مصنف احد علی خاں یکتا، میر کو، سحر کار، سلطانِ اقلیم فصاحت، فرمان فرمائے کشور بلاغت، سخن قادر، غزل وطرز گفتہ کہ ہیچکس نمی تواند، محاوراں افتاداں اور ممتنع جیسی صفات کا ذکر کرتے ہیں۔ گارساں دتاسی انھیں افصح الفصحاء اور کریم الدین انھیں افصح فصحاء اور ابلغ بلغاء، اشعر شعراء قرار دیتے ہیں۔ احمد حسین سحر لکھنوی، ان کی ادائے معانی، عاشقانہ مضمون کے ساتھ ان کے کلام میں شور انگیزی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اب تک کسی تذکرے میں میر کی حرماں نصیبی اور یاس انگیزی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ احمد حسین سحر کا تذکرہ ''بہارِ بے خزاں'' پہلا تذکرہ ہے جس میں میر کے کلام میں ناکامی ویاس وحرماں نصیبی کا ذکر آیا۔ اس کے بعد اکثر تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا اور بعد میں تو وہ بہتر نشتر اور یاسیت کے شاعر ہی قرار دے دیئے گئے۔ عبدالغفور نساخ بھی میر کی دوسری خصوصیات کے مقابلے میں ان کی درد انگیزی پر زیادہ زور دیتے ہیں ان کا جملہ ہے ''جو درد کہ ان کے کلام میں ہے کسی شاعر ریختہ گو کے کلام میں نہیں ہے''۔ آبِ حیات میں محمد حسین آزاد نے میر کی دوسری بہت سی خصوصیات کے ساتھ اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ میر صرف بہتر نشتر کے شاعر ہیں۔ انھوں نے میر کی زبان، فصاحت وصفائی بلاغت اور سادگی کے ساتھ ایک بہت اہم بات کہی ہے کہ (میر نے) گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا۔

ان آراء کا اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ نقدِ میر کے سلسلے میں بہت کچھ فیصلے میر کے ہم عصر اور ان کے بعد کے تذکرہ نگار کر چکے تھے۔ یہ تذکرے بلاشبہ نقدِ میر کی سنگ بنیاد ہیں۔ اس لیے کہ گردیزی کے تذکرے (۱۷۵۳ء) سے اور عہد جدید تک میر کے کلام پر جو بھی تنقید کی گئی وہ تذکروں کی تنقید کی توسیع اور تشریح نظر آتی ہے۔ بعد کے لوگوں نے میر کی زبان ان کے محاورے ان کے روزمرہ کا ذکر کیا لیکن اس کے بارے میں آزاد نے صرف ایک جملے میں جو بات کہہ دی بعد کی تنقید سینکڑوں صفحات سیاہ

کرنے کے بعد بھی اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔اسی طرح میر کی فصاحت وبلاغت یا خاص طور پر مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کی بات آج کی تنقید میں ان باتوں پر خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے لیکن میر کے وہ تذکرہ نگار جنھیں نقاد کی حیثیت سے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے وہ آج سے ڈیڑھ دوسو سال پہلے میر کی ان صفات کا ذکر کر چکے تھے۔

یہاں پر نہ تو میر کی تنقید کا موازنہ ومقابلہ مقصود ہے اور نہ کسی کو کمتر یا بہتر قرار دینے کی کوشش۔اس بحث کا مقصد صرف اتنا ہے کہ نقدِ میر یا میر تنقید کا عہد بہ عہد کس طرح ارتقاء ہوا اور کب میر کو کیا اہمیت حاصل رہی اس کا اندازہ کیا جاسکے۔

نقدِ میر کا پہلا دور جو اردو تذکرے سے متعلق ہے ہمارے سامنے ہے۔اور اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ میر ہمارے شعراء میں پہلے شاعر ہیں جن کے کلام کی تفہیم وتنقید کا کام خود ان کے عہد میں شروع ہوا اور ان کے عہد کے بعد جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس میں ترقی ہوتی گئی ایک طرح سے ہر آنے والا نیا عہد میر تفہیم وتنقید کے نئے گوشے لے کر سامنے آیا۔

حواشی

1. نثار احمد فاروقی، میر کی آپ بیتی، انجمن ترقی اردو ہند صفحہ ۳۵ سنہ اشاعت ۱۹۹۶ء
2. سیدہ جعفر، تاریخ ادب اردو (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک) جلد اول صفحہ ۵۲، سنہ اشاعت ۲۰۰۲ء
3. بحوالہ ''نقوش'' میر تقی میر نمبر شمارہ ۱۲۵۔ میر تذکرہ نویسوں کی نظر میں، ص ۱۸۷ ادارہ فروغ اردو، لاہور اکتوبر ۱۹۸۷ء
4. نثار احمد فاروقی، میر کی آپ بیتی ص ۳۵، انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۶ء
5. میر تقی میر نکات الشعراء ص ۱۴۷ مرتبہ محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء
6. میر تقی میر۔ نکات الشعرا، مترجم مصطفیٰ کمال قاظمی۔ ص۔ ۹۸۔ ۱۹۷۔ سرفراز پریس، نادان محل روڈ، لکھنؤ۔ ۱۹۶۲ء
7. علی الحسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، ص ۱۴، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۹۵ء
8. علی الحسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، ص ۳۰، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۹۵ء
9. ڈاکٹر شارب ردولی، جدید تنقید اصول ونظریات، ص ۱۵۲، یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۴ء

۱۰۔ علی الحسینی گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، ص ۱۵۷، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، اتر پردیش اردو اکادمی۔ ۱۹۹۵ء

۱۱۔ قیام الدین قائم چاندپوری، مخزنِ نکات ص ۱۴۸ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء

۱۲۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے۔ ص۔ ۲۹۱، نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ بار اوّل۔ جون۔ ۱۹۷۶ء

۱۳۔ لچھمی نرائن شفیقؔ، چمنستان شعرا۔ ص ۶۲۔ ۲۶۱۔ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

۱۴۔ قدرت اللہ شوقؔ، طبقات الشعراء۔ ص۔ ۲۰۶۔ مرتبہ نثار احمد فاروقی مجلس ترقی ادب لاہور

۱۵۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی، میر تنقید اور تنقیدی رویے۔ ص۔ ۸۷۔ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۱۶۔ میر حسن، تذکرۂ شعرائے اردو۔ ص۔ ۱۵۹۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵ء

۱۷۔ میر غلام حسین، تذکرۂ شورش ۱۹۰ (منقول از دو تذکرے مرتبہ کلیم الدین احمد جلد دوم) مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ۔ ۱۹۵۹۔ ۱۹۶۲ء

۱۸۔ ابوالحسن امر اللہ الہٰ آبادی، تذکرہ مسرت افزا۔ ص۔ ۲۰۰۔ ۱۹۹۔ مرتبہ قاضی عبدالودود شمولہ معاصر، پٹنہ

۱۹۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے۔ ص ۵۱۶۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ بار اوّل۔ جون ۱۹۷۶ء

۲۰۔ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی، گلشنِ سخن۔ ص ۲۰۵۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۵ء

۲۱۔ علی ابراہیم خلیل۔ گلزار ابراہیم۔ ص۔ ۲۳۔ مقدمہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۳۴ء

۲۲۔ بحوالہ ڈاکٹر حنیف نقوی۔ شعرائے اردو کے تذکرے ص۔ ۵۰۱۔ ۵۰۰۔ نسیم بک ڈپو۔ بار اوّل ۱۹۷۶ء

۲۳۔ ڈاکٹر حنیف نقوی۔ شعرائے اردو کے تذکرے ص۔ ۵۰۸

۲۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ شعرائے اردو کے تذکرے ص۔ ۷۷۔ ۷۶۔ مکتبہ جدید لاہور۔ ۱۹۵۲ء

۲۵۔ مرزا علی لطف۔ گلشنِ ہند۔ ص۔ ۵۳۔ ۱۵۲۔ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ء

۲۶۔ غلام ہمدانی مصحفی، عقدِ ثریا۔ ص۔ ۵۴۔ ۵۳۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد ۱۹۳۳ء

۲۷۔ غلام ہمدانی مصحفی، تذکرہ ہندی۔ ص۔ ۲۰۴۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ۱۹۳۳ء

۲۸۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے ص۔ ۱۰ے نسیم بک ڈپو لکھنؤ بار اوّل ۱۹۷۶ء

۲۹۔ خوب چند ذکاء۔ عیار الشعراء۔ ص۔ ۲۱۹۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔

۳۰۔ شیخ وجیہہ الدین۔ تذکرہ عشقی۔ ص۔ ۱۹۱۔ منقول از دو تذکرے۔ کلیم الدین احمد۔ مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ۔ ۱۹۵۹۔ ۱۹۶۳ء

۳۱۔ میر محمد خاں سرور۔ عمدۂ منتخبہ۔ ص ۵۴۔ ۵۵۳۔ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ بمبئی

۳۲۔ شاہ محمد کمال۔ مجمع الانتخاب۔ ص ۳۱۔ ۱۳۰۔ بحوالہ تین تذکرے مرتبہ نثار احمد فاروقی مکتبہ برہان اردو بازار دہلی۔

۳۳۔ میر قدرت اللہ قاسم۔ مجموعہ نغز۔ ص۔ ۳۱۔ ۲۲۹۔ مرتبہ محمود شیروانی۔ نیشنل اکادمی، انصاری مارکیٹ، دریا گنج ۱۹۳۳ء

۳۴ مولوی غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی۔ طبقات سخن۔ ص ۳۷۔ (منقول از نسخۂ کتب خانہ گاندھی فیض عام کالج شاہجہاں پور یو پی)
۳۵ مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ تذکرۂ آزردہ۔ مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۴ء
۳۶ لالہ سری رام۔ خمخانۂ جاوید۔ ص۔ ۵۵۔ مطبع منشی نول کشور، لاہور۔ ۱۹۰۸ء
۳۷ مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ تذکرۂ آزردہ۔ ۔ ص۔ ۱۳۔ ۱۲۔ مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو۔ انجمن ترقی پریس کراچی پاکستان ۱۹۷۴ء
۳۸ مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ تذکرۂ آزردہ۔ ص۔ ۱۶۔ ۱۵۔ مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۴ء
۳۹ بینی نرائن۔ دیوان جہاں۔ ص۔ ۲۱۵۔ مرتبہ کلیم الدین احمد۔ مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء
۴۰ بینی نرائن۔ دیوان جہاں۔ ص۔ ۲۱۵۔ مرتبہ کلیم الدین احمد۔ مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء
۴۱ بحوالہ ڈاکٹر حنیف نقوی۔ شعرائے اردو کے تذکرے۔ ص۔ ۶۷۶۔ نسیم بک ڈپو لکھنو بار اوّل جون ۱۹۷۶
۴۲ بحوالہ ڈاکٹر حنیف نقوی۔ شعرائے اردو کے تذکرے۔ ص۔ ۶۷۲۔ (ماخوذ از مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۱۷۲)
۴۳ احمد علی خاں یکتاؔ۔ دستور الفصاحت۔ ص۔ ۲۶۔ ۲۲۔ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی مطبوعہ رام پور۔ ۱۹۴۳
۴۴ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ۔ گلشنِ بے خار۔ صفحہ ۲۱۰۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
۴۵ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ۔ گلشنِ بے خار۔ صفحہ ۱۰۰۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ
۴۶ فرمان فتح پوری۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر۔ ص ۔ ۲۰۱۔ نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۴ء
۴۷ فرمان فتح پوری۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر۔ ص ۔ ۲۰۱۔ نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۴ء
۴۸ مولوی کریم الدین طبقات الشعرائے ہند صفحہ۔ ۱۱۶۔ ۱۱۵۔ مطبوعہ دلّی۔ بحوالہ میرؔ جلد اوّل۔ ص۔ ۳۵۔ مرتب ظل عباس عباسی۔ اگست۔ ۱۹۸۳ء
۴۹ محمد قدرت اللہ گوپاموی۔ نتائج الافکار۔ ص۔ ۵۲۔ تلخیص و ترجمہ سید شاہ عطاالرحمٰن عطا کاکوری ۱۹۶۸ء
۵۰ منشی کریم الدین گلدستۂ نازنیناں۔ ص۔ ۴۴۔ مرتبہ ڈاکٹر احمر لاری اکتوبر ۱۹۷۲ء
۵۱ سعادت خاں ناصر لکھنوی۔ خوش معرکۂ زیبا۔ ص ۲۶۔ قلمی (بانکی پور پٹنہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔) بحوالہ فرمان فتح پوری تذکروں کا تذکرہ نمبر صفحہ ۱۸۹۔
۵۲ احمد حسین سحر تذکرۂ بہار بے خزاں مقدمہ ڈاکٹر نعیم احمد۔ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۸ء
۵۳ احمد حسین سحر تذکرۂ بہار بے خزاں مقدمہ ڈاکٹر نعیم احمد۔ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۸ء
۵۴ احمد حسین سحر تذکرۂ بہار بے خزاں۔ ص۔ ۱۰۰۔ ۹۹۔ ترتیب ڈاکٹر نعیم احمد۔ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۸ء
۵۵ حکیم قطب الدین باطن۔ گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب۔ ص۔ ۲۴۷۔ ۲۳۶۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

۵۶۔ سید محسن علی محسن موسوی۔ سراپا سخن۔ نقول از تلخیص تذکرہ سراپا سخن مرتبہ ڈاکٹر سلیمان حسین۔ ص۔ ۱۸۹

۵۷۔ نصر اللہ خاں خویشگی۔ گلشن ہمیشہ بہار۔ ص۔ ۳۰۶۔ ماخوذ از نقوش۔ میر نمبر۔ ۱۹۸۷ء

۵۸۔ عبد الغفور خاں نساخ سخن شعراء۔ ۴۷۹۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۵۹۔ فدا علی عیش شعلۂ جوالہ۔ ص۔ ۳۷۷۔ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ

۶۰۔ سید علی حسن بزم سخن ص۔ ۱۵۱۔ بحوالہ نقوش میر نمبر ۱۹۸۰ء

۶۱۔ محمد حسین آزاد۔ آب حیات مطبوعہ ۱۹۰۷ کے سرورق کا عکس

۶۲۔ محمد حسین آزاد۔ آب حیات ص۔ ۱۹۵۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۶۳۔ محمد حسین آزاد۔ آب حیات ص۔ ۱۹۸۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۶۴۔ محمد حسین آزاد۔ آب حیات ص۔ ۲۰۳۔ ۲۰۲۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۶۵۔ مولانا حکیم سید عبد الحی۔ گلِ رعنا ص۔ ۱۵۹

۶۶۔ میر تقی میر۔ نکات الشعراء۔ ص۔ ۹۱۔ مرتبہ محمود الہی۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۶۷۔ سید حکیم عبد الحی۔ گلِ رعنا۔ صفحہ ۱۶۳۔ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ ۱۹۲۴ء

۶۸۔ شیر علی خاں سرخوش۔ اعجاز سخن۔ صفحہ۔ ۱۳۰۔ سلسلۂ ستم ظریف بک ڈپو لاہور

۶۹۔ شیر علی خاں سرخوش۔ اعجاز سخن۔ صفحہ۔ ۱۴۲۔ سلسلۂ ستم ظریف بک ڈپو لاہور

۷۰۔ مرتبہ مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی۔ جواہر سخن۔ صفحہ (الف) ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد ۱۹۳۳ء

۷۱۔ مرتبہ مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی۔ جواہر سخن۔ صفحہ (ف) ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد ۱۹۳۳ء

۷۲۔ میر تقی میر۔ نکات الشعراء۔ ص ۱۹۷۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۷۳۔ مسعود حسین خاں "مصحفی نقاد اور شاعر مشمولہ اردو زبان اور ادب" ص۔ ۹۶ تا ۱۰۸ بحوالہ ڈاکٹر حنیف نقوی۔ شعرائے اُردو کے تذکرے۔ ص۔ ۸۷۷۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۶ء

۷۴۔ کلیم الدین احمد۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔ ص۔ ۳۱۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ ۱۹۵۵ء

۷۵۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ اردو تنقید کا ارتقاء۔ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۱ء

۷۶۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اردو تنقید اصول و نظریات۔ ص۔ ۱۵۶۔ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۹۴ء

۷۷۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ اُردو تنقید کا ارتقاء ۱۱۶۔ ۱۱۸۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ ۱۹۵۱

۷۸۔ سید محمد عبد اللہ۔ شعرائے اُردو کے تذکرے۔ ص۔ ۱۰۹۔ مکتبہ جدید لاہور۔ ۱۹۵۲ء

۷۹۔ سید محمد عبد اللہ۔ شعرائے اُردو کے تذکرے۔ ص۔ ۱۲۹۔ مکتبہ جدید لاہور۔ ۱۹۵۲ء

۸۰۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ جدید اُردو تنقید اصول و نظریات۔ ص ۱۵۷۔ ناردرن آفیسٹ پریس لکھنؤ۔ ۲۰۰۲ء

باب دوم

جدید تنقید اور نقدِ میرؔ

حالیؔ، شبلیؔ، امداد امام اثرؔ، مولوی عبدالحق، رسالہ نیرنگ (میرؔ نمبر)
مسعود حسن رضوی ادیبؔ، مسعود الرحمٰن خاں ندوی، سر شاہ سلیمان
عبدالمنان بیدلؔ عظیم آبادی اور صفدر آہؔ کے حوالے سے

میرؔ کی شاعری اور شخصیت پر تنقید کا آغاز تذکروں سے ہوا مگر تذکروں میں کلامِ میرؔ پر جو رائیں ملتی ہیں وہ بہت مختصر ہیں۔ تذکروں کا یہ سلسلہ ۱۷۵۲۔۱۷۵۳ سے لے کر ۱۹۲۱ء عبدالحئی کے ''گلِ رعنا'' تک قائم رہا۔ اس درمیان ۱۸۹۳ء میں حالیؔ کی ''مقدمہ شعروشاعری'' کے زیر اثر مغربی تنقید کے تصورات اردو ادب میں داخل ہوئے۔ مقدمہ شعروشاعری کے بعد امداد امام اثر کی کتاب کاشف الحقائق ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی اس میں بھی مغربی تصورات ادب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان ناقدین کے زیر اثر تنقید میرؔ ایک نئی راہ پر گامزن ہوئی۔ حالانکہ اسی دور کے ایک اہم نقاد شبلیؔ نے میرؔ کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ حالیؔ اور امداد امام اثر نے بھی میرؔ کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں کیا ہے البتہ ان تینوں ناقدین کی اہمیت اس بنا پر زیادہ ہے کہ ان کی تحریروں نے عمومی تنقیدی تصورات کو متاثر کیا جس کا اثر مطالعہ میرؔ اور تنقید میرؔ پر تادیر قائم رہا۔

حالیؔ کی ''مقدمہ شعروشاعری'' امداد امام اثر کی ''کاشف الحقائق'' اور شبلیؔ کی ''شعر العجم'' ۱۹۲۲ء اُردو تنقید میں بے حد اہم کتابیں ہیں جنھیں اردو اصولِ نقد کے سلسلے میں بنیادی قرار دیا جاسکتا ہے۔ نقدِ میرؔ میں ان کتابوں کی بہت اہمیت نہیں ہے لیکن اس کا ذکر آچکا ہے کہ ان کتابوں نے تفہیم میرؔ اور تنقید میرؔ کو متاثر کیا۔ مولوی عبدالحق کے مقدمۂ ذکرِ میرؔ (۱۹۲۶ء) انتخاب کلام میرؔ ۱۹۲۱ء اور ''نکات الشعراء'' (۱۹۳۵ء) کے مقدمات میں یا نیرنگ کے میرؔ نمبر (۱۹۲۸ء) میں حالیؔ اور شبلیؔ کی تنقید کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

حالیؔ (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) خود مقدمہ شعروشاعری میں عملی تنقید کے تحت غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مختلف شعراء کے کلام سے مثالیں پیش کرتے ہیں، مثلاً حالیؔ نیچرل شاعری کی تعریف میں لکھتے ہیں:

> ''شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دُنیا
> میں ہوئی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے
> خلاف ہوگا وہ اَن نیچرل سمجھا جائے گا''۔[1]

نیچرل شاعری کی اس تعریف کے بعد میرؔ کے مندرجہ ذیل اشعار کا حالیؔ نے حوالہ دیا ہے۔ ؎

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دُعا کر میرؔ
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے
ہر آن ہم کو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے
کیا آ گیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ
وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

بقول حالیؔ میر فرطِ محبت و دل بستگی کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آئے

حالیؔ میرؔ کے کلام میں سادگی، اصلیت اور جوش کی تلاش کرتے ہیں اور جب یہ تینوں خوبیاں انھیں میرؔ کے کلام میں مل جاتی ہیں تو وہ اس کا اعتراف بھی بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ میر کے ایک شعر ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایسے چیتھڑے مضمون کو میرؔ نے باوجود غایت درجہ کی سادگی کے ایسے اچھوتے، نرالے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آ سکتا۔ اس اسلوب کی بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے، نیچرل ہے اور باوجود اس کے بالکل انوکھا ہے"۔ ۲

مندرجہ بالا اقتباس حالیؔ کی تنقیدی صلاحیت کی دلیل ہے کہ وہ کس طرح ایلیٹ کے اس خیال کے نزدیک آ جاتے ہیں کہ ہر بڑا شاعر اپنے سے پہلے کی شاعری میں کچھ

اضافہ کرتا ہے۔حالی میر کے مندرجہ ذیل شعر کے متعلق لکھتے ہیں ۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

''مگر ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں اور اس جوش کا پورا اندازہ کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو صاحبِ ذوق ہیں اور جن پر بے محل ہزاروں آہیں اور نالے اتنا اثر نہیں کرتے جتنا کہ برمحل کسی کا ایک ٹھنڈا سانس بھرنا''۔ ۳

حالؔی نے میر کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال نہیں کیا ہے لیکن اختصار سے بھی انھوں نے جو کچھ لکھا وہ توجہ کا مستحق ہے۔حالؔی سے قبل اُردو تذکروں میں میر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔خاص طور پر آزاد نے میر کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ان کے کلام پر تنقیدی رائے بھی دی ہے لیکن حالؔی کے ذریعہ میر کا اس قدر مختصر ذکر قابلِ تعجب ہے۔اس مختصر ذکر میں بھی حالؔی محض ان کے اسلوب بیان کی تعریف کر کے بس کرتے ہیں۔البتہ یہ ضرور ہے کہ حالؔی سے قبل میر کے بارے میں کسی ادیب نے میر کی شاعری کے نیچرل ہونے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

تقریباً اسی دور میں امداد امام اثر نے ''کاشف الحقائق'' میں میر کا مختصر ذکر کیا ہے۔امداد امام اثر نے شبلی اور حالؔی دونوں سے استفادہ کیا ہے اس لیے ان کے یہاں شعراء کے مطالعے میں مغرب کے اثرات کے ساتھ فن اور جمالیات کی طرف بھی توجہ ملتی ہے۔امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں اہم شعراء کا حوالہ بھی دیا ہے۔وہ نقدِ میر میں کوئی اضافہ نہیں کرتے صرف محمد حسین آزاد کی طرح میر کی شاعری کو وارداتِ قلبیہ کا بیان قرار دیتے ہیں:

''میر صاحب غزل سرائی میں کبھی وارداتِ قلبیہ، امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں۔اور ان کے وہی اشعار زیادہ دلآویز معلوم ہوتے ہیں۔میر صاحب کی غزل سرائی، تمام تر داخلی شاعری کا پہلو رکھتی ہے، تب ہی ان کے کلام میں سوز وگداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی وغیرہ کی

کیفیتیں بدرجۂ کثیر پائی جاتی ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ وہ کیفیتیں ہیں
جودل کو بھاتی ہیں''۔ ؎[۲]

امداد امام اثرؔ کے خیال میں کلام میرؔ کی اہم خصوصیات داخلیت، سوز وگداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی، شوخی وغیرہ ہیں، ان تمام کیفیات کا تعلق دل سے ہے۔ اس لیے انھیں میرؔ کا کلام واردات قلبیہ کا انعکاس نظر آتا ہے۔

ایک طرف جہاں حالیؔ اور امداد امام اثرؔ نے میرؔ کا مختصر ذکر کیا وہیں دوسری طرف ''موازنہ انیس ودبیر اور''شعرالعجم'' جیسی گرانقدر تنقیدی کتابوں کے مصنف شبلیؔ نے میرؔ کو نظر انداز کردیا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناقدین میرؔ کو زیادہ قابلِ اعتنا نہیں گردانتے۔اس کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟ حالات کی تبدیلی یا زندگی میں فکری سطح پر نئی تگ ودو یا کچھ اور بہر حال یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ میرؔ سے ناواقفیت کی بنا پر اس عہد میں میرؔ کا چرچا نہیں رہا۔اس لیے کہ میرؔ کا کلام یا ان کے دواوین عنقاء نہیں تھے۔ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شبلیؔ نے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔بہر حال ان اسباب پر غور کیا جانا چاہئے کہ یہ عہد میرؔ کے ذکر سے خالی کیوں ہے؟ جب کہ ماضی میں تذکروں کی ایک طویل روایت موجود ہے جن میں تفصیل کے ساتھ میرؔ کی شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔شبلیؔ کے یہاں اس طرح کی کوئی تحریر نہیں ملتی، جسے نقدِ میرؔ کی روایت سے جوڑا جاسکے۔امداد امام اثرؔ کے بعد ۱۹۳۶ء تک میرؔ پر جو قابلِ ذکر کام ہوا وہ ''اشعارِ میرؔ''، عبدالحق کے مقدمات اور رسالہ نیرنگ کا ''میرؔ نمبر'' ہے۔بابائے اُردو نے آبِ حیات کے بعد اپنے مقدمات میں میرؔ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ انھیں کی فرمائش پر ۱۹۲۲ء میں حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے نکات الشعراء پر مقدمہ لکھا جسے انجمن ترقی اردو ہند سے شائع کیا گیا۔عبدالحق کی اس بالواسطہ سعی سے مولانا محمد حسین آزاد کے میرؔ کے متعلق قائم کردہ بہت سے مفروضات سے پردہ اٹھا۔مقدمات کے ساتھ ساتھ جولائی ۱۹۲۸ء میں نیرنگ کا میرؔ نمبر بھی شائع ہوا۔عبدالحق نے رسالہ اُردو ۱۹۲۶ء میں ذکرِ میرؔ کا خلاصہ شائع کیا۔انتخاب کلام میرؔ ان کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں اور نکات الشعراء ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

نقدِ میرؔ کے سلسلے میں ''انتخاب کلام میرؔ'' پر لکھا گیا مولوی عبدالحق

(۲۰ر اپریل ۱۸۷۰ء۔ ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء) کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔عبدالحق نے ''انتخاب کلام میر ۱۹۲۱ء میں اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا اور یہ اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ حالانکہ مولوی عبدالحق نے میرؔ پر کوئی تفصیلی کتاب نہیں لکھی لیکن انھوں نے نکات الشعراء اور ذکر میرؔ کی بازیافت کر کے میر کی شخصیت اور شاعری کی تفہیم کا ایک نیا باب شروع کیا۔عبدالحق کی ناقدانہ اہمیت کا اعتراف پروفیسر عبدالمغنی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> عبدالحق، شبلیؔ و حالیؔ کی بہترین تنقیدی روایات کے نہ صرف وارث بلکہ اس کی کچھ توسیع کرنے والے بھی ہیں۔یہی چیز انھیں جدید اُردو تنقید کے بانیوں اور ان کے بعد آنے والے جدید تر اُردو ناقدین کے درمیان ارتقاء کی ایک اہم کڑی بنادیتی ہے''۔ ۵

عبدالحق ادب کے مطالعہ میں فنکار کی شخصیت، اس کے ماحول اور اس کے عہد کو بنیاد بناتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ میرؔ کی شاعری کا سلسلہ وہ شخصیت اور عہد کے اثرات سے جوڑتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''جب ہم شعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائص اور عادات پر نظر ڈالیں اور اس کے بعد۔۔۔۔۔۔اس کے عہد کے واقعات و حالات وتغیرات وانقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں، جہاں تک ان کا تعلق اس کی شاعری سے ہے کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔'' ۶

مولوی عبدالحق کے مطابق کسی بھی شاعر کے کلام پر اس کے حالاتِ زندگی اور اس کے عہد کے واقعات ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔فنکار کی شخصیت اور عہد کا اس کے کلام سے گہرا تعلق ہے۔شاعر کے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی میلانات کا اثر بھی اس

کی تخلیق پر ہوتا ہے۔ میرؔ کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے عبدالحق نے میرؔ کی شخصیت اوران کے عہد کے میلانات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے وہ میرؔ کی شاعری کا رشتہ ان کی شخصیت اور عہد سے جوڑتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''عبدالحق کا مطالعۂ میر زیادہ متوازن اور بھر پور ہے اس لیے کہ یہ ایک نسبتاً قدیم شاعر کا مطالعہ ہے، جس کی کچھ روایات بن چکی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے میرؔ کے سوانح اور احوال کی تفتیش کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح میرؔ کا کلام درحقیقت ان کی سیرت کا آئینہ ہے۔ یا ان کے کردار کی زیبائی ان کے کلام کی رعنائی کا باعث ہے۔ اسے ایک تاریخی یا شخصی مطالعہ بھی کہا جاسکتا ہے مگر یہ حقیقی بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ناقد نے شاعر کی زندگی سے اعتناء کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے فن کا بھی معروضی تجزیہ کیا ہے۔''[۷]

میر کی شاعری پر شخصیت وعہد کی نشاندہی کرتے ہوئے عبدالحق اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> میر صاحب کی زندگی مصائب وآلام کا سلسلہ تھی جس کا تار بچپن سے لے کر لکھنؤ جانے تک کبھی نہ ٹوٹا۔۔۔۔ ان (میر تقی میر) کے کلام میں ایسا درد بھرا ہوا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے جو لطف سے خالی نہیں۔۔۔۔۔۔ شگفتگی اور زندہ دلی میرؔ صاحب کی تقدیر میں نہ تھی وہ سراپا یاس و حرماں تھے اور یہی حال ان کے کلام کا ہے گویا ان کا کلام ان کی طبیعت وسیرت کی ہو بہو تصویر ہے۔۔۔
>
> ان کے اشعار سوز وگداز اور درد کی تصویریں ہیں، زبان سے نکلتے ہی دل میں بیٹھ جاتے ہیں''۔ [۸]

اس وقت کی دلّی کا ذکر کرتے ہوئے عبدالحق نے لکھا ہے:

''اس وقت دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی تھی وہ
ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی مگر ہر طرف
سے آفات کا نشانہ تھی۔اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو
نہیں پر بیواؤں سے کہیں زیادہ دکھیاری ہے۔'' ۹

مولوی عبدالحق نے میرؔ کے عہد کے سیاسی حالات، ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے سبب ان کی شاعری میں درد و داغ، سوز و تڑپ، مایوسی و اداسی کا سراغ لگانے کی جستجو کی ہے۔ مولوی عبدالحق میرؔ کی شاعری اور زندگی کو ایک دوسرے کا عکاس قرار دیتے ہیں۔ وہ بار بار میرؔ کے کلام میں درد، یاس و حرماں، اور سوز و گداز کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں میرؔ کی تقدیر میں شگفتگی اور زندہ دلی تھی ہی نہیں۔ ان کے اشعار درد کی تصویر ہیں۔ عبدالحق سے پہلے تذکروں، امداد امام اثر اور نیرنگ کے میرؔ نمبر کا حوالہ آچکا ہے۔ میرؔ کے یہاں درد و غم کا ذکر تو بعض لوگوں نے ضرور کیا ہے لیکن عبدالحق کی طرح میرؔ کو صرف یاس و حرماں کا شاعر کسی نے نہیں قرار دیا۔ عبدالحق پہلے ناقد ہیں جنھوں نے میرؔ کے پورے کلام اور شخصیت کو یاسیت کی چادر سے ڈھک دیا اور یہیں سے میرؔ کو قنوطی ثابت کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ عبدالحق کے زمانے میں میرؔ کا کلیات یا دواوین عام طور پر دستیاب نہیں تھے اور اگر ملتے بھی تھے تو عام قاری کی پہنچ سے باہر تھے۔ عبدالحق نے میرؔ کے کلام کا ایک مختصر انتخاب طویل مقدمے کے ساتھ شائع کر کے یہ خدمت تو بہت بڑی انجام دی کہ میرؔ کو ہر پڑھنے والے تک پہنچا دیا اور گھر گھر میں میرؔ کا چرچا ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کے ساتھ ان کے مقدمے کا اثر بھی لوگوں کے ذہنوں پر ہوا، جس نے میرؔ کو صرف درد و غم کے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا۔ عبدالحق کے اس تصور کا اثر ان کے انتخاب پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے انتخاب میں بیشتر اشعار یاس و حرماں نصیبی کی کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔ اس کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہوگا کہ عبدالحق کی تنقید میر سے میرؔ کے یاس پرست ہونے کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہاں پر اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ مولوی عبدالحق سے پہلے محمد حسین آزادؔ آبِ حیات میں کچھ اسی طرح کی باتیں لکھ چکے تھے:

میر صاحب کو شگفتگی یا بہارِ عیش و نشاط، یا کامیابی وصال کا

> لطف کبھی نصیب نہ ہوا، وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اُس کا دکھڑا سناتے چلے گئے، جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں کیونکہ ایسے مضامین اور شعراء کے لیے خیالی تھے، ان کے حالی تھے۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی، زار نالی، حسرت، مایوسی، ہجر کے لباس میں خرچ ہوئے۔ ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا نہیں حسرت واندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے بس جو دل پر گزرتے تھے وہی زبان سے کہہ دیتے تھے کہ سننے والوں کے لیے نشتر کا کام کر جاتے تھے۔[۱۰]

یہ ممکن ہے کہ عبدالحق، آزاد کی رائے سے متاثر رہے ہوں لیکن آبِ حیات کا اثر عام لوگوں پر اتنا نہیں ہوا جتنا عبدالحق کے ''انتخاب کلام میرؔ'' کا ہوا۔ دوسرے آزاد کا زور میر کی یاسیت سے زیادہ اس بات پر ہے کہ وہ وہی کچھ بیان کرتے رہے جو ان پر گزرتی تھی۔ اور عبدالحق باقاعدہ ان کی فکر کو یاس انگیز ثابت کرتے ہیں۔ اس طرح انتخاب کلام میرؔ کی اشاعت کے بعد اس زمانے کے بیشتر لکھنے والوں نے میرؔ کو قنوطی اور یاسیت کا امام ثابت کرنے کی کوشش کی۔

شاعری پر شخصیت اور عہد کے اثرات کے ساتھ ساتھ عبدالحق نے میرؔ کے اسلوب کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرؔ کی زبان میں تازگی، ادائے مطلب میں شگفتگی اور خیال میں بلندی و وحدت ملتی ہے۔ غایت درجہ سلاست و سادگی، سوز و گداز اور تخیل میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ میرؔ کے شعر چپکے چپکے ہمارے دل میں خود بخود اثر کرتے چلے جاتے ہیں۔''[۱۱]

مگر مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ میرؔ کی شاعری کا ان کے بعد کے شعراء پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ لکھتے ہیں:

''لیکن حیرت ہے کہ ان کے آخر زمانے نیز مابعد کی شاعری پر میرؔ کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ لکھنؤ جس کلام کی اس قدر دل سے داد دیتے تھے اور جسے پڑھ پڑھ کر جھومتے اور سر دھنتے تھے اس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوئے اور اس نے ایک جداگانہ روش اختیار کی جسے میرؔ کے انداز سے کچھ نسبت نہیں۔'' ۱۲

عبدالحق اس بات کی تائید میں حالؔی کی رائے بھی پیش کرتے ہیں:

''شجاع الدولہ کے زمانہ سے سعادت علی خاں کے وقت تک اردو کے نامور شعراء کا جمگھٹا لکھنؤ ہی میں رہا۔ یہاں تک کہ میرؔ، سوداؔ سوزؔ جرأتؔ، مصحفؔی، اور انشاؔء وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے مگر متاخرین کی غزل میں ان کے طرزِ بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔'' ۱۳

مگر مولوی عبدالحق یا حالی کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ میرؔ کا اثر بعد کے زمانے میں زائل ہوگیا۔ لکھنؤ دبستان کے شعراء مثلاً انشاؔء، جرأتؔ، مصحفؔی، اور ناسخؔ، کے یہاں میرؔ کی داخلیت کے برعکس خارجیت پر زیادہ زور ملتا ہے۔ لیکن دبستان لکھنؤ کے ہی دوسرے اہم اور مقبول شاعر آتشؔ کے یہاں میر کی اہم خصوصیات داخلیت اور واردات قلبیہ کا اظہار بکثرت ہوا ہے۔ جس کی نشاندہی امداد اثر نے ''کاشف الحقائق'' میں کی ہے۔ ان کی درج ذیل غزل۔

تار تار پیرہن میں بس رہی ہے بوئے دوست\
مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست\
اس بلائے جاں سے آتشؔ دیکھئے کیونکر نبھے\
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

یہ پوری غزل دبستان میرؔ کی نمائندگی کرتی ہے۔ آتشؔ کے علاوہ اس دور کے بعد آنے والے شعراء کے یہاں بھی میرؔ کا اثر نمایاں ہے۔

ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''لکھنوی شاعری پر اس دور میں میرؔ کا اثر زیادہ غالب نظر آتا ہے۔عزیزؔ، ثاقبؔ اور اس دور کے دوسرے شعراء میرؔ کے زیرِ اثر نظر آتے ہیں۔ان کے کلام میں حسرت و یاس اور غم کا پہلو زیادہ اُجاگر نظر آتا ہے۔اس دور میں عزیزؔ اور ثاقبؔ نے لکھنؤ کی زبان کی صفائی، شستگی اور پاکیزگی دلّی کی داخلیت اور شاعرانہ لطافتوں کو ملا کر غزل کو ایک نیا رنگ دیا۔'' ۱۴

پروفیسر شارب ردولوی مزید لکھتے ہیں۔

''اثرؔ لکھنوی عزیزؔ کے شاگرد تھے۔عزیزؔ لکھنوی میرؔ سے متاثر لوگوں میں سے تھے۔اس لیے اثرؔ کی غزلوں میں بھی وہ رنگ نمایاں ہے۔اثرؔ اس دور میں لکھنؤ کی زبان اور تہذیب کے سب سے بڑے نمائندے ہیں۔لکھنؤ کی زبان، دلّی کی داخلیت اور میرؔ کا تاثر ان کے کلام میں یکجا نظر آتا ہے۔وہ میرؔ کے رنگ میں ایسا رچ بس گئے ہیں کہ ان کے بہت سے اشعار پر لہجے اور اندازِ بیان میں میرؔ کا شبہ ہوتا ہے۔عزیزؔ نے جس رنگ کی ابتدا کی تھی اثرؔ نے اس کو پورا کر دیا۔'' ۱۵

اصل میں یہ دور نقدِ میرؔ کے سلسلے میں اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس دور میں میرؔ اور میریات کا احیاء ہوا۔میرؔ کی شاعری کو دوبارہ زندگی ملی۔اس عہد میں عبدالحق کے مقدمات کے علاوہ جولائی ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے رسالہ ''نیرنگ'' کے میرؔ نمبر نے وہ فضا اور ماحول تیار کیا جس پر آگے چل کر نقدِ میرؔ کی مضبوط بنیاد پڑی۔

رسالہ ''نیرنگ'' کا میرؔ نمبر بابت ماہ جولائی ۱۹۲۸ء ریاست رام پور یوپی سے شائع ہوا۔یہ میرؔ پر باقاعدہ تصنیف تو نہیں مگر اس کے مضامین کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ میرؔ تنقید تذکروں سے نکل کر حالیؔ، شبلیؔ اور عبدالحق کے زیرِ اثر آگے بڑھی۔اس رسالے میں اس دور کے اہم مصنّفین کے ذریعہ کلامِ میرؔ پر تنقید و تبصرہ کیا گیا۔مضامین کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

(۱)	نیرنگستان	ایڈیٹر عزیز اللہ خاں عزیز
(۲)	میر کا فارسی کلام	ایڈیٹر عزیز اللہ خاں عزیز
(۳)	میر کا فارسی کلام	لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی
(۴)	میر تقی میر اوران کا کلام	مولانا سہا مجددی بی۔اے
(۵)	گلشنِ میر	جعفر علی خاں اثر بی۔اے
(۶)	میر کی عشقیہ مثنویاں	جناب مطلب حسین
(۷)	خیابانِ میر	جناب عشرت رحمانی رام پوری

مضامین کی اس فہرست میں یوں تو سبھی مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔مگر محمد عزیز اللہ خاں عزیز، مولانا سہا مجددی، عشرت رحمانی رام پوری، جعفر علی خاں خاں اثر کے مقالات، کلام میر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔

رسالہ نیرنگ کے ایڈیٹر عزیز اللہ خاں عزیز نے دیباچہ نیرنگستان میں جہاں تمام مصنفین کے مضامین پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے وہیں انھوں نے کلام میر پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔عزیز اللہ خاں عزیز، اثر اور موزونیت کو شاعری کا اہم حصّہ قرار دیتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر کے تحت تاثیر و موزونیت کو کلام میر کی خصوصیت بتاتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’کلام موزوں جو بے اثر ہو منطق کی اصطلاح میں شعر نہیں کہا جاسکتا۔اس لیے کامل شعرا اسے سمجھنا چاہئے جو عروض و منطق دونوں کی تعریف کا مصداق ہو۔اس صورت میں کلام موزوں، بااثر، کا نام شعر ہوگا۔موزونیت شعر کا جزو لاینفک ہے۔ جب شعر کے لیے بااثر ہونا ضروری اور لازمی ٹھہرا تو اس معیار پر جب تمام شعرائے ماضی و حال کو پرکھا جائے تو بلا خوف تردید میر تقی میر حقیقی شاعر اوران کا کلام موزوں، بااثر کہلانے کا مستحق ہے۔صاحبِ ذوق سلیم کو ان کے کلام کی خوبیوں کے مقابلے میں کسی دوسرے کلام کے استثناء کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ میر کا کلام من حیث المجموع اپنی مقبولیت، جامعیت اور اثر کے

ساتھ ہمیشہ مستثنیٰ رہے گا۔کلام شعری کی خصوصیات، اصلیت، صداقت جسے محاکات بھی کہتے ہیں۔ سادگی یا بیان کی صفائی، بلندی خیال، باریکی، جوش، روانی وسلاست، ایجاز واختصار اور جدّت ادا پر منحصر ہے۔ان تمام لفظی ومعنوی خوبیوں سے میر کا کلام آراستہ وپیراستہ نظر آتا ہے۔"۱۶؎

اس اقتباس میں عزیز، جہاں میر کی شاعری کی اہم خوبی تاثیر اور موزونیت ٹھہراتے ہیں۔وہیں کلام شعری کی خصوصیاتِ اصلیت، صداقت، محاکات، سادگی یا بیان کی صفائی اور جدّت ادا قرار دیتے ہیں۔میر کا کلام عزیز کے خیال میں تمام لفظی ومعنوی خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔اپنے ان خیالات کا اظہار کرنے کے بعد عزیز رامپوری ان تمام اصطلاحاتِ یعنی سادگی، اصلیت، جوش، محاکات، کی تعریف کرتے ہیں اور ان کے مطابق کلامِ میر سے مثالیں بھی دیتے ہیں۔مثلاً محاکات یا اصلیت اور سادگی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے مراد یہ ہے کہ شعر کا مضمون واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہو۔شاعر جس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے، اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ نفس الامر اور حقیقت میں بھی موجود ہو۔اور سر مو اصل سے متجاوز نہ ہو۔ بلکہ راستی اور حقیقت کی جھلک نمودار رہے۔سادگی یہ ہے کہ خیالات میں سنجیدگی اور صفائی ہو شعر میں تخیل کی بے اعتدالی اور مبالغے سے کام نہ لیا جائے۔ایسے باریک اور ادق مضامین نہ ہوں جن کی تفہیم عام طور پر دشوار ہو۔سلاست وسادگی ادا، لفظوں کی ترتیب میں روزمرہ، عام بول چال کے استعمال کا نام ہے یعنی ایسے لفظ استعمال کیے جائیں جن سے زبان اور کان آشنا ہوں۔ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مضمون کو روزمرہ میں ادا کرنا شعراء کا اصل کمال اور شاعری کا عمدہ جوہر ہے"۔ ۱۷؎

مندرجہ بالا اقتباسات میں عزیز نے میر کی شاعری میں راستی، حقیقت، سادگی، سنجیدگی کی تلاش کی ہے۔ ثبوت میں میر کے کلام سے مثالیں بھی دی ہیں، رعایت لفظی وحسن الفاظ کے متعلق مصنف لکھتے ہیں:

> ''اس صفت سے بلاغت میں فصاحت کی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ مضمون خواہ کتنا ہی نازک اور تخیل کتنی ہی ارفع اور بلند ہو لیکن اگر الفاظ کا تناسب اور رعایت لفظی نہیں ہے تو ایسے کلام میں تاثیر نہیں ہو سکتی۔ مضمون کے لیے الفاظ کا تناسب اور ان کی سجاوٹ ایسی چیز ہے کہ جس سے شعر سلیس اور صاف کہلاتا ہے۔ الفاظ باہمی کا تعلق خواہ برعایت خیال و معنی ہو خواہ برعایت الفاظ۔''[18]

نیرنگ میں شائع ہوا دوسرا مضمون عزیز لکھنوی کا تحریر کردہ ہے جس کا عنوان ''میر کا فارسی کلام'' ہے۔ تذکروں سے لے کر عبدالحق تک میر کی فارسی شاعری ونثر پر غالباً یہ پہلا تبصرہ ہے۔ اپنے مضمون کی ابتداء میں عزیز نے لکھا ہے:

> ''اس وقت اس مضمون میں میر صاحب کی فارسی مطمح نظر ہے باوجود یہ کہ اون کو مرزا غالب مرحوم کی طرح اپنی فارسی پر کوئی فخر نہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب فارسی نظم و نثر دونوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فارسی و عربی کے درسیات انھوں نے باقاعدہ پڑھے۔''[19]

میر کی فارسی کتابوں کی تعداد انھوں نے دو لکھی ہے یعنی نکات الشعرا اور ذکرِ میر۔ میر کے فارسی دیوان کا نسخہ بھی مصنف کو مل گیا جس کا خط بقول مصنف کے نہایت پاکیزہ اور میر کے عہد کا لکھا ہوا ہے۔ میر کے فارسی کلام پر عزیز اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''تخیلات وجذبات کے اعتبار سے بیشتر اشعار بلند تر ہیں اور ان کی طبیعت کا خاص رنگ، درد واثر قدم قدم پر نمایاں ہے۔''[20]

> ''ذکر میر دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلا کہ اکثر اشعار

اون کے حالات اور واقعات پر مبنی ہیں۔'' ۲۱

''بعض اشعار میں میر نے مصوری کی ہے اور محاکات کے بہترین نمونے دکھائے ہیں۔'' ۲۲

''میر صاحب کا دل قدرتاً درد کا مجسمہ تھا اون کے اشعار صرف دکھے ہوئے دلوں میں نشان پیدا کر سکتے ہیں۔ محفلِ سرور میں ان کی زبان کون سمجھے گا۔'' ۲۳

عزیز میر کے کلام میں درد اثر کا تعلق ان کی زندگی سے جوڑتے ہیں، ان کے خیال میں میرؔ کے اکثر اشعار ان کی زندگی کے حالات اور واقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں عزیز میرؔ کے فارسی کلام پر ان کی شخصیت کے پرتو کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی شاعری پر شخصیت اور عہد کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

عزیزؔ لکھنوی کا مضمون ''میرؔ کا فارسی کلام'' اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں میرؔ کی آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' کے خصوصی حوالے دیے ہیں اور ان کے منظوم فارسی کلام پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

رسالے ''نیرنگ'' میں عزیز اللہ خاں عزیزؔ اور عزیزؔ لکھنوی کے مضامین کے بعد تیسرا مضمون مولانا سہا مجددی کا ''میر تقی میرؔ اور ان کا کلام'' ہے اس مضمون میں سہا مجددی نے میرؔ کے مختصر حالات زندگی، علمی استعداد اخلاق و عادات، میرؔ کے عہد کی زبان، میرؔ کی شاعری کے مضامین کے علاوہ شعر اور غزل کی تعریف کرتے ہوئے کلام میر پر اظہار خیال کیا ہے۔ شعر کی تعریف کرتے ہوئے سہا مجددی تخیل اور محاکات کو شعر کے بنیادی اجزاء قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میرے خیال میں تخیل او رمحاکاۃ، شعر کے بنیادی اجزاء میں سے ہیں اور ان کی نزاکت و رفعت اور صحت و لطافت، شعر کی دلکشی کو بڑھانے والی چیزیں ہیں اور جس چیز کو بعض لوگ جوش کہتے ہیں وہ فی الحقیقت وہی انفعال اور تاثر ہے جو مشاہدہ کے بعد طبیعت میں پیدا ہوتا ہے اور واقعیت وہی صداقت ہے

جس کو صحتِ محاکاۃ کے الفاظ سے بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ پہلے
قول میں سادگی ایک زائد خصوصیت ہے مگر اس کا علاقہ دراصل
قواعد بیان وقواعد نحو یہ وغیرہ سے ہے کیونکہ سادگی کا مفہوم یہ ہے
کہ شعر سادہ الفاظ تراکیب اور بلا تعقیدات وغیرہ کے مانوس و
پسندیدہ الفاظ اور غیر معقد ترکیب سے ادا ہو جائے۔'' [۲۴]

اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ سہا مجددی شعر میں تاثیر وکیفیت، واقعیت، جوش، سادگی، صحت محاورہ، نزاکت ورفعت تخیل، اور سادگی کلام، پر زور دیتے ہیں۔ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ سہا یا نیرنگ کے دوسرے ناقدین کے یہاں تفہیم شعر کے وہی اصول اپنائے گئے ہیں جو حالیؔ اور شبلیؔ کے یہاں ملتے ہیں۔

سہا مجددی نے اپنے اس مضمون میں میرؔ کی غزلوں کو خاص طور سے موضوع بنایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''غزل کے مضامین مقررہ ہیں، اور وہ وہی ہیں جن کو
میں نے ''عنوان غزل'' کے تحت بیان کیا ہے یعنی حسن وعشق محاسن
اخلاق، مواعظ وعبرت اور تصوف، پس میر صاحب کی غزلوں کے
موضوعات بھی یہی مضامین ہیں۔'' [۲۵]

اپنے اس مضمون میں سہا مجددی نے جہاں غزل کے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہیں کلام میرؔ سے مثالیں دے کر ان موضوعات پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ کلام میر پر تذکروں سے لے کر نیرنگ کے میرؔ نمبر تک مختلف طرح سے تنقیدی رائیں دی گئیں مگر کسی نقاد نے کلام میرؔ کے موضوعات پر اتنی تفصیل سے اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ سہا مجددی غالباً پہلے ایسے ناقد ہیں جن کے مضمون میں میرؔ کی شاعری کے اہم موضوعات جیسے دنیا کی بے ثباتی، تصوف، دل کی ویرانی وبربادی، اخلاق وموعظت پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

سہا مجددی کے خیال میں ''اسلوب بیان اور رفعت تخیل ہی دو خصوصیتیں ہیں جو کسی شاعر کی افضلیت کی دلیل ہو سکتی ہیں۔ میرؔ کے متعلق سہا مجددی کا خیال ہے:

''یہاں یہ عرض کر دینا غالباً بے موقع نہ ہوگا کہ میر صاحب

> کے یہاں رفعت تخیل اگر مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ البتہ ان کا اسلوب بیان اس قدر خاص ہے کہ متقدمین و متاخرین کا تو ذکر ہی کیا اُردو شاعری کی تمام کائنات میں اس کی کوئی مثال ہی نہیں ملتی اور میر صاحب اپنے ''اسلوب بیان'' کے تنہا مالک ہیں۔ اوران کے ''اسلوب بیان'' کی اثر خیزی اور مقبولیت نے ان کو اقلیم سخن کا ایک بادشاہ تسلیم کرادیا ہے۔''۲۶

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلام میرؔ کی اہم خصوصیت اس کی اثر انگیزی اور ''اسلوب بیان'' ہے اوراسی خوبی نے میرؔ کو خدائے سخن بنادیا ہے سہا مجددی مزید لکھتے ہیں:

> ''میں نے جہاں تک غور کیا ہے میر کے اشعار میں انفعال کی خصوصیت اس درجہ کامل ہے کہ اس کے مقابلہ میں دوسری خصوصیتیں ناقابل اعتناء ہوگئی ہیں۔ پس اگر میرؔ صاحب کی شاعری کی خصوصیات دریافت کی جائیں، تو وہ صرف انفعال اور اسلوب بیان کی بے انتہا سادگی، قرار دیئے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ دونوں چیزیں تاثر کے لیے دارومدار ہیں۔ تاثر ہی کے اظہار سے اثر پیدا ہوتا ہے اور جب تاثر کا اظہار، صفائی اور سادگی کی خصوصیت بھی رکھتا ہو تو یہ شراب دوآتشہ ہو جاتی ہے۔ انفعال، یا تاثر، رنج وراحت لذت والم، مسرت وغم اور امید و یاس، دونوں پہلوؤں سے ہوسکتا ہے۔ لیکن میر صاحب کی انفعالیت و تاثر، رنج و والم، غم اور یاس کی کیفیات سے معمور ہے۔ اس لیے شاعری میں ایک ہی قسم کی اثر خیزی اور ایک ہی قسم کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ انفعال و ''تاثر'' کی افراط، سوز وگداز، اور اسلوب بیان کی سادگی، میرؔ صاحب کے کلام کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے میرؔ صاحب کے تاثرات، سوز وگداز اور اسلوب کی سادگی کا

اندازہ ہوگا۔"[۲۷]

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات میں سہا مجددی نے کلامِ میرؔ کی اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ان کے خیال میں میرؔ کے یہاں رفعتِ تخیل کمیاب ہے مگران کا اسلوب بیان لاثانی ہے۔ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت انفعال/تاثر ہے۔چنانچہ سہا مجددی کی رائے میں انفعال وتاثر کی افراط،سوز وگداز اور اسلوب بیان کی سادگی میرؔ کے کلام کے عناصر ترکیبی ہیں۔اپنی رائے کے اظہار کے بعد سہا مجددی نے میرؔ کے اشعار کا طویل انتخاب پیش کرتے ہوئے ان کے اسلوب بیان کی مختلف خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> "شعرا جب دل میں دردِ عشق اٹھنے کا مضمون ادا کرتے ہیں تو اس کی شدت وکلفت مختلف تشبیہوں اور گوناں گوں تمثیلوں سے بیان کرتے ہیں،مگر میرؔ نہ کوئی تشبیہ دیتے ہیں نہ تمثیل،سادہ الفاظ میں امرِ واقعہ کا اظہار ہوتا ہے۔"[۲۸]
>
> پھر شعر کے ذریعہ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہیں:
>
> کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغریِ بدن میں
> کیا عشق میں ہوا ہے اے میرؔ حال تیرا
>
> "زرد زرد چہرہ اور لاغریِ بدن" سے جو مطلب ادا نہ ہوسکا تھا،وہ میر صاحب نے دوسرے مصرعہ کے استفہام سے مکمل کردیا ہے۔چنانچہ یہی استفہام شعر کے تمام تاثرات کا کفیل ہے اوراس استفہام نے جوکام کیا ہے وہ کوئی تشبیہ اور کوئی استعارہ نہیں کرسکتا۔"[۲۹]

سہا مجددی نے یہ تو ضرور لکھا ہے کہ میرؔ کے کلام میں تخیل کی "طلسم آرائیاں" کمیاب ہیں لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تخیل سے ان کا کلام معریٰ بھی نہیں۔اسی لیے انھوں نے کلامِ میر سے رفعتِ تخیل کی مثالیں بھی اپنے اس مضمون میں دی ہیں۔اس شعر میں رفعتِ تخیل کی اڑان ملاحظہ ہو

یک بیابان برنگ صوت جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

سہا لکھتے ہیں کہ ''بے کسی اور تنہائی کی فراوانی ظاہر کرنے
کے لیے صوتِ جرس کی تشبیہ اور ایک بیابان کا پیمانہ تخیل نے کس
قدر ندرت سے اختراع کیا ہے۔''[۳۰]

اس عہد کی تنقید میں ایک اور خاص بات نظر آتی ہے اور وہ ہے دو ہم عصر شاعروں کا موازنہ یا تقابل۔ یہ انداز تنقید ہمیشہ سے ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ دو باتوں یا اشخاص کی اہمیت کے فیصلے کے لیے ایک آسان اور فطری طریقہ ہے۔ اس زمانے میں اس انداز تنقید کی مقبولیت کا سبب موازنۂ انیس و دبیر کی ہنگامہ خیزی تھی اس لیے میر و سودا، غالب و ذوق اور دوسرے شعراء کے تقابل کا عام رواج تھا۔ سہا نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے لیکن میر، سودا اور میر درد میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کے بجائے ان کی انفرادی خصوصیات کا اعتراف کیا ہے۔ اس طرح سہا کے یہاں میر کے بارے میں ایک صحتمند اپروچ نظر آتا ہے۔ وہ زبان اظہار، فکر ہر پہلو پر زور دیتے ہیں جس کی وجہ سے میر تنقید میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

جعفر علی خاں اثر کا مضمون ''گلشنِ میر'' نیرنگ کے مضامین میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون کی ابتداء میں انھوں نے رسالہ اُردو (اپریل ۱۹۲۶) میں شائع ''ذکر میر'' کے خلاصہ/ترجمہ سے میر کی زندگی کے ان اہم پہلوؤں کو شامل کیا جن کا تعلق میر کی شاعری سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ذکر میر سے ہماری معلومات میں جو جو اضافے ہوتے
ہیں ان کی تفصیل کی اس مضمون میں ضرورت نہیں، صرف یہ خیال
رکھنا چاہئے کہ میر جس پر آشوب زمانے میں تھے اور جو واقعات
انھوں نے دیکھے یا سنے اور جن جن مصائب کا ان کو اپنی عمر کے
ایک بڑے حصہ تک سامنا ہوا ان سب کے نقوش ان کی شاعری
میں ملتے ہیں۔''[۳۱]

اس مضمون میں اثر ایک طرف جہاں میر کی شخصیت اور ان کی زندگی کے اثرات

کلامِ میر میں تلاش کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف وہ میر کی شاعری کے موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں میر کو نہ صرف تصوف پر عبور حاصل تھا بلکہ شوق سیاحت اور روزگار کی تلاش نے ان کے مشاہدے کو گہرائی بخشی ان کے حسّاس دل کے سبب ان کا کلام دردمندی سے لبریز ہے۔ جعفر علی خاں لکھتے ہیں:

''میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ شاعری تنقیدِ حیات ہے میر کی شاعری بدرجہ اتم اس کی مصداق ہے۔ ان کی شاعری تمام ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے تخیل و محاکات کے بہترین نمونے اس کے علاوہ دیگر محاسن مثلاً سلاست، صفائی، حسن بندش، لطف تشبیہ واستعارہ اور ہر ایک درجۂ کمال پر موجود ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ باوجود اس ہمہ گیر تخیل اور قوت اختراع کی آخری حدود پر پہنچنے کی میر نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ہر شعر کی تہہ میں ایک عظیم الشان راستی پنہاں ہے ان کی شاعری کا یہی پہلو ہے جو ان کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ قصیدہ اچھا نہ کہہ سکے جس میں تصنع اور مبالغہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ شاید ہی زندگی کا کوئی پہلو ہو جس کی مصوری میر نے بہترین الفاظ اور موثر ترین پیرایہ میں نہ کی ہو۔ ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع ہیں اور صاف وسادہ الفاظ میں معانی کا ایک دریا موجزن ہے۔''۳۲

مندرجہ بالا اقتباس میں اثرؔ نے میر کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔ وہ میر کے یہاں موضوعات کے تنوع اور رنگارنگی پر روشنی ڈالتے ہیں اور ساتھ ہی اشعار کی تشریح بھی کرتے جاتے ہیں۔ وہ تخیل اور محاکات کی روشنی میں میر کے اشعار کو پرکھتے ضرور ہیں۔ مگر ان کے تنقیدی فیصلوں سے میر کے تئیں ان کی عقیدت مندی جھلکتی ہے۔ اس طرح ان کا رویہ تاثراتی بن جاتا ہے۔ وہ مضمون کے آخری اقتباس میں انتخاب سے قبل غالب اور میر کا ذکر کرتے ہیں۔ میر کو غالب کے مقابلے میں فوقیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں اپنے غالب پرست احباب کے چھیڑنے کو کہا کرتا ہوں کہ میر کا گہرا مطالعہ اور ویسے شعر کہنے کی کوشش کرو کامیاب نہ ہوگے۔ مگر غالب کی ٹکر کے شعر کہنے لگو گے میرے اس قول میں مذاق و مبالغہ کے علاوہ حقیقت کا بھی ایک عنصر ہے اور غالب کی شاعرانہ زندگی جہاں تک اردو کا تعلق ہے اوسکی مصداق ہے جب تک بیدل کا تتبع کیا مرزا نے جو کہا ظاہر ہے۔ ان کے صاف اشعار جن میں مطالب کی بھی خوبیاں ہیں، میر کے رنگ میں کہنے کی سعی کا نتیجہ ہیں یہ اشعار وہی ہیں جن میں فارسی کی ترکیبیں نہیں ہیں یا اعتدال کے ساتھ ہیں انھیں اشعار کے سبب سے غالب، "غالب" ہیں اور ان میں میر کے رنگ کی جھلک ہے۔ میر کا کلام زبان حال سے اعلان کر رہا ہے کہ اردو غزل گوئی کس کو کہتے ہیں یہ کس مرتبہ کو پہنچ سکتی ہے اور اس میں کس قدر وسعت ہے۔"[۳۳]

اثر لکھنوی نے میر و غالب کا کوئی تقابل نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے خود غالب پرست دوستوں کو چھیڑنے کی بات کہی ہے۔ وہ غالب و میر دونوں کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ میر کے گداز قلب نے ان کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ متاثر کیا۔ اثر کی تنقید میر میں اہمیت کا تفصیلی جائزہ مقالے کے چوتھے باب "میر کے اہم نقاد" میں لیا گیا ہے۔

عشرت رحمانی کے مضمون "خیابان میر" (کلیات میر کا ایک سرسری مطالعہ) میں میر کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اس دور میں تنقید میر کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ میر کی شاعری کے ایک ایک پہلو پر عشرت نے توجہ دی ہے۔ قصیدہ، مثنوی، رباعیات، ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مسدس، واسوخت، مثلث، مربع، قطعات ہر صنف پر الگ الگ اظہار خیال کیا ہے۔ میر کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حقیقی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ اوس کی فطرت میں

شعریت کو کافی دخل ہو۔ تخیل حقیقی طور پر اس کی امداد کرے اپنے زمانہ اور ماحول کا کافی مطالعہ کر لے حیات انسانی کے اسرار وغوامض سے آگاہ ہو۔ اور پھر ان تمام واقعات و واردات کا مناسب اور موزوں الفاظ میں روانی اور صفائی کے ساتھ اظہار کرے۔ اس معیار پر جس قدر میرؔ صاحب کا کلام پورا اترتا ہے۔ ان کے عہد کے کسی شاعر کو نصیب نہیں بہ حیثیت مجموعی ان تمام خوبیوں کا مظہر ان کا کلام ہے۔ درحقیقت میر فطری شاعر تھے۔ اکتساب واصلاح سے بے نیاز اونکی علمی وادبی فضیلت بھی مستند و مسلم ہے۔ میرؔ صاحب کے کلام میں یوں تو رنگا رنگ کے مضامین اور خوبیاں موجود ہیں مگر حسرت واندوہ، سادگی اور صفائی درد واثر ان کی شاعری کی خصوصیت کا خاصہ ہیں ان کے تمام کلام میں بیجا تشبیہوں اور استعاروں، بھونڈے اور بعید از قیاس مبالغوں کا ذکر نہیں، نہ کہیں ایہام ہے نہ فارسی آمیز اغلاق واشکال خیالات میں پاکیزگی ہے، جذبات میں رفعت ہے، واردات وکیفیات صحیحہ کو اس دلکش انداز اور مؤثر پیرایہ سے ادا کیا ہے کہ بے ساختہ ''آہ نکل جاتی ہے زبان کا انداز نہایت سلیس فصیح اور شستہ ہے۔''۳۴

عشرت رحمانی نے ۱۹۲۸ء میں پہلی بار اپنے اس مضمون میں میرؔ کے کلیات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ میرؔ کے قصائد جن کے بارے میں اب تک ناقدین کی رائے یہ تھی کہ غزل کے مقابلے میں پست، سودا سے مرتبے میں کم ہیں۔ عشرت رحمانی قصائد کا نہ صرف تفصیلی ذکر کرتے ہیں بلکہ مثالوں کے ذریعہ اس بات کی دلیل بھی دیتے ہیں کہ میرؔ کے قصیدے چاہے غزلوں کے مقابلے میں بلند پایہ نہیں لیکن بجائے خود اس قدر پست بھی نہیں جیسا کہ عام خیال ہے کہ، وہ لکھتے ہیں:

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میرؔ صاحب کی عمر اگرچہ افلاس کے عالم میں گزری لیکن ان کی طبیعت کی افتاد کچھ

اس طرح واقع ہوئی تھی کہ کسی کی خوشامد، یا بیجا صفت وثنا گوارا نہ کی۔ نہ طمع وحرص نے کبھی کسی صاحب دولت کے سامنے دست سوال دراز کرنے پر مجبور کیا۔ ان کے عادات واطوار نہایت سنجیدہ اور متین تھے پرہیز گاری اور ریاضت نے انھیں عظمت دی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی بلند نظری اور خودداری نے عیش کے لالچ یا افلاس کی تکلیف سے کسی کے سامنے سر جھکنے نہ دیا۔ ہمیشہ سر بلند ہی رہے۔ ان تمام واقعات و واردات نے ان کی شاعری پر ایک خاص اثر کیا اور خاص سبب یہی ہے کہ ارباب ظاہر کی مدح میں دوسرے معاصرین کی طرح بلند بانگ قصائد ان کے ذخیرۂ کلام میں ناپید ہیں، کیونکہ مدح سرائی کے جوش وخروش، بیجا تشبیہوں، استعاروں اور بعید از قیاس مبالغوں کو کمال شاعری تصور نہیں کرتے تھے ان کا عقیدہ اور طبیعت کی افتاد یہ تھی۔

مجھ کو دماغ وصفِ گل ویاسمن نہیں
میں جوں نسیم بادِ فروش چمن نہیں ۳۵

عشرت رحمانی سودا کے قصائد کی کامیابی کے تو قائل ہیں مگر وہ میرؔ کے قصیدوں کو بھی کم مرتبہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف جہاں سوداؔ کے تخیل اور شوکت الفاظ کی تعریف کرتے ہیں وہیں میرؔ کے فطری رنگ کا بھی ذکر کرتے ہیں:

''اور یہ واقعہ بھی ہے کہ سودا کامیاب قصیدہ گو تھے! لیکن یہاں ایک خاص پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سودا کے قصائد بہ اعتبار علوئے تخیل، شوکت الفاظ اور جوش وخروش کے اعلیٰ وارفع ہیں۔ مدحت طرازی میں انھوں نے بلند پروازی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ مگر جہاں یہ تمام خوبیاں وصف کے قابل ہیں وہاں بلند بانگ اور پرشکوہ مبالغوں کی کثرتؔ نے غیر فطری رنگ کی جھلک بھی نمایاں کردی ہے۔ برخلاف میر کے کہ ان کے یہاں

تلاش سے کہیں کہیں شاید اس کی خفیف جھلک نظر آ سکے۔ ورنہ شان وشوکت اور بلندیٔ تخیل کے باوجود فطری رنگ جھلکتا ہے۔"۳۶

آگے لکھتے ہیں:

"ذوق سلیم ہی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ میرؔ کے لطفِ روئیدگی اور سودا کے جوشِ روئیدگی میں کیا فرق ہے سودا کے شعر میں وہی غیر فطری جوش ہے اور میر کے شعر میں فطری لطف۔"

"ہر شعر سلامتی ذوق کی اعلیٰ مثال ہے۔ کیا جوش روانی ہے، کیا فصاحت و عالی خیالی ہے، اسلوب بیان اور تازگی مضمون نے تشبیب میں ایک شان پیدا کر دی ہے۔ منقبت کے دوسرے قصیدے میں تخلص کے بعد کس خوبی سے مدحت سرائی کرتے ہوئے دعا کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ اس حسن بیان اور پاکیزگیٔ تخیل کا کیا کہنا یہ شاعری نہیں اظہارِ حقیقت ہے۔"۳۷

ایک ایک شعر ہزاروں کیفیتوں کا آئینہ دار ہے اور انداز بیان کی دلکشی حد درجہ قابل ستائش پانچویں شعر میں کیسی سچی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ دعائیہ اشعار پر تو ہر مسلمان بے ساختہ برائے خود "آمین" کہنے کو مجبور ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ منقبت میں قصیدے کی اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے۔"۳۸

"میرؔ کے ان اشعار کی پختگی اور روانی بلند سے بلند قصیدہ کی برابری کر سکتی ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ میر کے قصیدے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ افسوس کہ مطالعہ اور انتخاب کی زحمت ہی گوارا نہیں کی جاتی ورنہ تعداد میں کم سہی درجہ میں کم نہیں۔"۳۹

عشرت رحمانی اپنے اس مضمون میں میرؔ کو تمام شعراء میں سب سے عظیم مثنوی گو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا نجم الغنی صاحب مدظلہٗ مولف سحر الفصاحت تحریر

> فرماتے ہیں ''شعرائے ریختہ میں میر تقی میر اور میر حسن اپنے اپنے وقت میں مثنوی لکھنے میں کامل گزر گئے ہیں اور اس فن میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ باقی شعراء ان کے پیرو ہیں'' اس کے علاوہ اکثر بیانات سے ثابت ہے کہ اردو کے اس اصلاحی دور میں سب سے پہلے کامیاب مثنوی گو تو میر صاحب مانے جاتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں مرزا سودا نے بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن میر سے اس میدان میں گوئے سبقت نہ لے جاسکے۔ بلکہ بہت پیچھے رہ گئے دیگر اصناف سخن کی طرح میر کی مثنویوں کی تعداد بھی زیادہ ہے اور مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ عشقیہ مثنویاں اور صیدنامے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ورنہ یوں تو ہر صنف میں ان کا خاص رنگ کامیابی سے نمایاں ہے۔ ان کی غزلیں دیکھنے والے بخوبی سمجھتے ہیں کہ عشقیہ مثنویوں میں عاشق مزاج پاکباز۔۔۔۔۔ نے کیا کیا سحر کاریاں کی ہوں گی۔ ایک ایک لفظ دردو اثر میں ڈوب کر دردمند دل سے نکلتا ہے۔''[۳۷]

خیابانِ میر میں عشرت رحمانی میر کی شاعری کی تمام اصناف پر اظہار خیال کرتے ہیں حالانکہ اس سے قبل آزاد بھی آبِ حیات میں میر کی شاعری کی جملہ اصناف سخن پر تنقیدی نظر ڈال چکے تھے مگر جس طرح سے عشرت رحمانی نے اپنے مضمون میں میر کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے خاص طور سے میر کے قصائد اور مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ وہ ان کی صلاحیتوں کا غماز ہے۔

نیرنگ کے اس اہم ترین میر نمبر میں کل سات مضامین شامل ہیں جن میں سے چھ پر ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ ساتواں مضمون مولانا مطلب حسین بی اے کا مضمون ''میر کی عشقیہ مثنویاں'' ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے میر کی مثنویوں کی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ مضمون اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ میر کی مثنویوں پر پہلا تفصیلی مضمون ہے۔ مطلب حسین سادگی بیان، تسلسل کلام، ربط بیان، پلاٹ، کردار نگاری، مصوری اور واقعہ

نگاری، صحیح انتخاب و واقعات و موقع شناسی زبان پر قدرت، نتائج کو مثنوی کی خوبیاں قرار دیتے ہیں۔ اور میر کی مثنویوں کو اس معیار پر کھرا پاتے ہیں۔

نیرنگ کے میر نمبر کے ساتھ ہی نومبر ۱۹۲۹ء میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے ''فیض میر'' کو شائع کیا۔ دراصل یہ کتاب میر نے اپنے بیٹے فیض علی کے لیے لکھی تھی جب کہ وہ دلی میں مقیم تھے۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے اس کتاب کے ترجمے کے ساتھ ۳۲ صفحات کا اپنا مقدمہ بھی شامل کیا ہے۔ فیض میر پانچ حکایتوں کا مجموعہ ہے جو میر کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو پر روشنی ڈالتا ہے جس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں تھے یعنی فروغِ علم میں میر کی دلچسپی۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

> ''میر کی شاعری کو بہ خوبی سمجھنا ہو تو میر کو سمجھئے اور میر کو سمجھنا ہو تو ذکر میر اور فیض میر پڑھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے کلام کی تہہ کو پہنچنے کے لیے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ذکر میر اگر میر کے ماحول کا صحیح نقشہ ہے تو فیض میر ان کی سیرت کی سچی تصویر ہے۔''[۱۴]

فیض میر اس اعتبار سے تو ضرور اہمیت رکھتی ہے کہ یہ میر تقی میر کی تصنیف ہے مگر نقدِ میر کے سلسلے میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

مسعود الرحمٰن خاں ندوی کی کتاب ''میر کے بہتر نشتر'' ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ مقدمے کے آخر میں تاریخ ۱۹۲۹ء درج ہے یعنی یہ کتاب/ انتخاب ۱۹۲۹ء تک مکمل ہو چکی تھی۔ اصل میں یہ انتخاب کلام میر ہے جس کی ابتدا میں مسعود الرحمٰن خاں ندوی نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں جعفر علی خاں اثر کے ''تعارف میر'' کے ساتھ کلام میر کا طویل انتخاب بھی شامل ہے۔

مسعود الرحمٰن خاں ندوی میر کی شاعری کا تعارف لکھتے ہوئے انھیں درد و الم کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں میر کی شاعری ہماری زندگی کی ترجمان ہے۔ میر نے اپنے دل پر گزرنے والی کیفیات کو شعر کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ میر کا کلام ان کے عہد کا عکاس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر کے کلام میں حرماں و مایوسی کے جو مناظر نظر آتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا ہر طرف یاس کا عالم تھا۔ اس کیفیت کو میر کی طبیعت نے قبول کیا ان کی شاعری دلی مایوسیوں کی زندہ تصویر ہے اس میں شاعری کے چونچلے اور مبالغہ آمیز استعارات و کنایات نہیں بلکہ صاف صاف، سادہ سادہ الفاظ میں قلبی کیفیت کو زیب کاغذ کیا گیا ہے''۔ ۴۲

مسعود الرحمٰن خاں ندوی اپنے اس تبصرے میں کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ یہ تمام باتیں مولانا آزاد کے خیالات کی بازگشت معلوم ہوتی ہیں اور نقدِ میر میں کوئی اضافہ نہیں کرتیں۔

۱۹۳۰ء میں جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان نے میرؔ کی مثنویات کا انتخاب کیا یہ انتخاب ۱۹۳۰ء میں پہلی بار اور دوسری بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔
اس کی تمہید میں محمد سلیمان لکھتے ہیں:

''اصولِ انتخاب یہ رکھا گیا ہے کہ صرف ان اشعار کو نقل کیا ہے جو فنِ شاعری کے نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہیں۔'' ۴۳

سر شاہ سلیمان تذکروں کی تنقید خصوصاً آبِ حیات کے حوالے سے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ''میر کے کلام میں پست و بلند دونوں طرح کے اشعار موجود ہیں اسی امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے مثنویات میرؔ کا انتخاب کیا ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ''فنِ شاعری کے لحاظ سے اعلیٰ اشعار کو نقل کیا جائے۔

مگر شاہ سلیمان اپنے مقدمے میں مثنویات میرؔ پر کسی قسم کی تنقید نہیں کرتے۔ میرؔ کی مثنویات کے بارے میں وہ سید حیدر طباطبائی کے حوالے سے مختصر رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''ان کے قصائد (میر) بے مزہ اور پھیکے ہیں، البتہ وہ مثنویات کے موجد اور عمدہ نمونہ ہیں، ان میں قدرتی انداز ہے۔ ان ہی کی بدولت مثنوی کو ترقی ہوئی۔ میر حسنؔ اور شوقؔ کو ان ہی کا مقلد سمجھنا چاہیئے باوجود اس کے یہ امر واقعہ ہے کہ اکثر مثنویات

جن میں کتے، بلّی، بکری، اور مرغ وغیرہ کے قصّے درج ہیں،
نہایت گری ہوئی ہیں۔ بعض مثنویوں میں ہندی کے ٹھیٹ اور
ثقیل الفاظ ہیں، بعض میں فحش قصّے نظم ہیں۔'' ۴۴

میر حسن کی مثنویوں کے بارے میں سید حیدر طباطبائی کی یہ رائے کہ میرؔ ہی مثنوی کے موجد ہیں اور ان کی بدولت مثنوی کو خاص ترقی ہوئی ہے۔ میر کی شاعری کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ سر شاہ سلیمان میرؔ کی شاعری کی خاص خوبی ان کی سادگی کو قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''میر کے کلام کی خصوصیت ان کی سادگی ہے۔ روزمرہ
کے سہل اور آسان الفاظ میں حسن وخوبی سے اظہار خیال کرنے
میں ان کو کمال حاصل ہے۔ سلاست اور صفائی ان کا خاص حصّہ
ہے ان کے کلام کو اگر سہل ممتنع کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔'' ۴۵

سر شاہ سلیمان سادگی اور سہل ممتنع کو میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات قرار دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس کے علاوہ وہ اپنے مقدمے میں کہیں کہیں میر کی شاعری پر تنقیدی اظہار خیال کرتے ہیں ورنہ پورا مقدمہ میرؔ کی سوانح پر مشتمل ہے۔ جس میں ان کی پیدائش سے وفات تک کے حالات پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ زیادہ تر واقعات آزاد کی آبِ حیات سے ماخوذ ہیں۔ بہر حال سید شاہ سلیمان کا یہ مقدمہ یا ان کا یہ انتخاب اس اعتبار سے تو اہم ہے کہ کسی ادیب نے غالباً میرؔ کی مثنویوں کو شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ہمیں اس امر سے روشناس کرایا کہ میر اردو کے پہلے مثنوی نگار ہیں۔ لیکن شاہ سلیمان اپنی مختصر رائے میں میر کے کلام کی کسی نئی خوبی کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ وہ صرف ان ہی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ جن پر قدیم تذکرہ نگار اور نیرنگ (میر نمبر) کے نقاد پہلے سے ہی کافی کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس لیے ان کا یہ انتخاب تنقید میر میں کسی نئے باب کا اضافہ نہیں کرتا۔

غرض یہ کہ تذکروں یعنی ۱۸۸۰ء کے بعد تنقید میرؔ نئی راہوں کی طرف گامزن تو ہوئی مگر ۱۸۸۰ء آبِ حیات کے بعد سے ۱۹۲۱ء یعنی انتخاب کلام میرؔ (مقدمہ عبدالحق) کی اشاعت تک کا دور نقدِ میر میں کسی خاص اضافے کا سبب نہیں بن سکا۔ صرف مختصر مضامین یا

ضمنی ذکر ضرور ملتے ہیں۔ جیسے حالیؔ اور امداد امام اثرؔ کی کتابوں میں میرؔ کا ذکر۔ عبدالحق کے "انتخاب میر" کا مقدمہ اور "نیرنگ" کے میر نمبر کی اشاعت نقدِ میر کی احیاء کی بنیاد بنے۔ ان مصنفین نے جس طرح مغربی تنقید کے زیر اثر کلام میرؔ کا مطالعہ کیا اور کلام میر پر ناقدانہ نظر ڈالی وہ اپنی مثال آپ ہے، کیونکہ یہ ناقدین اس دور میں لکھ رہے تھے۔ جب ان کے سامنے کلام میر پر تذکروں کے سوا کوئی اور تنقیدی مثال موجود نہیں تھی۔ ان مصنفین نے کلام میرؔ کا تفصیلی جائزہ لے کر نقدِ میر کے سلسلے کو آگے بڑھانے کی بنیاد رکھی۔

نیرنگ کے میر نمبر کے بعد عبدالمنان بیدل ایم اے عظیم آبادی (پروفیسر گورنمنٹ کالج پٹنہ) کی کتاب "اشعار میر" ۱۹۳۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کے مزید ایڈیشن ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۳ء میں منظر عام پر آئے۔ اس کتاب کا مقدمہ مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد کے والد پروفیسر عظیم الدین احمد (صدر شعبۂ عربی و فارسی، اُردو پٹنہ یونیورسٹی) نے لکھا ہے۔ جو تقریباً ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ تعارف کے آخر میں تاریخ یکم جون ۱۹۳۴ء درج ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس طرح اس کا سنہ تصنیف ۱۹۳۴ء قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر عظیم الدین میرؔ کے یہاں حزن اور سوز کی تلاش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں میر یاسیت پسند شاعر ہیں، ان کا کلام ہمیں رلاتا ہے۔ میرؔ کی زندگی کا درد اُن کی شاعری سے ظاہر ہے۔ وہ اپنے دل کی پریشان حالی اور اثر افسردگی کی کامیاب تصویر کھینچتے ہیں۔

مختصر سی رائے کے بعد پروفیسرِ عظیم الدین نے مختلف عنوانات کے تحت میرؔ کے اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔ یہ عنوانات میر کی شاعری کی مختلف خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عشق کے اثرات، پراگندگی طبع، دیوانگی، شوق، محزونی، بے خودی، دردمندی، آرزو، فراق کا دکھ، عذاب زندگی، ناامیدی، محرومی، حیرانی، معشوق سے خیالی گفتگو، دل گدازی، جیسی کیفیات کو ان میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی پروفیسر عظیم الدین نے میرؔ کے شاگردوں اور متاخرین پر اُن کے اثرات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ متاخرین میں غالبؔ، ذوقؔ، وزیرؔ، مومنؔ، داغؔ، شادؔ، آتشؔ، اور نسیم لکھنوی شامل ہیں۔ اس حصے کی اہمیت صرف اتنی ہو سکتی ہے کہ اس میں انھوں نے بہت سے شعراء کے یہاں میر کے اثرات کو تلاش کیا ہے لیکن میر

کے بارے میں خود انھوں نے کوئی تفصیلی رائے نہیں دی ہے۔

''اشعارِ میر'' کا پیش لفظ، پروفیسر عبدالمنان نے لکھا ہے، جس کے آخر میں تاریخ یکم اگست ۱۹۳۴ء درج ہے۔ پیش لفظ کے ساتھ تقریباً ۶۵ صفحات میں میر کی زندگی اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ پیش لفظ میں عبدالمنان نے ان کتابوں اور رسائل کی وضاحت بھی کر دی ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا۔ بقول ان کے اس وقت ان کے پیشِ نظر گلشنِ ہند، گل رعنا، جلوۂ خضر، ترجمۂ تاریخ ادب اُردو، آب حیات، انتخاب کلام میر، میر کے نشتر، تذکرہ شعرائے اُردو، جریدہ ہمایوں ماہ اپریل ۱۹۳۴ء، جریدہ زمانہ ۱۹۳۱ء، تاریخ شعرائے بہار جلد اوّل وغیرہ کتابیں تھیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آبِ حیات کے علاوہ کسی اور کتاب کا حوالہ عبدالمنان نے نہیں دیا۔

عبدالمنان کے خیال میں میر اپنے دلی جذبات واحساسات سے مجبور ہو کر شعر کہتے ہیں اور اپنے اندرونی غموں کو اشعار کے قالب میں پیش کر دیتے ہیں۔ ایک اہم بات جس کی طرف پروفیسر عبدالمنان نے دبی زبان سے ہی سہی خصوصی توجہ دلائی ہے۔ وہ میر کی شوخی وظرافت، خیامیت اور مسرت پرستی ہے وہ اپنے دعوے کی دلیل کے لیے ۲۳ اشعار کا انتخاب بھی پیش کرتے ہیں۔ جن میں میر رجائی اور زندگی سے محبت کرنے والے شاعر نظر آتے ہیں۔ عبدالمنان نے لکھا ہے:

> ''اُن (میر) کے کلام میں شوخی وظرافت اور فلسفۂ خیام کی بھی مثالیں ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی اوائل زندگی میں مسرت کے لمحے بھی گزرے ہیں۔'' ۴۶

۲۳ اشعار کا انتخاب پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر منان نے لکھا ہے:

> ''رندی اور خیامیت کی مثال اس سے بہتر کیا مل سکتی ہے کیا ان اشعار سے یہ دعویٰ باطل نہیں ہوتا کہ میر ایک پیکرِ غم تھا جس میں نقوشِ مسرت اور خطوطِ شادمانی کی دھندلی سی جھلک نظر نہیں آتی۔ ۴۷

عبدالمنان کی کتاب ''اشعارِ میر'' کا ذکر شاید ہی کہیں ہوا ہو ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں یہ اقتباس میر کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا

ہے جس پر عبدالمنان سے قبل غالباً کسی کی نظر نہیں گئی۔ میرؔ کی زبان اُن کے خیال میں بول چال کی زبان ہے اور میرؔ فارسی تراکیبوں اور ہندی الفاظ کا استعمال بھی بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔

عبدالمنان میرؔ کے خدائے سخن ہونے کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ ''میرؔ کو خدائے سخن کیوں قرار دیا گیا ان کے کے کلام میں کون سی ایسی خوبی ہے جس کے سبب سخن سنجوں نے انھیں یہ خطاب دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''میر کو خدائے سخن کہتے ہیں ''کیوں''؟ یہی امر دریافت طلب ہے میرؔ کے کلام میں کون سی ایسی ممتاز خصوصیت ہے جس کی بنا پر سخن سنجوں نے اسے یہ خطاب دیا ہے'' ۴۸

میر کے خدائے سخن ہونے کا جواز پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

> ''خدائے سخن میرؔ نے تمام اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی گو اُن کی خاص اور محبوب عام چیز غزل ہے۔ قصیدہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ، واسوخت بھی کچھ لکھا۔ ۴۹

میرؔ کو ''خدائے سخن'' کیوں کہا گیا؟ اس کا جواب ڈاکٹر عبدالمنان نے آج سے تقریباً ۷۳ سال قبل تلاش کرنے کی کوشش کی جب کہ ۱۹۳۴ء تک میرؔ پر کوئی اہم تنقیدی کتاب سامنے نہیں آئی تھی۔ میر تنقید ہی کیا خود ہماری تنقید کی عمر بھی ۱۹۳۴ء میں کچھ زیادہ نہ تھی ۔ ڈاکٹر عبدالمنان نے ایسے وقت میں غالباً پہلی بار میرؔ کے خدائے سخن ہونے کی وجوہات متعین کرنے کی سعی کی، شمس الرحمٰن فاروقی نے ۱۹۹۰ء میں شعرِ شور انگیز میں ''خدائے سخن میر کہ غالب'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جسے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے میرؔ کو ''خدائے سخن'' قرار دیتے ہوئے میرؔ و غالبؔ کی بہت سی اہم خصوصیات کا تقابل کیا مگر بنیادی وجہ جس کے سبب انھوں نے میرؔ کو خدائے سخن کہا۔ فاروقی کے خیال میں بھی میرؔ کی تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمنان کو بھی میرؔ کے خدائے سخن ہونے کی یہی وجہ نظر آئی تھی مگر وہ اپنی بات کو اتنے موثر انداز سے نہیں کہہ پائے جس طرح فاروقی نے کہا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی شعرِ شور انگیز میں رقم طراز ہیں:

''اب میر کا حال دیکھیے۔ اچھے یا بُرے، وہ کسی صنف میں بند نہیں، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی ان سب میں انھوں نے خاصا کلام چھوڑا ہے۔ اور اگر شہر آشوب اور واسوخت کو الگ اصناف مانیے تو آٹھ اصناف میں میر کا کلام موجود ہے۔۔۔۔۔۔اصناف کی کثرت کے اعتبار سے کوئی شاعر میر کا مدِ مقابل نہیں۔۔۔۔۔۔لہٰذا ایسے شاعر کو جو اپنے عہد کا ممتاز ترین شاعر ہو، اور جس کے کلام سے ہر صنف کا نمونہ خاصی مقدار میں مل جاتا ہو جس نے ایک صنف اور ایک بحر تقریباً خود ایجاد کی ہو، اس کو خدائے سخن کہا جائے تو غلط ہو گا۔۔۔۔۔۔اس مجموعی محاکے کی روشنی میں اور اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ میر نے غالب سے زیادہ اصناف کو برتا ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''خدائے سخن'' کا خطاب میر کو ہی زیب دیتا ہے''۔ ۵۰

ان اقتباسات کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شعرِ شور انگیز لکھتے وقت شمس الرحمٰن فاروقی کے پیشِ نظر ڈاکٹر عبدالسنان کی کتاب تھی، حالانکہ انھوں نے کہیں بھی شعرِ شور انگیز میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ جب کہ علی سردار جعفری، عسکری اور دوسرے میر ناقدین کا ذکر وہ کرتے رہے ہیں۔ یہاں پر اہم بات یہ ہے کہ ۷۰ سال پہلے عبدالسنان نے نقدِ میر کے سلسلے میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا وہی باتیں شمس الرحمٰن فاروقی اور دوسرے جدید ناقدین کے یہاں تنقیدِ میر کی بنیاد بنیں۔

''اشعارِ میر' میں روایتی انداز میں کلام میر پر تنقید کی گئی ہے۔ میر کے ۱۴ شاگردوں کے مختصر تعارف کے ساتھ ان کے اشعار بھی درج ہیں۔ شاگردوں کے ذکر کے بعد میر کے ۲۱ معاصرین کا ذکر ہے۔ میر کے کلام کا موازنہ سودا اور درد سے کیا گیا ہے۔ معتقدینِ میر کی ایک طویل فہرست بھی شامل ہے۔ اس طویل فہرست میں غالب، ذوق، سودا، مصحفی، رند، شیفتہ، حالی، امیر مینائی، سید رضا علی وحشت، خواجہ آتش، میر مجروح، عرش، شاد، مولوی اسماعیل، داغ، اکبر الٰہ آبادی، صفی، مولانا عزیز لکھنوی، کے نام شامل ہیں۔ روایتی اندازِ تنقید کے باوجود اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اشعار میر نقدِ میر کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

''اشعارِ میر'' اس کے بعد ترقی پسند تحریک سے قبل میر پر جو اہم اور پہلی کتاب سامنے آئی وہ صفدر آہ کی ''فلسفۂ میر'' ہے۔ فلسفۂ میر نے نقدِ میر کے احیاء کا کام کیا۔ اس کتاب کے مقدمے میں پروفیسر علامہ اشہر لکھنوی (ایم اے) نے لکھا ہے:

> ''میری نظر میں کلام میر پر اس سے زیادہ مبسوط اور دلچسپ تبصرہ اردو ادب میں اس وقت موجود نہیں''۔ ۵۱

خود صفدر آہ اپنی کتاب ''میر اور میریات'' میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے فخر ہے کہ میر کے موضوع پر پہلی تصنیف ''فلسفۂ میر'' میری ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی ہے اور ۱۹۳۴ء میں تکمیل کے بعد شائع کی گئی۔ اس وقت یہ کتاب کافی مقبول ہوئی۔'' ۵۲

دراصل اس کتاب کو شائع ہونے میں کچھ وقت لگا۔ اس کتاب کے آخر میں صفدر آہ نے تمت بالخیر کے تحت سنہ تکمیل ۱۹۳۶ء لکھا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں لکھے جانے کے بعد ۱۹۳۶ء میں شائع ہونے کی وجہ خود انھوں نے فلسفۂ میر کے دیباچے میں تحریر کی ہے:

> ''یہ کتاب جسے اس وقت پیش کر رہا ہوں دراصل میں نے ۱۹۲۸ء میں لکھی تھی، چنانچہ اس سال جب میر نمبر شائع ہونے والا تھا تو اس کا اقتباس بھی میں نے ایڈیٹر صاحب ''نیرنگ'' کو بھیجا لیکن بد قسمتی سے میرا مضمون غالباً اس وقت پہنچا جب ''میر نمبر'' کی کتابت ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا اوسکی اشاعت ملتوی رہی کتاب ہٰذا چونکہ اس وقت تک میری تساہلی سے ناتمام رہ گئی تھی لہٰذا اوسے شائع بھی نہ کرا سکا۔ اس سال کلام میر کا جو دورہ کیا تو مردہ جذبات میں پھر جان پڑ گئی او سچ پوچھیے تو انھیں کی وجہ سے میں اس وقت اس ناتمام کتاب کو تمام کر کے کسی قدر اضافات اور ترمیمات کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب میں میں نے میر صاحب کے ہر شعبۂ کلام پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے''

''دبی زبان سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ غالباً یہ پہلا مسلسل تبصرہ ہے جو کلام میر پر نکل رہا ہے۔ لہٰذا اگر میں اپنی اس ادبی خدمت پر فخر کروں تو شاید اسے خودستائی کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔'' ۵۳

بہر حال فلسفہ میر چاہے ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی ہو یا ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی ہو ترقی پسند تحریک سے قبل یہ میرؔ پر لکھی گئی۔ پہلی مکمل و مستند تصنیف ہے۔ جس پر اگر صفدر آہؔ فخر کررہے ہیں تو ان کا احساس فخر جائز ہے۔ کیونکہ ''فلسفہ میرؔ'' سے قبل میر پر کوئی باقاعدہ تصنیف موجود نہیں۔ صفدر آہ کی ان دونوں کتابوں پر اس مقالے کے چوتھے باب میں تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔

لیکن شاید یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ۱۹۳۶ میں صفدر آہؔ کی ''فلسفۂ میرؔ'' کی اشاعت کے بعد اردو شعراء پر میر کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یا میر شناسی کے عہد کی ابتدا ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ صفدر آہؔ کی اس کتاب نے تنقیدی حیثیت سے میر کو سمجھنے کی نئی راہیں ہموار کیں لیکن اردو شعراء پر میرؔ کا اثر کچھ عرصے بعد نظر آتا ہے۔ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد وہ اثر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ میرؔ کی زبان کا تتبع، ان کے لہجے کی نقل، ان کا کرب ان کے موضوعات، اداسی، غمگینی، پوری فضا شاعروں کے یہاں آجاتی ہے۔ جس کا بنیادی سبب وہ تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی حالات ہیں جن سے ملک گزر رہا تھا۔ عہد میر کے حالات اور ان کا کرب، ساتھ ہی دہلی سے میرؔ کی لکھنؤ کی ہجرت، لکھنؤ میں لاکھ آصف الدولہ کی سرپرستی حاصل رہی ہو لیکن مزاج کا فرق، دہلی چھوڑنے کا غم، ان چیزوں کے ختم ہونے، لٹ جانے کا صدمہ، میرؔ اس سے نکل نہیں پائے، انھیں حالات اور اسی صدمے سے ایک بار پھر ہندوستان دوچار ہوا۔ لوگوں کو اپنے بسے بسائے گھر چھوڑ کر ایک نئے ماحول اور نئی جگہ انتہائی کسمپرسی اور بے سروسامانی کے عالم میں منتقل ہونا پڑا۔ لہٰذا میر کی شاعری ان کے لیے ذریعہ تسکین بن گئی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ابن انشاء ہوں یا اس عہد کے دوسرے مقبول شعراء یہاں تک کہ بعض ترقی پسند شعرا کی غزلوں میں بھی اس میریت کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ ان حالات نے ایک بار پھر میر کی شاعری کی طرف لوگوں کو رجوع کیا۔ اور میر کی نئی بازیافت کی

کوشش کی گئی۔ پروفیسر شارب ردولوی کا خیال ہے:

> ''آج کا دور بعض اعتبار سے میرؔ کے زمانے سے ملتا جلتا ہے آج بھی ہمیں کسی طرف آسودگی نظر نہیں آتی ہے۔ میرؔ کے زمانے کے مسائل دوسرے کیوں نہ رہے ہوں لیکن ذہنی سکون نہ اس زمانے میں میسر تھا اور نہ اس زمانے میں میسر ہے اس لیے اس دور کو بھی انتشار کا دور کہہ سکتے ہیں۔ آج کے انسان کے معاشی مسائل روزمرہ، پیچیدہ تر ہوتے جارہے ہیں ملکی سیاست اور ایک ملک کے دوسرے ملک سے تعلقات کی حالت کاغذ کی ناؤ کی سی ہے۔ انھیں اثرات کے تحت آج بیشتر نوجوان غزل گو شعراء کے یہاں یاس اور پراگندگی زیادہ ہے۔ [۵۴]

شارب ردولوی کا یہ مضمون مقدمہ کی شکل میں گلِ صد رنگ میں شامل ہے جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا، ظاہر ہے کہ ڈاکٹر شارب ردولوی کے پیش نظر اس زمانے کے حالات تھے جس کے تحت انھوں نے اردو شعراء کے یہاں میرؔ کے اثر کا جائزہ لیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس عہد کے شعراء کے یہاں صرف اداسی اور حرماں نصیبی ہی نہیں آئی بلکہ اکثر شعراء نے میرؔ کی زبان اور لہجے کو استعمال کر کے اپنے اشعار میں اسی اثر کو پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اگرچہ فیضؔ، مجروحؔ، مخدومؔ، جذبیؔ، راہی معصوم رضا، اور تاباںؔ جیسے شعراء کے یہاں میرؔ کا زیادہ اثر نہیں ملتا مگر اس عہد کے نوجوان شعراء کے یہاں میرؔ کے اثرات غالب ہیں۔ اس لیے کہ وہ انھیں معاشی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کا سامنا کر رہے تھے جن سے اپنے عہد میں میرؔ گزرے۔ جدید شاعروں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصر کاظمی، باقر مہدی، اجمل اجملی، واقف رائے بریلوی، میرؔ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ان شعراء کی میرؔ پرستی دیکھ کر لگتا ہے کہ اس زمانے میں میرؔ کا احیاء ہو رہا ہے۔

حواشی

۱۔ الطاف حسین حالیؔ مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۶۵۔ ایم کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۱۹۹۴ء

۲۔ الطاف حسین حالیؔ مقدمہ شعر وشاعری ص ۱۳۶۔ ایم کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۱۹۹۴ء

۳۔ الطاف حسین حالیؔ مقدمہ شعر وشاعری ص ۱۳۶۔ ایم کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی ۱۹۹۴ء

۴۔ امداد امام اثر، کاشف الحقائق ص۔ ۱۱۵، جلد دوم۔ مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور جنوری ۱۹۵۶ء

۵۔ پروفیسر عبدالمغنی، مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری۔ ص ۲۰ ماخوذ از مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات۔ مرتب خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ۱۹۹۲ء

۶۔ تنقیدات عبدالحق۔ ص ۱۵۲۔ بحوالہ مولوی عبدالحق۔ ادبی اور لسانی خدمات مرتب خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۹۲ء

۷۔ پروفیسر عبدالمغنی، مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری۔ ص ۳۱۔ ۳۰ بحوالہ مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات۔ مرتب خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ ۱۹۹۲ء

۸۔ مرتبہ مولوی عبدالحق انتخاب کلام میرؔ۔ ص۔ ۲۱، ۱۹، ۱۸، ۱۱۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

۹۔ مرتبہ مولوی عبدالحق انتخاب کلام میرؔ۔ صفحہ ۱۱۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ

۱۰۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ آب حیات۔ ص ۲۰۳، ۲۰۲۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۱۱۔ مرتب مولوی عبدالحق۔ انتخاب کلام میرؔ۔ ص۔ ۲۸۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۲۸ء

۱۲۔ مرتب مولوی عبدالحق۔ انتخاب کلام میر۔ ص۔ ۵۲۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۲۸ء

۱۳۔ مرتب مولوی عبدالحق۔ انتخاب کلام میر۔ ص۔ ۵۲۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۲۸ء

۱۴۔ شارب ردولوی (مرتب) گل صد رنگ۔ ص ۲۳ ناشر، قیصر الہ آبادی ایوان پبلشرز نخاس کہنہ آباد۔ اگست ۱۹۶۰ء

۱۵۔ شارب ردولوی (مرتب) گل صد رنگ۔ ص ۳۶۔ ناشر، قیصر الہ آبادی ایوان پبلشرز نخاس کہنہ آباد۔ اگست ۱۹۶۰ء

۱۶۔ عزیز اللہ خاں عزیز۔ نیر نگستان۔ ص۔ ۲۰۔ ۱۹۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۱۷۔ عزیز اللہ خاں عزیز۔ نیر نگستان۔ ص۔ ۲۱۔ ۲۰۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۱۸۔ عزیز اللہ خاں عزیز۔ نیر نگستان۔ ص۔ ۲۱۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۱۹۔ عزیز اللہ خاں عزیز۔ نیر نگستان۔ ص۔ ۵۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۲۰۔ عزیز اللہ خاں عزیز۔ نیر نگستان۔ ص۔ ۱۲۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۲۱۔ عزیز لکھنوی میرؔ کا فارسی کلام۔ ص۔ ۱۳۔ ۱۱۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رامپور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۲۔ عزیز لکھنوی میرؔ کا فارسی کلام۔ ص۔ ۱۴۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رامپور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۳۔ عزیز لکھنوی میرؔ کا فارسی کلام۔ ص۔ ۱۴۔ رسالہ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رامپور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۴۔ مولانا سہا مجددی۔ میر تقی میرؔ اور ان کا کلام، ص۔ ۲۷۔ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۵۔ مولانا سہا مجددی۔ میر تقی میرؔ اور ان کا کلام، ص۔ ۲۹۔ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۶۔ مولانا سہا مجددی۔ میر تقی میرؔ اور ان کا کلام، ص۔ ۲۹۔ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۷۔ مولانا سہا مجددی۔ میر تقی میرؔ اور ان کا کلام، ص۔ ۳۲۔ نیرنگ میرؔ نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۸۔ مولانا سہا مجددی۔ میر تقی میر اور ان کا کلام، ص۔۳۲۔ نیرنگ میر نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور، جولائی ۱۹۲۸ء

۲۹۔ مولانا سہا مجددی۔ میر تقی میر اور ان کا کلام، ص۔۳۲۔ نیرنگ میر نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور، جولائی ۱۹۲۸ء

۳۰۔ مولانا سہا مجددی۔ میر تقی میر اور ان کا کلام، ص۔۳۶۔ نیرنگ میر نمبر مطبع سعیدی ریاست رام پور، جولائی ۱۹۲۸ء

۳۱۔ جعفر علی خاں اثر۔ گلشنِ میر۔ ص۔۷۲۔ رسالہ نیرنگ۔ میر نمبر۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۲۔ جعفر علی خاں اثر۔ گلشنِ میر۔ ص۔۷۳۔ رسالہ نیرنگ۔ میر نمبر۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۳۔ جعفر علی خاں اثر۔ گلشنِ میر۔ ص۔۹۱۔ رسالہ نیرنگ۔ میر نمبر۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۴۔ عشرت رحمانی رامپوری۔ خیابانِ میر۔ ص۔۱۱۵۔ رسالہ نیرنگ۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۵۔ عشرت رحمانی رامپوری۔ خیابانِ میر۔ ص۔۱۱۹۔ رسالہ نیرنگ۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۶۔ عشرت رحمانی رامپوری۔ خیابانِ میر۔ ص۔۱۲۰۔ رسالہ نیرنگ۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۷۔ عشرت رحمانی رامپوری۔ خیابانِ میر۔ ص۔۱۲۳۔ رسالہ نیرنگ۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۸۔ عشرت رحمانی رامپوری۔ خیابانِ میر۔ ص۔۱۲۴۔ رسالہ نیرنگ۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۳۹۔ عشرت رحمانی رامپوری۔ خیابانِ میر۔ ص۔۲۶۔۱۲۵۔ رسالہ نیرنگ۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۴۰۔ عشرت رحمانی رامپوری۔ خیابانِ میر۔ ص۔۱۲۹۔ رسالہ نیرنگ۔ مطبع سعیدی ریاست رام پور۔ جولائی ۱۹۲۸ء

۴۱۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ فیضِ میر۔ مقدمہ۔ ص۱۲۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۲۹ء

۴۲۔ مسعود الرحمٰن خاں ندوی۔ ''میر کے بہتر نشتر'' صفحہ۔۶ الٰہ آباد رام نرائن لال پبلشر اینڈ بک سیلر ۱۹۳۰ء

۴۳۔ سر شاہ محمد سلیمان۔ انتخاب مثنویات میر۔ تمہید۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۷ء

۴۴۔ سر شاہ محمد سلیمان۔ انتخاب مثنویات میر۔ تمہید۔ ص۔۳۶۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۷ء

۴۵۔ سر شاہ محمد سلیمان۔ انتخاب مثنویات میر۔ تمہید۔ ص۔۳۴۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۵۷ء

۴۶۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل ایم۔ اے عظیم آبادی۔ اشعار میر۔ ص۔۱۹۔ لالہ رام نرائن بک سیلر الٰہ آباد۔ ۱۹۵۳

۴۷۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل ایم۔ اے عظیم آبادی۔ اشعار میر۔ ص۔۲۱۔ لالہ رام نرائن بک سیلر الٰہ آباد۔ ۱۹۵۳

۴۸۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل ایم۔ اے عظیم آبادی۔ اشعار میر۔ ص۔۱۴۔۱۵۔ لالہ رام نرائن بک سیلر الٰہ آباد۔ ۱۹۵۳

۴۹۔ پروفیسر عبدالمنان بیدل ایم۔ اے عظیم آبادی۔ اشعار میر۔ ص۔۱۶۔ لالہ رام نرائن بک سیلر الٰہ آباد۔ ۱۹۵۳

۵۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ ''شعرِ شور انگیز'' جلد اوّل صفحہ ۴۲۔۳۱۔۳۰۔ ۱۹۹۰ء

۵۱۔ پروفیسر علامہ اشہر ایم۔ اے، مقدمہ ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری۔ فلسفۂ میر۔ ص۔ح۔ بار اوّل۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۵۲۔ صفدر آہ میر اور میریات پیش لفظ۔ ص۔۷۔ اجمل پریس بمبئی۔ جنوری ۱۹۷۲ء

۵۳۔ صفدر آہ، فلسفہ میر۔ ص۔۷۔ ۱۹۳۶ء

۵۴۔ شارب ردولوی (ڈاکٹر) مرتب گل صد رنگ۔ ص۔۲۸۔۲۷۔ تنویر پریس امین آباد لکھنؤ ۱۹۶۰ء

باب سوم

میرؔ کے اہم ترقی پسند ناقدین

مجنوں گورکھپوری	احتشام حسین
آل احمد سرور	سید اعجاز حسین
علی سردار جعفری	اختر اورینوی
محمد حسن	عبادت بریلوی
ظ۔ انصاری	شارب ردولوی

یوسف سرمست

اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ایک انقلابی تحریک تھی جس نے قدیم کلاسیکی روایات سے بغاوت کی اور اردو زبان وادب کا رشتہ زندگی اور سماج سے جوڑا، اب تک ادب مسرت آفرینی اور دلداری کا ذریعہ تھا۔ زندگی سے تعلق کا ذکر یا حالات کا تذکرہ غیر شعوری طور پر اشعار میں آجائے تو آجائے ورنہ ایسے تذکروں کو لوگ شاعری میں نظر انداز ہی کر دیتے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے پہلی بار شعوری طور پر سماجی حقیقت نگاری پر زور دیا اور صرف زور ہی نہیں دیا بلکہ ادب کو سماجی تبدیلی کے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔

ترقی پسند تحریک نے شعر وادب میں ایسی تمام چیزوں کو رد کر دیا جن کا تعلق خیال آرائی اور تصنع سے تھا یہاں تک کہ ایک زمانے میں غزل کی شدید مخالفت کی گئی جو مناسب بات نہیں تھی اور بعض ترقی پسند ناقدین نے اسے ناپسند بھی قرار دیا۔ لیکن اس سے ایک فائدہ ہوا کہ نظم گوئی کو فروغ ہوا اور نظم میں موضوع اور ہیئت کے تجربوں کے دروازے کھل گئے۔ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ایک طرف ترقی پسند تحریک قدامت پرستی، غزل اور قدیم روایات کو رد کر رہی تھی اور دوسری طرف میرؔ کی ازسرِ نو بازیافت کی کوشش کر رہی تھی۔ ترقی پسند ناقدین کی تحریروں نے میرؔ کو ایک نئے سیاق میں سمجھنے کی کوشش کی۔ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرورؔ اور دوسرے ترقی پسند ناقدین نے میرؔ پر مضامین لکھے۔ اور میرؔ کو سماجیاتی مطالعے اور عہد میرؔ کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ترقی پسند ناقدین کا تنقید میرؔ کے سلسلے میں یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔

کلام میرؔ کو عہدِ میرؔ کے سیاسی وسماجی پس منظر میں سمجھنے والے ناقدین میں سب سے پہلا نام مجنوں گورکھپوری کا ہے، حالانکہ مجنوں گورکھپوری نے میرؔ پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی مگر ان کے ذریعہ لکھے گئے دونوں مضامین نقدِ میرؔ کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں مجنوں نے میرؔ کے اشعار کی تشریح ترقی پسند نقطۂ نظر سے کی اور کلام میرؔ کو نئے مفہوم ومعنی دیئے۔ ان مضامین کے زیرِ اثر میرؔ کو ایک نئے انداز سے سمجھنے کا دور شروع ہوا۔

مجنوںؔ گورکھپوری (۱۹۰۴ء۔۱۹۸۸ء) کا پہلا مضمون ۱۹۳۵ء میں ''میراوران کی شاعری'' کے عنوان سے ''ایوان'' بابت جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۵ء تک ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز تو نہیں ہوا تھا مگر اس نے دستک دینی ضرور شروع کردی تھی، خود مجنوں اس وقت پورے طور پر ترقی پسند تحریک کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اپنے پہلے مضمون کے ابتدائی حصوں میں وہ میر کے کلام میں تاثیر اور سوز وگداز کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کیفیات عشق اور وارداتِ محبت کے بیان کا ذکر کرتے ہیں۔ میرؔ کے ایک شعر پر اظہار خیال کرتے ہوئے مجنوںؔ نے لکھا ہے:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

''خیال کی عمومیت پر نظر رکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر علاحدہ علاحدہ غور کیجیے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر کی تاثیر کا آخر راز کیا ہے؟ شاید ہی کوئی ایسا بدذوق اور بے حس ہو جس کی زبان سے اس شعر پر بے ساختہ واہ نہ نکل جائے لیکن پھر ایسا بھی کوئی نہیں جو یہ سمجھ اور سمجھا سکے کہ یہ شعر کیوں تیر کی طرح دل میں اتر گیا؟''[۱]

مجنوںؔ گورکھپوری صرف یہ سوال اٹھا کر خاموش نہیں ہوجاتے کہ آخر میرؔ کے اشعار کی تاثیر کا راز کیا ہے؟ یا پھر ان کے اشعار تیر کی طرح دل میں کیوں اتر جاتے ہیں؟ بلکہ اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ناکام ہونے پر اعتراف کرتے ہیں۔

''میرؔ کے کلام میں یہ اثر اور یہ سوز وگداز کہاں سے آیا؟ اس کی تشریح مشکل ہے۔ فنون لطیفہ اور بالخصوص شاعری، موسیقی، اور مصوری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور شاعری تو اپنے راز کو کبھی پوری طرح افشا نہیں ہونے دیتی۔ ہم لاکھ تجزیہ کریں، لاکھ نکتے نکالیں پھر بھی ہم واضح طور پر نہ خود جانتے ہیں اور نہ دوسروں کو بتا

سکتے ہیں کہ فلاں شعر ہم کو کیوں اچھا معلوم ہوتا ہے۔''۲

دراصل مجنوں کی یہ جستجو بغیر کسی سبب کے نہیں ہے۔ ان دونوں اقتباسات میں میرؔ کی شاعری میں تاثیر کا اقرار کرنے کے باوجود وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ آخر میرؔ کے کلام کی اس خوبی کا راز کیا ہے؟ شاید یہی بات انھیں بے چین کر رہی ہے، جس کے سبب اسی مضمون میں پھر لکھتے ہیں۔

> ''پھر بھی جہاں تک قیاس و تجزیہ کام کر سکتا ہے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہئے کہ میرؔ کے کلام میں یہ تاثیر کہاں سے آئی اور ان کی باتیں اس قدر دل نشیں کیوں ہوتی ہیں۔''۳

مجنوں کا بار بار یہ سوال کہ آخر میرؔ کی باتیں اس قدر دل نشیں کیوں ہیں؟ محض خیال نہیں ہے۔ وہ دراصل یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس سوال کے حل کے لیے ہمیں فن کار کی شخصیت اور اس کے ماحول تک رسائی ضروری ہے۔ انھیں اس بات کی شکایت رہی ہے کہ مشرق میں شاید یہ دستور کمیاب یا نایاب ہے کہ فنکار کی شخصیت اور اس کے خیالات وافکار کو اس کی زندگی کے واقعات اور اس کے ماحول کے موثرات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اور اس پر تنقید کی جائے۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے عرصے سے فکر و کاوش تھی اور اب بھی ہے کہ کسی طرح میرؔ کی زندگی کے وہ مخفی واقعات معلوم کیے جائیں جنھوں نے میر کو میر بنایا اور جن کی وجہ سے ان کی شاعری الہام والقا سے بالاتر چیز ہوگئی مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مجھے اپنی تحقیق وتفحص میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر بھی اتنا کہہ سکتا ہوں کہ غیر مربوط اور غیر منضبط طور پر چند ایسے واقعات کا پتہ لگتا ہے جن سے میرؔ کی زندگی پر بحیثیت مجموعی تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔''۴

ان کے خیال میں یہ اُردو کی بدنصیبی ہی ہے کہ اس میں تذکرہ نویسوں سے لے کر اس مضمون کے لکھے جانے تک شاعروں کی زندگی کے حالات پر خاص توجہ نہیں دی گئی۔ انسان جس ماحول اور جس جماعت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اس کا اثر اس کی تخلیقات پر

ضرور ہوتا ہے۔لہٰذا کسی شاعر کے کلام کو ہم اس وقت تک سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، جب تک کہ اس کے شاعرانہ شعور کے ارتقاء پر ہماری نظر نہ ہو۔ مجنوںؔ گورکھپوری کے خیال میں اگر ہم کسی شاعر کی گذشتہ زندگی سے واقف ہوں تو اس کی نفسیاتی گرہوں اور اس کی زندگی کے مخفی واردات تک کامیابی سے پہنچ سکتے ہیں۔ شاعر اپنے وقت میں کس طرح زندگی گزارتا رہا ہے، اس کے یہاں ٹھہراؤ ہے یا بے چینی و بے بسی و بے چارگی، وہ زندگی کے تئیں پر امید رویہ رکھتا ہے یا یاسیت و ناامیدی کا نمائندہ ہے، ان سب کا تعلق اس کے عہد اور زندگی سے ہے مجنوں جب میرؔ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو محسوس ہوتا ہے۔

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اضطراب کی باگ تھامے ہوئے ہے جو اگر کہیں مچل جائے تو نہ جانے کتنوں کو مٹا کر رکھ دے۔ میر کے اضطراب میں ایک سکون ہوتا ہے جو حاوی ہوتا ہے، ان کے سوز و گداز میں ایک گہرائی اور سنجیدگی ہوتی ہے جو غالب ہوتی ہے۔''۵

میرؔ کے اس سکون و اضطراب کے در پردہ کون سے حالات ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اختصار سے ان حالات کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً میر کا اکبر آباد چھوڑ کر جانا، سراج الدین علی خان آرزو کی بدسلوکی اور خود میرؔ کو چاند میں ایک لڑکی کا نظر آنا، ان سب واقعات کی عکاسی میرؔ کے اشعار میں ہوتی ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری کہ

> ''وہ ہو بہو وہی ہیں جو ان کی شاعری ہے انھوں نے اپنے ذاتی تجربات ومحسوسات کو اس قدر وسعت دے کر بیان کیا کہ وہ سارے عالم کے تجربات ومحسوسات ہو گئے۔ میرؔ نے ذاتی چیز کو کائناتی چیز بنا دیا۔''٦

''میر اور ان کی شاعری'' مجنوں کا پہلا مضمون ہے جس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ تو نہیں مگر مختصراً کچھ ایسے نکات ضرور اٹھائے ہیں جن سے کلامِ میرؔ کی تشریح کے لیے نئے باب وا ہوئے۔

مجنوںؔ گورکھپوری جب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور ان کا مضمون ''میر اور

ہم'' منظرِ عام پر آیا، اس وقت ''میرؔ اور ان کی شاعری'' میں زیرِ بحث لائی گئی باتوں کو بنیاد ملی۔ مضمون ''میر اور ہم'' نقدِ میر کے سلسلے میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ مجنوں اس مضمون میں ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور ترقی پسند تصورات کی روشنی میں میرؔ کا مطالعہ پیش کرتے ہیں اس تحریک کے مطابق ادب کو اجتماعیت کا ترجمان ہونا چاہئے اس لیے وہ اس مضمون کا عنوان بھی ''میر اور ہم'' رکھتے ہیں۔ اس ترکیب میں لفظ ''ہم'' بہت بامعنی ہے۔ یہ مضمون مطالعہ میر میں ایک انقلاب ہے۔ اس لیے بھی کہ مجنوں سے قبل مولوی عبدالحق تک سبھی نے میرؔ کو محض قنوطی شاعر سمجھا، مجنوں گورکھپوری نے پہلی مرتبہ اس مفروضہ کو رد کیا، مجنوں نے میرؔ کی شاعری کی تشریح و تعبیر کے لیے تاریخی سیاق و سباق سے واقفیت اور تاریخ اور فن پارے کے باہمی ربط کے تعین کو ضروری قرار دیا یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ مجنوں سے پہلے عبدالحق نے اس قسم کے اشارے ضرور کیے مگر وہ وضاحت سے اس کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے۔ جب کہ مجنوں نے ''میر اور ہم'' میں بڑی تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی۔

> ''میرؔ کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے، بہت ضروری ہے کہ ان کے زمانے کے معاشرتی ماحول اور ان کے اسباب و حالات پر جن کے اندر رہ کر میرؔ کی شخصیت کی تعمیر ہوئی مفصل نہ سہی مگر دقیق نظر ضرور ڈالی جائے۔ ہر شخص کی چاہے وہ کتنا ہی ادنیٰ اور ناقابلِ لحاظ کیوں نہ ہو دوہری تاریخ ہوتی ہے ایک تو شخصی اور دوسری معاشرتی یا اجتماعی۔ میرؔ کا زمانہ وہ تھا کہ جب سارے ملک میں مستقل تہلکہ مچا ہوا تھا اور دلی جو کہ ملک میں وہی حیثیت رکھتی تھی جو کہ جسم کے اندر دل رکھتا ہے۔ طرح طرح کے جاں گسل صدمے برداشت کر رہی تھی۔ آٹھ سو برس پرانی تہذیب کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور جو نظامِ معاشرت صدیوں سے مستحکم چلا آ رہا تھا اس کے تمام ستون جڑ چھوڑ چکے تھے۔ ڈگمگا رہے تھے اور کسی ایسے نظام کا جو صحت بخش اور امید افزا ہو دور تک پتہ نہیں تھا۔ دیس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تاراج پھیلا ہوا تھا جس سے صرف

> سمندر پار کی قومیں فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ اہلِ وطن پر ادبار چھایا ہوا تھا جو ہماری آئندہ غلامی کا پیش خیمہ تھا۔" یہ تھا میر کا زمانہ اور ماحول" ان تمام سماجی اور معاشرتی اور شخصی اور ذاتی حوادث کو سامنے رکھیے اور میر کی شاعری کا خاص کر ان کی غزلوں کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ میر کی آواز انتہائی شائستگی اور وقار کے ساتھ اپنے زمانے کے سارے کرب واضطراب کو ظاہر کررہی ہے۔"[7]

یعنی میر کی زندگی کے حالات ہر لحاظ سے تکالیف سے بھرپور تھے مگر اس کے باوجود میر نے صبر وضبط کا دامن نہیں چھوڑا، انھوں نے شخصی اور اجتماعی مصائب کا مقابلہ ہمت وحوصلے سے کیا اور اپنے پریشان کن حالات سے آزردہ نہیں ہوئے۔ بقول مجنوں گورکھپوری اگر میر قنوطی تھے؟ تو وہ ان حالات کا سامنا اس سلیقے سے کیسے کرسکتے تھے۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اس شعر کی تشریح مجنوں گورکھپوری نے ایک نئے انداز میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "ناکامیوں سے کام لینا ہر شخص کے دل گردے کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑی جری شخصیت کی ضرورت ہے اور یہ شعر پڑھ کر نا ممکن ہے کہ بزدل سے بزدل انقلابی اپنے اندر ایک نئی جرأت نہ محسوس کرنے لگے مگر اس شعر میں جرأت اور اعتماد کے علاوہ جو سب سے اہم رکن ہے وہ "سلیقہ" ہے۔ ناکامیوں اور نامرادیوں سے کام لینے اور تمام مزاحم اور مواقع کے باوجود اپنے کو مرکز پر قائم رکھنے کے لیے بڑے سلیقے کی ضرورت ہے۔ جو پھوہڑ، خودغرض اور بزدل انسان کی قسمت میں نہیں یہ سلیقے جواں مردوں اور صرف جواں مردوں کا حصہ ہے۔"[8]

اس شعر میں میر جہاں ایک سلیقے مند انسان نظر آتے ہیں وہیں وہ حوصلہ ہارنے کے بجائے تمام مشکلات سے روبرو ہونے کا درس بھی دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری مزید لکھتے ہیں:

''میر کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ یاس پرست تھے اوران کی شاعری پر قنوطیت چھائی ہوئی ہے وہ زندگی اور عشق دونوں کے حوصلے ہم سے چھین لیتے ہیں۔ مجھے اس رائے سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ میر اپنے دور کی بدحالی اور اپنے نجی سانحات سے بغاوت کی حد تک نا آسودہ تھے اور ان کے بیشتر اشعار پر اگر گہری نگاہ ڈالی جائے تو ان کے لہجے میں بغاوت کا ایک مہذب اور پر تمکنت احساس ملے گا۔

میر کے کلام میں تڑپنا اور تلملانا نہیں ہوتا۔ وہ خودداری اور سنجیدگی کے ساتھ بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ آلامِ عشق کا ذکر ہو یا آفاتِ روزگار ان کے اشعار میں جلی یا خفی طور پر یہ اشارہ ضرور پایا جاتا ہے کہ نامساعد حالات واسباب کا جان پر کھیل کر مقابلہ کرو چاہے مخالف قوتوں کے ہاتھوں تم مٹ ہی کیوں نہ جاؤ۔ ۹

مجنوں گورکھپوری کے خیال میں میر یاس پرست اور قنوطی نہیں تھے وہ ایک باحوصلہ انسان تھے جو مصیبتوں میں ہارنے کا نہیں ہمت وحوصلے کا درس دیتے ہیں ایسے شاعر کو ہم کیسے قنوطی قرار دے سکتے ہیں، نقدِ میر کے سلسلے میں مجنوں کے یہ خیالات یقیناً ایک اضافہ ہیں۔

اپنے مضمون کے آخر میں مجنوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ میر کو اگر ہم غم کا شاعر مان بھی لیں تب بھی وہ دوسرے شعراء کی طرح غم کے شکار یا زندگی سے بیزار نہیں ہوئے انھوں نے غم کو اپنی تقدیر مان کر اسے ایک نئی قوت میں تبدیل کر دیا اور ذاتی محرومیوں اور نامرادیوں کو بھلا کر زندگی جینے کی نئی راہیں تلاش کیں۔ وہ تمام مصائب وآلام میں سینہ تانے رکھنے اور سر اونچا رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں اور ہر حال میں سنجیدگی، توازن اور شائستگی قائم رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

لکھتے ہیں:

''میر نے غمِ عشق اور غمِ زندگی دونوں کو زندہ رہنے اور

مقابلہ کرنے کے تازہ دم حوصلے میں تبدیل کردیا۔ وہ درد کو ایک
سرور اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے ہیں وہ ہمارے لیے زندگی کی
ہستیوں کو بدل دیتے ہیں۔ میں نے یہ پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی
کہتا ہوں۔ اسی لیے ان کے کلام کے مطالعے سے وہ اثر پیدا ہوتا
ہے۔ جس کو مہذب اور رچی ہوئی مردانگی کہوں گا۔'' ۱۰

مجنوں گورکھپوری بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ میرؔ صرف قنوطی شاعر نہیں۔ یاس پرست نہیں اور اگر کوئی انھیں قنوطی سمجھتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے کلامِ میرؔ کا سطحی مطالعہ کیا ہے۔ مجنوں کا یہ مضمون نقدِ میرؔ کو ایک نئی سمت دیتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ

''میرے پہلے اور اس مضمون کو پڑھ کر کچھ لوگ تو خوش
ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ''میں نے میرؔ کی شاعری کی اصل روح کو
پالیا ہے اور ان کے شعروں میں غم کو نشاط بنانے کی تحریک پاتا ہوں،
مگر بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ میں نے خواہ مخواہ ایک یاس پرست
شاعر کو نشاطیہ شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے''۔ ۱۱

بہر حال یہ امر مسلمہ ہے کہ مجنوں گورکھپوری کے یہ دونوں مضامین کلامِ میرؔ کے مطالعہ کو ایک نئی جہت دیتے ہیں۔ وہ میرؔ جن کو از ابتدا تا عبدالحق صرف غم والم کا شاعر قرار دیا گیا۔ مجنوں گورکھپوری کے ان مضامین میں ایک نئے رنگ میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور وہ رنگ ہے ''مصیبت و پریشانی میں حوصلہ نہ کھونے والے انسان کا'' یہ نکتہ مجنوں گورکھپوری کے میرؔ کے متعلق مذکورہ دونوں مضامین کو تاریخی اہمیت کا حامل قرار دیتا ہے۔

احتشام حسین (۱۹۷۲ء۔۱۹۱۲ء) ترقی پسند تحریک کے نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ صفِ اول کے نقاد بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت اردو ادب کے لیے وجۂ افتخار ہے۔ میرؔ کے تعلق سے ان کا لکھا ہوا مقدمہ صرف رسمی نہیں ہے بلکہ انھوں نے میرؔ کو ایک نئے انداز نظر سے دیکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میرؔ کی کلیات پر لکھے گئے مقدمے میں احتشام حسین نے اجمالی طور پر سہی لیکن منفرد انداز میں میرؔ کی شاعری کے کئی اہم پہلوؤں پر

قدرے جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

احتشام حسین کا خیال ہے کہ میرؔ کی شاعری ان کی زندگی ہے۔ان کی تخلیق ان کی ذات سے اور ان کی شخصیت ان کے اشعار سے پہچانی جاتی ہے۔احتشام حسین کے خیال میں زندگی اور شاعری کا ربط جتنا حقیقی ہوگا اتنی ہی تیزی کے ساتھ قاری شاعر کے تجربے میں شریک ہوگا۔احتشام حسین میرؔ کی شخصیت کو ان کی شاعری سے اس حد تک ہم آہنگ محسوس کرتے ہیں کہ ان دونوں کے مابین کوئی خط فاصل نہیں کھینچا جا سکتا۔میرؔ کی زندگی ہمیشہ غم و اندوہ اور مایوسیوں سے عبارت رہی ہے ان کا عہد بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ایک طرف مغلیہ سلطنت کی بساط پلٹ رہی تھی تو دوسری طرف بیرونی حملوں اور آپسی خانہ جنگیوں سے ملک تباہ حال تھا۔احتشام حسین نے لکھا ہے:

''کوئی گہری نظر سے دیکھے تو یہ سب ان کے کلام میں مل سکتا ہے۔'' ۱۲

احتشام حسین کو ناقدین سے شکایت ہے کہ انھوں نے میرؔ کی زندگی اور شاعری کے مابین کوئی واضح ربط تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ میرؔ نے اپنی زندگی میں جتنے تجربے کیے کیا وہ سب بیکار گئے؟ کیا میرؔ نے ان سب کو شعر و غزل کے پیکروں میں ڈھال کر ہمیشہ کے لیے زندہ نہیں کر دیا؟ کیا یہ میرؔ جس کا ذکر ہوا اس میرؔ سے مختلف ہے جو خدائے سخن بن کر اپنے فن میں نمایاں ہوتا ہے اور جو دلی کے گلی کوچوں کی رونق اور بربادی کا مصور اور نوحہ خواں ہے؟ میرؔ کی زندگی اور اس عہد کے حالات کے متعلق احتشام حسین مزید لکھتے ہیں:

> ''میرؔ نے اپنی زندگی میں بہت سے سرد و گرم دیکھے۔ محبت کی جگہ غم و غصہ اور تلخی ملی۔کم عمری سے محنت کی، نہ جانے کتنی ملازمتیں کیں۔فوجی مہموں میں شریک رہے۔ نہ جانے کتنے بیرونی حملے اپنی آنکھوں سے دیکھے، سکھوں، جاٹوں اور میواتیوں کے جبر و ظلم کا مزہ چکھا، بے خانماں خراب ہو کر نہ جانے کہاں کہاں مارے پھرے''۔

احتشام حسین ذکرِ میرؔ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

میرؔ گوشہ نشین اور مردم بے زار شاعر نہیں ہیں۔اس نے

دوسرے شعراء کے برعکس زندگی کی خارجی کشمکش میں ایک اداکار کی حیثیت سے شرکت کی ہے اور عمر کا ایک حصہ دہلی سے دور مختلف مقامات پر گزارا ہے۔ سکون کی تلاش میں دہلی سے لکھنؤ آئے مگر اٹھائیس انتیس سال کرب مسلسل میں گزار کر اس نے پریشانی اور کشمکش میں اپنی جان دی۔''[۱۳]

احتشام حسین کا یہ مقدمہ ۱۹۷۱ء میں لکھا گیا جس میں انھوں نے اس امر کی شکایت کی ہے کہ ناقدین نے ''میر کی زندگی اور شاعری کے مابین کوئی واضح ربط تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟'' شاید احتشام حسین کی نظر سے مجنوں کے مضامین ''میر اور اُن کی شاعری'' اور ''میر اور ہم'' یا پھر علی سردار جعفری کی کتاب ''پیغمبرانِ سخن'' اور ''دیوانِ میر'' نہیں گزرے۔ یہ دونوں احتشام حسین کے مقدمے سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ مجنوں نے ''میر اور ہم'' میں میر کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ان کی زندگی کے مطالعے کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ اس سے قبل مجنوں گورکھپوری کے ان دونوں مضامین پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

احتشام حسین، میر کو زندگی کی کشمکش میں اداکاری کرنے والا ایک انسان قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں میر نے اپنے زمانے کے جتنے سرد و گرم دیکھے ان کو اپنی شاعری میں پیش کر دیا۔ انھوں نے اپنے نجی اور معاشرے کے رنج و غم کو اپنی شاعری بالخصوص غزل میں باہم آمیز کر دیا۔ میر کے اشعار صرف ان کے رنج و غم یا ذاتی زندگی کے ترجمان نہیں ہیں بلکہ ان کے عہد کی دلی کی دھڑکنیں بھی اس میں سنائی دیتی ہیں۔ وہ بے چینی، کرب و اضطراب جو میر کے عہد کا حصہ تھی اس کی تمام جھلکیاں میر کی شاعری میں موجود ہیں۔ بس میر نے وقت اور ماحول کی خارجی کشمکش کو داخلی علامات کے ذریعہ اور قلبی واردات کی شکل میں پیش کیا ہے مگر ان کا ربط زندگی کے خارجی ماحول سے بہت گہرا ہے اور بقول احتشام حسین دل کی دنیا خارج کی دنیا سے یکسر الگ نہیں ہو سکتی، اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ میر اپنے عہد سے ماوراء تھے تو ممکن نہیں، کوئی بھی حساس شاعر اپنے دل اور خارج کی دنیا سے الگ نہیں ہو سکتا۔ لکھتے ہیں:

''میر خارج اور باطن کی دنیا میں ایک ربط قائم کرنا

چاہتے ہیں اور یہی جدوجہد، کشمکش اور کوشش ان کے کلام میں نادر اور فنکارانہ اظہار کی صورت میں سامنے آتی ہے اور یہی چیز انھیں غیر معمولی شاعر بناتی ہے۔''[۱۴]

بقول احتشام حسین عام طور سے میر کا قاری انھیں ایک نازک طبع شخص پریشان فکر یا پھر ناکام عاشق سمجھتا ہے مگر یہ میر کا ظاہری روپ ہے ان کی قنوطیت اور نازک مزاجی میں احساسات وشعور کے تمام گوشے شامل نہیں ہیں مغلیہ عہد کی بے چینیوں، اضطراب اور زندگی کی جس تہذیبی کشمکش کو مورخ اپنی گرفت میں نہ لاسکے، شعراء نے اپنے کلام میں اس عہد کی تمام کشمکش کو سمیٹ لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''جہاں اس عہد کی تاریخیں گونگی ہیں، وہاں شاعروں کی آواز چیخ بن کر اس صورتِ حال کی طرف متوجہ کررہی ہے''[۱۵]

احتشام حسین تمام شعراء کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں مگر میر کا کلیات اس دعوے کا کھلا ثبوت ہے۔ میر کے اشعار صرف ان کے نجی دکھ، تکلیف اور غم کے عکاس نہیں ہیں بلکہ اس پورے عہد کے مسائل ان میں ہیں، میر کی آواز میں وقت کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

احتشام حسین نے لکھا ہے:

''میر ایک پیچیدہ شخصیت کے مالک ہیں ان کا کلام/فن زندگی کے گہرے شعور کا نتیجہ ہے۔ میر اتنی پریشان خاطری کے باوجود ایک شخصیت اور کردار کے مالک ہیں جس کا عکس ان کے جذبات اور خیالات پر نظر آتا ہے۔ اپنی شاعری میں بہ یک وقت تنہا بھی ہیں، لوگوں میں شامل بھی، موت سے ہم کنار بھی ہیں، زندگی کے شیدائی بھی، انسان سے بدگمان بھی ہیں اس کی عظمت کے قائل بھی، مجبوریٔ حیات کے شاکی بھی ہیں، اختیار کے طلب گار بھی، پاسِ وضع کے گرویدہ بھی ہیں، سرمست بھی، حاجت مند بھی ہیں، گدائے متکبر بھی مجنوں شعار بھی ہیں، مردِ معقول بھی ہیں، ایسی شخصیت جب رمز و ایما میں گفتگو کرے گی تو یقیناً اس کا ہر

سخن رمز اور اس کا ہر شعر زلف کی طرح پیچدار ہوگا۔''[۱۶]

احتشام حسین نے میرؔ کی شخصیت کا رشتہ ان کی شاعری سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ جس شاعر کی شخصیت اتنی تہہ دار ہوگی۔ جس کی زندگی اتنی کشمکش اور پریشان خاطری کا شکار ہوگی اس کے کلام میں سادگی کا عنصر تلاش کرنا کیسے ممکن ہے۔ جس طرح میرؔ کی شخصیت ظاہر و باطنی طور سے پردوں میں پوشیدہ ہے اسی طرح ان کی شاعری بھی تہہ دار اور پیچیدہ ہے۔

احتشام حسین نے حالانکہ میرؔ پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی مگر انھوں نے اپنے مختصر سے مقدمے میں ہی اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ نقدِ میرؔ پر لکھتے وقت اس مقدمہ کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ ایک طرف جہاں وہ میرؔ کی شخصیت اور شاعری کو ہم آہنگ کرتے ہیں وہیں دوسری طرف وہ میرؔ کے سماجی حالات، ان کی ضرورت، ان کے مسائل اور مصائب ان کی خوشیوں اور مسرتوں اور غموں اور دکھوں کو اہمیت دیتے ہیں اور انھیں کے حوالہ سے میرؔ کے کلام کی جہات کا تعین کرتے ہیں ان کے خیال میں میر اپنے عہد اور سماج کی جڑوں سے اس حد تک جڑے ہوئے ہیں کہ انھیں ان کے عہد سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں ان کا کلام ان کی ذات سے، ہم آہنگ ہے اور ان کی ذات ان کے سماج سے۔

احتشام حسین ادب کو سماجی، تاریخی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا آئینہ سمجھ کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ادب کا مقصد ان کے نزدیک اجتماعی اور سماجی ہے جو زندگی کو فلاح و بہبود، حسن و مسرت اور دلکش و شادمانی عطا کرنے کے لیے ہیں اسی لیے ان کی تنقید کو سائنٹفک تنقید کا نام دینا درست ہوگا۔ وہ اپنے اسی نقطۂ نظر کے سبب میر کی اس انسان کی تلاش کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو زندگی کی قدروں سے واقف ہو جسے محبت نے جلا جلا کر اکسیر کر دیا ہو۔ جو زندگی کے تصادمات کو جنگ و جدل سے نہیں صلح و محبت سے حل کر سکتا ہو۔ لکھتے ہیں:

> ''آج کی دنیا کو بھی ایسے ہی انسان کی ضرورت ہے خود
> اپنا ملک پریشان خیالی، تعصبات اور خود غرضانہ مفاد کا شکار ہے،
> مذہب کے نام پر انسانی شرف کا خون ہو رہا ہے۔ مادی حیثیت

> سے ترقی اور بقا کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ۔ جسمانی ذہنی اور جذباتی تشدد انھیں بیکار بتا رہا ہے، پوری قوم ایک نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے جس میں اپنے فائدے سے زیادہ دوسرے کو نقصان پہنچانے کا جذبہ کارفرما ہے۔ گویا میرؔ کو جس قلب و ذہن کی جستجو تھی وہ اب تک خال خال ہی نظر آیا ہے۔ جستجو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ اجتماعی طور پر، خودداری، استغنا اور فقر و غیور کے ساتھ ساتھ باہمی اتحاد دوسروں کے جذبات کا احترام اور محبت کی بنیاد پر قصرِ حیات کی تعمیر ۔۔۔۔۔۔ یہ تھے میرؔ کے تصورات اور یہی آج کے انسان کو بھی بہت سی انفرادی اور اجتماعی مصیبتوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔" [۱۷]

اس اقتباس میں احتشام حسین نے میرؔ کی خودداری، استغناء اور فقر و غیور کے علاوہ باہمی اتحاد، دوسروں کے جذبات کا احترام اور محبت کرنے والی خصوصیات کا ذکر کیا ہے یعنی جن تصورات پر میر نے زندگی کی بنیاد رکھی تھی، وہی آج کے انسان کی بھی ضرورت ہیں۔ آج ہم اسی لیے بے چین و مضطرب ہیں کہ ان خصوصیات سے ہمارے دل خالی ہیں۔ بہر حال احتشام حسین کا یہ مقدمہ نقدِ میر کے سلسلے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔

آل احمد سرور (۲۰۰۲ء۔۱۹۱۱ء) ہمارے بزرگ دانشور و نقاد ہیں، ابتداء میں وہ ترقی پسند تنقیدی نظریات سے متاثر تھے مگر بعد میں وہ جدید تنقید کی طرف مائل ہوئے۔ آل احمد سرور عظیم نقاد ہونے کے ساتھ عظیم المرتبت شخصیت کے بھی مالک ہیں۔ لہٰذا وہ چاہے ابتداء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر رہے ہوں اور بعد میں دوسری تحریکوں سے وابستہ ہو گئے ہوں، اس بات سے ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اسی لیے نقدِ میرؔ کے سلسلے میں ہم نے انھیں ترقی پسند ناقدین کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ میرؔ پر انھوں نے دو مضمون لکھے۔ "میر کے مطالعہ کی اہمیت" اور "میر میری نظر میں"۔ آل احمد سرور نے اپنے مضمون "اردو غزل میرؔ سے اقبالؔ تک" میں بھی میرؔ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"میر کے مطالعہ کی اہمیت" میں میر کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے آلِ احمد سرور کسی بھی شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کے حالات سے واقفیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

> "کسی شاعر پر تنقید کے لیے سب سے اہم تو اس کا کلام ہے لیکن اس کے علاوہ شاعر کے حالاتِ زندگی، اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو، اس کے ماحول، اس سے پہلے کے شاعری کے اسالیب سب کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔" ۱۸

مگر اس کے ساتھ ہی آلِ احمد سرور ڈاکٹر جانسن کے قول کے ساتھ ایک اہم نکتہ کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں:

> "ڈاکٹر جانسن کا یہ خیال اگرچہ غلط نہیں ہے کہ زمانہ کسی شاعر کو یوں ہی اہم قرار نہیں دیتا مگر اسے آنکھ بند کر کے تسلیم کرنے سے فکر کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور تنقید میں ایک تقلیدی رنگ آ جاتا ہے جو ادب کی ترقی کے لیے مضر ہے اس لیے میر کی مسلمہ عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی ہمارا فرض یہ ہے کہ تنقید کے ان جامع اصولوں کی روشنی میں جو دورِ حاضر کا عطیہ ہیں ہم میر کو پرکھنے کی اور اس طریقے سے اپنے تنقیدی معیاروں کو پرکھنے کی برابر کوشش کرتے رہیں"۔ ۱۹

آلِ احمد سرور اپنے اس مضمون میں ایک طرف تو شاعر کے کلام کے ساتھ اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو، ماحول اور حالاتِ زندگی کو ذہن میں رکھنے پر زور دیتے ہیں، وہیں دوسری طرف وہ شاعر کو عہد حاضر کے تنقیدی اصولوں کے تحت پرکھنے کی بات کرتے ہیں۔ غالباً وہ کلام میر کا جائزہ ہر اعتبار سے لینا چاہتے ہیں اسی لیے کبھی میر کے حالات، کبھی ان کی شخصیت، ان کی شاعری کے اسالیب، اور کبھی دورِ حاضر کے تنقیدی معیاروں پر کلامِ میر کو پرکھنے پر زور دیتے ہیں۔

ان کے خیال میں میر پر خواجہ فاروقی کی کتاب اور سید عبداللہ کی نقدِ میر کے علاوہ کوئی تفصیلی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جس کو ہم بنیادی قرار دے سکیں۔ لہٰذا میر کے متعلق جو بہت

سی باتیں بغیر سوچے سمجھے تسلیم کرلی گئی ہیں، ہمیں ان کے حوالے ذکر میر سے مل سکتے ہیں۔ میر کے حالات کس حد تک ان کے بیان کے مطابق سچ ہیں، اس کا بھی بھروسہ کرنا درست نہیں معلوم ہوتا میر کے بیانات کے سچ کا ثبوت اس دور کے تذکروں، تاریخوں سے ضرور لینا چاہئے۔ میر کے والد کی بزرگی، ان کا بچپن، اکبرآباد کی زندگی دیوانگی، پھر دہلی سے لکھنؤ کو ہجرت یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر تحقیق کی جانی ضروری ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ:

> ''میر کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ ابھی نہیں کیا گیا ہے لیکن اگر ہم موجودہ معلومات کو تقلید کی روش یا اجتہاد کے جذبے سے بلند ہوکر پرکھیں تو میر کی زندگی اور ان کی شخصیت کے متعلق چند موٹی موٹی باتیں ضرور کہہ سکتے ہیں۔'' ۲۰

اپنی بات کی وضاحت میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''میر کی شاعری پر ان کے حالات کا زبردست اثر ہوا۔ خانِ آرزو سے تعلقات ختم ہونا، بے سہارا زندگی گزارنا، دیوانگی کا دورہ، باپ کے اخلاقی اور متصوفانہ تصورات، ان سب سے میر متاثر ہوئے۔''

مختلف عہد کے تنقیدی رویوں کا جائزہ لینے کے بعد آلِ احمد سرور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''میر اس لیے بڑے شاعر نہیں ہیں کہ وہ ماحول کے مصور ہیں۔ وہ اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کے اشعار اس بھرپور احساس سے لبریز ہیں جو زندگی کی گہری بصیرت سے حاصل ہوتا ہے جو واقعات اور حالات کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ ان کے پیچھے جو ذہنی دنیا ہے اس کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیتا ہے''۔ ۲۱

آل احمد سرور میر کو ایک ایسا شاعر قرار دیتے ہیں جس نے صرف ماحول کی تصویر کشی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ زندگی کی بصیرت سے حاصل کیے ہوئے احساسات، واقعات و حالات کے پیچھے پوشیدہ ذہنی دنیا کو ہمارے سامنے پیش کردیا۔ میر کی شاعری ہمیں زندگی سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ سرور مزید لکھتے ہیں:

''میر کے مطالعہ میں ہمیں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ہے کہ انھیں
کے ذریعہ سے ہم اس دور کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ سکتے ہیں
اس محشر جذبات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو ہماری تہذیبی بساط پر
رونما ہوا تھا۔ میر اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کی کرن نہ صرف
ماضی کے دھندلکے کو چیر کر ہمیں ایک جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی
ہے بلکہ ان کی یہ تصویر ہمارے حال اور مستقبل دونوں ہی میں
رہبری اور رہنمائی کر سکتی ہے۔ میر کی رفاقت سے ہم اسی لیے کسی
دور میں منہ موڑ کر نہیں بیٹھ سکتے۔''۲۲

آل احمد سرور اپنے اس اقتباس میں میرؔ کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس پورے عہد کی تصویر میر کی شاعری کے ذریعہ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اور یہ تصویر ہمارے حال اور مستقبل کی بھی رہنما ہے۔ اسی لیے وہ میرؔ کی شاعری کو ہمارا عظیم سرمایہ قرار دیتے ہیں۔

''میر کی شاعری اس لیے بھی ہماری بہت بڑی دولت
ہے کہ ان کے یہاں ہمارے تینوں تہذیبی ادارے، بازار، خانقاہ
اور دربار اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ اس دور کی تمام سماجی
حقیقتیں اس نگار خانہ میں جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔''۲۳

آل احمد سرور کے نزدیک نشتریت سادگی، قنوطیت سوز و گداز جیسے الفاظ میرؔ کی پوری ترجمانی نہیں کرتے، ان لفظوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے مگر ہم اس سے میر کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان کے خیال میں ''وہ (میر) یاس و حرماں کے ترجمان ہوتے ہوئے بھی قنوطی نہیں کہے جا سکتے''۔ اس لیے ادب کے طالب علم کو میرؔ کی نفسیات اس عہد کی تاریخ اور اس عہد کی تہذیب سے ضرور آشنا ہونا چاہئے۔

دوسرے مضمون ''میر میری نظر میں'' میں آلِ احمد سرور کا نظریہ تنقید مختلف ہو جاتا ہے۔ اب تک انھوں نے میر کی شاعری میں سماجی عناصر کی طرف توجہ کی تھی مگر ''میر میری نظر میں'' وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری میں صرف سماجی مطالعے یا بدحالی کی تصویر دیکھنا درست

نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کے مطالعے میں نقاد کو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ میرؔ نے اپنے دور کے سماج کی بدحالی کی تصویر کس طرح کھینچی ہے، اور نہ صرف اس پر بس کرنا چاہئے کہ میرؔ نے الفاظ کا استعمال کس طرح کیا ہے، بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ میرؔ کی داستان کیا ہے، اشاروں اشاروں میں وہ کیا کہہ رہے ہیں، اور کس طرح کہہ رہے ہیں ان کی بات کیا سنی سنائی یا لادی ہوئی بات ہے یا اوپری ہے یا دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔۔۔۔۔ کس ادبی روایت سے اس کا تعلق ہے اور پھر یہ بھی کہ ان کے بعد بات کہنے کے جو انداز آئے ہیں، ان کی موجودگی میں میرؔ کی بات اب کیسی لگتی ہے؟ میرؔ کے معاصرین میں میرؔ کا کیا مقام ہے؟ میرؔ کے بعد آنے والوں کے لیے میرؔ کیا معنی رکھتے تھے؟ اور آج میرؔ کتنے زندہ، کتنے شاداب، کتنے دلوں میں سرایت کرنے والے، کتنے ذہنوں پر حکومت کرنے والے ہیں۔ اگر میرؔ کی جگہ صرف الماری میں سب سے اونچی جگہ ایک مقدس نشان کی طرح ہے تو پھر میرؔ کی صرف تاریخی حیثیت ہے اور اگر آج بھی وہ شور انگیز اور ہنگامہ گرم کن ہیں تو پھر ہمیں وہ پرانے ہوتے ہوئے اپنے اور نئے اور ہم عصر محسوس ہوتے ہیں، تو پھر ان کی اہمیت، عظمت اور معنویت مسلم ہے۔''[۲۴]

اس اقتباس میں آلِ احمد سرور نے تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرؔ کے مطالعے میں ان کے نقاد کو میرؔ کی شاعری میں صرف ان کے سماج کی بدحالی کی تصویر یا الفاظ کا استعمال نہیں دیکھنا چاہئے۔ بلکہ اسے میرؔ کی داستان پر نظر رکھنی چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، اور کس طرح کہہ رہے ہیں، ان کی بات سنی سنائی ہے یا دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔ میرؔ کے معاصرین، بعد میں آنے والوں کو میرؔ کی بات کیسی لگتی ہے اور اگر میرؔ ہمیں اپنے

ہم عصر معلوم ہوں تو ان کی اہمیت و معنویت مسلم ہے دراصل آل احمد سرور میرؔ کے کلام میں ان تمام خوبیوں کی تلاش کرتے ہیں جو کسی فنکار کو آفاقیت کا درجہ عطا کرتی ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ ''بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو ہر دور میں اپنا معلوم ہو۔ جس کے کلام میں نئی نئی جہتیں برابر دریافت کی جاسکتی ہیں۔''

میر یقیناً ایسا ہی شاعر ہے۔ جس کے یہاں سماج کی حقیقی عکاسی کے ساتھ الفاظ کا انتخاب بھی خوب ہے وہ جس قدر اپنے زمانے میں مقبول تھا، اتنا ہی اپنے بعد آنے والے دور میں اور ہمارے اپنے دور میں بھی مقبول ہے۔ اس کے کلام میں آج بھی نئی نئی جہتیں دریافت کی جارہی ہیں جو اس کی عظمت کی دلیل ہیں۔

آل احمد سرور حالانکہ ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر میرؔ کے کلام میں ان کے عہد کی نشاندہی پر اصرار تو ضرور کرتے ہیں مگر بعد میں وہ میرؔ کو ایک ایسے شاعر کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں جس کے کلام میں نئی نئی جہتیں موجود ہیں جو اسے ہر دور میں عظیم بناتی ہیں حالانکہ وہ اس بات کے حامی نہیں ہیں کہ ہم ان کی تقلید کریں مگر ان کو سمجھنا ہمارے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔

آل احمد سرور بھلے ہی میرؔ کو ہر عہد کا شاعر قرار دیں مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ میرؔ کی شاعری کو ہم ان کے عہد سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ آل احمد سرور نے اپنے مضمون ''میرؔ کے مطالعہ کی اہمیت میں ترقی پسند ناقدین پر اعتراض بھی کیا ہے کہ ابتدا میں انھوں نے میرؔ کو نظر انداز کیا مگر بعد میں ان کے یہاں کلاسیکی روایت کا احترام آیا۔ آل احمد سرور نے خود اپنی تنقید کا آغاز ترقی پسند نقطۂ نظر کی ہمنوائی سے کیا تھا، جدیدیت کے شروع ہونے پر وہ اس کے ہمنواؤں میں شامل ہو گئے، اس لیے ان کی تحریروں میں کہیں کہیں پر ترقی پسندوں پر پھبتیاں بھی مل جاتے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ خود کو ترقی پسند تنقیدی تصورات سے بالکل الگ نہیں کر پائے، یہی وجہ ہے کہ میرؔ پر لکھتے وقت بھی وہ ان کی شاعری کو اس لیے ہماری بہت بڑی دولت قرار دیتے ہیں کہ ''اس دور کی تمام سماجی حقیقتیں اس نگار خانہ میں جلوہ گر ہو جاتی ہیں''۔ لہٰذا ترقی پسندوں کا اور خود آل احمد سرور کا میرؔ کو ان کے عہد سے ہم آہنگ کرنا ہمیشہ اہم مانا جائے گا۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین (۱۹۷۵ء۔۱۸۹۸ء) کا شمار اہم ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے انھوں نے میرؔ کی شاعری پر براہِ راست تو غالباً کوئی مضمون نہیں لکھا مگر ان کی کتاب ''اُردو شاعری کا سماجی پس منظر'' میں میرؔ کا ذکر ضرور ملتا ہے۔

اعجاز حسین لکھتے ہیں:

''دہلی کی تباہی جو نادر شاہ اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی، اس کے دیکھنے والوں میں میرؔ و سوداؔ دونوں تھے۔ سیاسی عمل وردِ عمل کے اثرات ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ مصیبت اٹھانے والوں میں میرؔ بھی کسی سے کم ستم زدہ نہ تھے۔ ان پر جو جو آفتیں اس زمانہ میں آئیں اس کی روداد تو اُن کی خود نوشت سوانح عمری میں دیکھیے۔۔۔۔۔ میرؔ نے۔۔۔۔ اپنے عہد کی خستہ حالی، ملک کی بربادی، لوگوں کی بداخلاقی کی تصویریں زیادہ خوبصورتی و پُرکاری سے غزلوں میں پیش کیں۔ جن کو دیکھ کر اس وقت کے معاشرے کے ذہنی رُجحان کا اندازہ زیادہ مشکل نہیں۔'' ۲۵

اِن مختصر سے اقتباسات میں سید اعجاز حسین نے بڑے خوبصورت انداز میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ میرؔ نے اپنے عہد کے خونریز واقعات و حادثات، سیاسی عمل و ردِ عمل اور پریشانیوں کی روداد صرف نثر میں ہی رقم نہیں کی بلکہ میرؔ کی شاعری ان کے عہد کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اعجاز حسین نے میرؔ کی غزلوں سے ایسے اشعار بھی منتخب کیے ہیں جن میں میرؔ اپنے زمانے کی دہلی کی بربادی پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں، وہ دتی جو ان کی امید کے خلاف ان کی زندگی میں پھر آباد نہ ہو سکی اور جس کے دردناک اور تکلیف دہ مناظر نے ان کو زندگی بھر مضطرب و بے چین رکھا۔

بہت کم الفاظ میں اعجاز حسین نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ میرؔ کی شاعری میں ہم ان کے عہد کی واضح اور صاف تصویر دیکھ سکتے ہیں۔

علی سردار جعفری (۲۰۰۰ء۔۱۹۱۳ء) نقدِ میرؔ کے سلسلے کے اہم نقاد

ہیں ۔ ان کی کتاب پیغمبرانِ سخن فروری ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی ۔ کتاب میں شامل میرؔ کی شاعری پر ان کا مضمون سب سے پہلے رسالہ شاعر میں ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد جب علی سردار جعفری نے ''دیوان میر'' شائع کیا تو یہی مضمون دیوان کے دیباچے کے طور پر اس میں شامل ہے۔ مجنوں اور احتشام حسین کی طرح علی سردار جعفری بھی ترقی پسند نقطۂ نظر کی روشنی میں کلام میر کا مطالعہ کرتے ہیں اور میرؔ کی شعری اہمیت کو عہدِ میر کے سیاسی اور سماجی ماحول میں تلاش کرتے ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

> ''میں جس نظریۂ جمال اور نظریۂ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گزشتہ تیس سال میں رچ بس چکا ہے، میں نے اسی نظریے سے ان بزرگ شعراء کے کلام پر نظر ڈالی۔ یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے۔ وقت کی وہ روانی جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک بہتے ہوئے دریا کی شکل میں پیش کرتی ہے اس کی موجوں میں شعر و فن بھی شامل ہے۔۔۔۔۔۔ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔''[۲۶]

اس طرح علی سردار جعفری نے اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت شروع ہی میں کردی ہے۔ ترقی پسند ناقدین کا عام طور پر یہی نظریہ ہے اور انھوں نے قدیم و جدید شعراء کو ان کے عصری اور زمانی سیاق میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ علی سردار جعفری نے میرؔ کے مطالعہ کے چار عنوانات قائم کیے ہیں۔

(۱) تمہید

(۲) افسانہ

(۳) حقیقت

(۴) شاعری

میرؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے علی سردار جعفری ان کو خدائے سخن کہتے ہیں،

ان کے خیال میں غالب اور اقبالؔ عظیم شاعر ضرور ہیں مگر میر کی استادانہ حیثیت مسلم ہے ہر بڑے شاعر نے میر کی شاعرانہ عظمت اور میر سے اثر پذیری کا اعتراف کیا ہے۔

میر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے سردار جعفری نے اس امر پر اصرار کیا ہے کہ میرؔ کی شاعری عہد سے مربوط بھی ہے اور عہد سے ماوراء بھی ہے یہ ابدیت میر کی شاعرانہ عظمت کا ایک بڑا ثبوت ہے لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے
کہ پورے دوسو برس بعد جب ۱۹۴۷ء میں دہلی ایک بار پھر خون
کی ہولی میں نہائی اور پنجاب اور دہلی کی سرزمین پر ہندو مسلم سکھ
فسادات نے نادر شاہی قتل عام اور احمد شاہی لوٹ کھسوٹ کی یاد
تازہ کردی تو اُردو کے جدید تر نوجوان شاعروں نے غالب،
اقبالؔ اور جوشؔ کا دامن چھوڑ کر میرؔ کے دامن میں پناہ لی۔" ۲۷

۱۹۴۷ء اور میر کے عہد میں ایک طویل فاصلہ ہے، خود جعفری نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی پورے دوسو برس۔ اس دوسو برس بعد بھی اگر میرؔ کی شاعری دوسرے شعراء کو اپنے دامن میں پناہ دیتی ہے تو یہ میر کا زبردست کارنامہ ہے۔ جعفری نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"عظیم شاعری صدیاں گزر جانے اور حالات تبدیل
ہو جانے اور زبان کے انداز بدل جانے کے بعد بھی ہماری تسکین
کا باعث ہوتی ہے۔۔۔۔۔ خود میر نے بار بار یہ بتایا ہے کہ ان
کی شاعری ان کے عہد کی ترجمان ہے۔" ۲۸

میرؔ اپنے اشعار میں بار بار دہراتے ہیں کہ ان کا دیوان صرف ان تک محدود نہیں ہے بلکہ سارے زمانے کے درد و غم کا مجموعہ ہے۔

میر کا دیوان "درہمی و پریشانی" کا مجموعہ ہے یہ "درہمی و پریشانی" میرؔ کے عہد کی ہی ہوسکتی ہے۔ جعفری نے اپنی بات کی وضاحت اس اقتباس میں بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔

"۔۔۔۔۔ انھوں نے غزل کو اس اعتبار سے آلودہ

> کردیا کہ حسن و عشق کے موضوعات تنقید حیات کے موضوعات
> سے گھل مل گئے، اس کی طرح پڑ چکی تھی لیکن میرؔ نے اس کو جتنی
> وسعت دیدی اتنی کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی
> اس طرح میر نے غزل کو اپنے عہد کا آئینہ بنادیا۔ اس شاعری پر
> سیاسی اور سماجی حالات کی پوری دھوپ پڑرہی ہے۔" ۲۹

"حقیقت" عنوان کے تحت علی سردار جعفری میرؔ کی زندگی میں پیش آنے والے ان حالات کا ذکر کرتے ہیں جن کا سامنا میر نے زبردست ہمت و حوصلے کے ساتھ کیا دراصل اس حصے میں انھوں نے "ذکرِ میرؔ" سے ان واقعات کو نقل کیا ہے۔ جنھوں نے کلامِ میر پر گہرے نقش ثبت کیے۔ میر کا بچپن تلاشِ معاش میں گزرا، والد کے ایک مربی امیر الامراء صمصام الدولہ بھی طویل عرصہ تک ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ تلاش معاش نے دوبارہ دلّی جانے پر مجبور کردیا مگر میر کا دل اس بار کہیں لگ چکا تھا۔

آگرے اور محبوب سے جدائی نے میر کے دل میں غم عشق اور غم روزگار دونوں کی آگ کو بھڑکادیا اور بقول جعفری "دونوں غم اس طرح گھل مل گئے تھے کہ پھر عمر بھر پتہ نہ چلا کہ میرؔ نے اپنے شعر میں کون ساغم پیش کیا" مگر میرؔ کے دوبارہ دہلی پہنچنے تک دلی نادر شاہی حملے میں فقیر ہوچکی تھی، میر کچھ روز اپنے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں رہے۔ ۱۷۴۸ء میں وہ رعایت خاں کے مصاحب ہوگئے مگر یہ مصاحبت تھوڑے ہی عرصے قائم رہی کیونکہ اس دور کی دلّی کی بنیادوں میں طوفان چھپے ہوئے تھے۔ یہ دور مغل سلطنت کے زوال اور خانہ جنگیوں کا تھا۔ پہلے سے کمزور دلّی کو نادر شاہی حملوں نے اور کمزور کردیا۔ صوبے داروں کی بغاوت نے مزید تباہی لادی۔ چاروں طرف افلاس کا عالم تھا، شہزادے اور شہزادیاں تک فاقے کا شکار تھے۔ اسی تباہ حالی میں مغربی سرحدوں کی طرف سے احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوگئے جن کا سلسلہ ۱۷۴۸ء سے تقریباً بیس برس تک جاری رہا۔ ان متواتر حملوں اور خانہ جنگیوں سے دلّی ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ پھر ڈیڑھ دو سو برس تک آباد نہ ہوسکی۔ کتنے ہی ہنگامے میرؔ کی آنکھوں کے سامنے بھی ہوئے اور کتنی ہی بار موجِ خون دہلی کے سر سے گزر گئی میرؔ خود بھی بہت سی لڑائیوں میں ہاتھ میں تلوار لے کر گئے، انھوں نے فتح

سے زیادہ شکست دیکھی احمد شاہ ابدالی کے پہلے حملے کے وقت میر ۱۷۴۸ء میں رعایت خاں کے ساتھ لاہور میں موجود تھے اور پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۷۶۱ء کے تماشائی بھی تھے۔ اسی لڑائی میں میرؔ کا گھر بھی تباہ ہوا۔ علی سردار جعفری نے لکھا ہے:

> ''اس عہد کے مالی نقصان اور اخلاقی پستی کی اندوہناک تصویریں میرؔ کی شاعری اور آپ بیتی ''ذکرِ میرؔ'' میں محفوظ ہیں۔''[۳۰]

وہ ''ذکرِ میر'' سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جب میرؔ اچانک اس محلے میں جا نکلتے ہیں جہاں انھوں نے کبھی ایک بارونق زندگی دیکھی تھی مگر احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد وہاں کی حالت میرؔ کی زبانی سنئے۔

> ''ناگاہ اس محلے میں آ نکلا۔ جہاں میں ۔۔۔۔۔۔ لمبی لمبی زلفوں والوں کے ساتھ رہتا تھا ۔۔۔۔۔ اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کر لیتا ۔۔۔۔۔۔ اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آ کھڑا ہوا اور حیرت سے دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ اب ادھر نہ آؤں گا۔ اور جب تک زندہ رہوں گا شہر کا قصد نہ کروں گا۔''[۳۱]

دہلی کی اس تباہی اور بربادی کا شکار عام لوگوں کے ساتھ ساتھ میرؔ کے سرپرست امیر بھی ہوئے۔ ان تلخ تجربات کا عکس میرؔ کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔

کس طرح آہ خاکِ مذلت سے میں اُٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو
تو ہے بے چارہ گدا میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

احمد شاہ بادشاہ کا ۱۷۵۴ء میں اندھا کیا جانا اور پھر اس کی جگہ عالمگیر ثانی کا پچپن سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا جانا، اور بہت سے نااہل اور ذلیل لوگوں کا برسرِ اقتدار آنا یہ اور ایسے بہت سے واقعات تھے جن کی طرف میرؔ نے اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے۔

ان تمام حالات سے پریشان ہوکر میرؔ نے گوشہ نشینی اور فاقہ کشی کی زندگی اختیار کرلی، مگر وہاں بھی انھیں سکون نہ مل سکا اور مرنے کی خواہش نے دل میں سر اٹھانا شروع کیا۔

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر
جینے کا اس سے میں اب کیا مزا رہا ہے
فکر معاش یعنی زیست تابہ کے
مر جایئے کہیں کہ ٹک آرام پایئے

میرؔ کی قسمت بھی نہ جانے کس قسم کی تھی کہ انھیں زندگی میں کبھی سکون نہ مل سکا۔ دلّی کی تباہی و بربادی (۸۳۔۱۷۸۲ء) اور اجڑنے کے بعد میرؔ نے لکھنؤ کی راہ لی مگر وہاں بھی انھیں اطمینان میسر نہ ہوسکا۔ جس کی غمازی ان کے اشعار سے بخوبی ہوتی ہے۔

علی سردار جعفری کلامِ میرؔ میں صرف اُن کے عہد کی عکاسی کا ہی ذکر نہیں کرتے بلکہ اُن کے خیال میں قرونِ وسطیٰ میں شروع ہوئی تصوّف کی تحریک نے جس انسان دوستی کا درس دیا اُس کے اثرات بھی میرؔ کے یہاں موجود ہیں۔ میرؔ کا غم انفرادی نہیں اجتماعی ہے، میرؔ کے عہد کے انسان کی طرح میرؔ کی شاعری کا عاشق بھی ایک کچلی ہوئی شخصیت ہے جو اپنا کھویا ہوا وقار واپس مانگ رہی ہے۔

علی سردار جعفری حسن عسکری کے اس مضمون کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں انھوں نے ایک اہم بات کہی ہے

''میرؔ کی شاعری کا عاشق محبوب سے محبت کا طالب نہیں،
بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے۔
اس کے عالم و فاضل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان ہونے کی
وجہ سے''۔۳۲

جعفری نے میرؔ کی غزلوں کا تجزیہ جس خوبصورت انداز میں کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میرؔ کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جس میں انھوں نے براہِ راست سماجی معاشی اور سیاسی مضامین کو ڈھال دیا ہے۔

ظالم حکمرانوں کے سامنے کسی بات کا براہِ راست کہنا مشکل امر ہے، یہی سبب ہے

کہ شاعر یا ادیب اپنی بات اشاروں اور کنایوں میں کہتا ہے، خود ترقی پسند شعراء نے اپنی بات کہنے کے لیے علامتوں کا سہارا لیا یہی خوبی سردار جعفری کو کلامِ میرؔ میں نظر آئی۔ لکھتے ہیں:

''اس براہِ راست اندازِ بیان کے علاوہ میر نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بھی بیان کیا ہے اور پردے کو اُٹھانے کی خود ہی ترغیب بھی دی ہے۔۳۳؎

اس دور کے باہری حملوں میں ہوئے مظالم اور اس عہد کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ہوئی تباہی میں معاشرہ جس طرح ٹوٹ کر بکھرا، اور پھر کس طرح اس عہد کے لوگ اپنا وقار اور اپنی شخصیت کھو بیٹھے۔ کس طرح لوگوں کے بسے بسائے گھر اُجڑ گئے؟ میرؔ نے بقول جعفری ''ان تمام واقعات کو علامتوں کے ذریعہ بیان کیا''۔ کیونکہ براہِ راست کوئی بات کہنا شاید میر کے لیے اس وقت ممکن نہ تھا۔ اسی لیے وہ محبوب کو ظالم سفاک، گھٹیا، کمینہ، اوباش، بدمعاش، خونخوار، خوں ریز، جھوٹا، مکّار، کبھی کچھ کہہ کر اپنی بات کو اس کے پردے میں ادا کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جعفری ایک مثال بھی دیتے ہیں کہ:

''محبوب کی سیہ آنکھوں کی تعریف بھی شعراء نے کی ہے۔ لیکن میرؔ نے ان کو ''سیہ رو'' اور ''سیہ کاسہ'' کہہ کر گالی بھی دی ہے۔ سیہ رو کے معنی بدچلن اور بدنام کے ہیں اور ''سیہ کاسہ'' کنجوس کو کہتے ہیں۔ میرؔ کے عہد کی ایک لغت (مرتبہ شیکسپیر) میں اس کے معنی چنڈال بھی لکھے ہیں اور میر یقیناً اس مفہوم سے واقف ہوں گے۔ اس شاعری میں صرف آسمان ہی نہیں جو تقدیر اور وقت کا کنایہ ہے (اور سماجی نظام کا مفہوم بھی اختیار کر لیتا ہے) بلکہ محبوب کی آنکھ بھی سیہ کاسہ اور سیہ رو ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ محبوب ظالم اور سفاک بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحوں کی ذات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا آنا تباہی لاتا ہے۔ اس کے راستوں میں خون کے دریا موجیں مارتے ہیں۔ لاشیں پڑی رہتی

ہیں۔اور زمین کے سینے پر فوجوں کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔۳۴

جعفری نے میر کے ایسے بہت سے اشعار مثال میں دیئے ہیں، جہاں محبوب کو مخاطب کر کے میر نے اپنے عہد کی کشمکش اور خوں ریزی کی پوری داستان شعر کے پردے میں بیان کردی ہے۔محبوب کے اس تصور کے پیچھے بقول جعفری حالات زمانہ کا سماجی شعور ہے اور ان بظاہر سادہ شعروں کی تہہ میں دبا ہوا ایک احتجاج ہے۔

سردار جعفری کے مضمون کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ میر کی شاعرانہ اہمیت کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ بلکہ خود ترقی پسند تنقید کے تصورات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ میر پر سردار جعفری کا مضمون اُردو میں سماجیاتی تنقید کا نقشِ اوّل ہے۔سماجی تنقید پر تو ہر ترقی پسند نقاد نے زور دیا یعنی شاعر کے ماحول اور اس کے عہد کے سیاسی وسماجی حالات کے پیشِ نظر شاعر کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن سردار جعفری نے شاعر کے کلام اور شعر کے استعاراتی اور علامتی نظام کی تشریح وتوضیح کے ذریعہ اس زمانے کے حالات اور تصورات کا مطالعہ کیا۔جس کی وجہ سے میر کا یہ مطالعہ تفہیم میر کا ایک نیا لطف رکھتا ہے۔

میر کے تصورِ محبوب کے سلسلے میں سردار جعفری نے ایک ایسی بات لکھی ہے جس پر جتنا غور کیا جائے اس کے نکات کھلتے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ محبوب کے اس تصور کے پیچھے حالات زمانہ کا ایک سماجی شعور ہے اور ان بظاہر سادہ شعروں کی تہہ میں دبا ہوا ایک احتجاج ہے۔۔۔۔۔وہ لکھتے ہیں کہ

> ”شیکسپیر کے ڈرامے میکبتھ میں جب اپنے مجرم ضمیر کی ستائی ہوئی لیڈی میکبتھ خواب میں چلتی ہے تو وہ اپنے ہاتھوں کو اس انداز سے ملتی رہتی ہے جیسے انھیں دھونے کی کوشش کررہی ہو۔لیکن خونِ بے گناہ کے دھبے کسی طرح نہیں چھوٹتے اور وہ بڑبڑاتی ہے کہ عرب کا عطر بھی اس کے ہاتھوں سے خون کی بو کو دور نہیں کرسکتا“۔میر کا وہ محبوب بھی جو سفاک بادشاہوں اور خون ریز فاتحوں کا کنایہ ہے، اپنے ہاتھ ملتا رہتا ہے اس نے اپنی

آرائش مظلوموں کے خون سے کی ہے۔ انسانوں کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے تب ہتھیلیوں نے حنا کا رنگ اختیار کیا ہے اور یہ خون کسی طرح نہیں چھوٹتا''۔ ۳۵

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری میں معنوی تہہ داری اور سماجی اشاروں کی جس دُنیا کو ظاہر کیا اس پر اس طرح سے غور نہیں کیا گیا تھا۔ ترقی پسند تنقید شاعری یا دوسری فنی تخلیقات کو ماحول، سماج، زمانہ اور ذرائع پیداوار سے جوڑتی ہے۔ بظاہر یہ باتیں بہت عجیب لگتی ہیں کہ شاعری سے ان باتوں کا کیا تعلق، شاعری، شاعری ہے اسی بات پر بعد کے جدید ناقدین نے زور دیا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ شاعری یا کسی بھی فنی تخلیق کو اس کے ان رشتوں سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا جن سے خود اس کا تخلیق کار وابستہ ہے اسی لیے جب سردار جعفری کا یہ مضمون سامنے آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ میرؔ کی شاعری صرف ان کے دل کا درد و کرب نہیں ان کے عہد کی ایک ایسی چیخ ہے جس کی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔

سردار جعفری کا مضمون ترقی پسند نقطۂ نظر سے دیکھا جائے یا صرف مطالعہ میرؔ کے نقطہ نظر سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اُردو شاعری کے استعاراتی اور علامتی نظام کو جس طرح نئی معنویت بخشی اسی طرح ''مطالعۂ میرؔ'' میں، میرؔ کی صوفیانہ یا عاشقانہ علامتوں کو سردار جعفری نے ایک نئی معنویت دینے کی کوشش کی۔ اس طرح تنقید میرؔ کے سلسلے میں علی سردار جعفری ایک منفرد اور اہم مقام رکھتے ہیں، ان کے نظریۂ تنقید نے میرؔ ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کے مطالعے کے سلسلے میں بھی نئی راہوں کا اضافہ کیا۔

اختر اورینوی (۱۹۷۰ء۔۱۹۱۰ء)

ڈاکٹر اختر اورینوی کا شمار اہم ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے۔ ان کا مضمون ''میرؔ دہلوی'' ترقی پسند نقطۂ نظر سے میرؔ کی شاعری کا احاطہ کرتا ہے۔ اختر اورینوی کے خیال میں لوگ میرؔ کو یاسیت پرست قرار دیتے ہیں لیکن ان کی یاسیت میں جذباتیت، فکری گیرائی اور بصیرت بھی ہے۔ ان کی شاعری سے مایوسی نہیں پیدا ہوتی، عبرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی شاعری میں یاس وقنوط کے علاوہ ہمیں رجائیت کے میلانات بھی ملتے ہیں اور دعوتِ عمل کی پکار بھی سنائی دیتی ہے۔ ہاں میرؔ کو اتنا سلیقہ ہے کہ وہ دعوتِ عمل دینے کے لیے ڈھول نہیں پیٹتے۔ وہ آپ بیتی کے انداز میں زندگی کو پیش کرتے ہیں، وہ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا لیتے ہیں۔ اصل میں میرؔ کا ایک مخصوص لب ولہجہ ہے، اُن کی آواز میں ایک خاص لَن ہے، اُن کے آہنگ میں ایک دردمندانہ آنچ ہے، وہ زندگی کے جس پہلو کے متعلق بھی کہتے ہیں بڑے پُر اثر انداز میں کہتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری سے مایوسی نہیں پیدا ہوتی عبرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی زندگی سے محبت ہو جاتی ہے۔ میں تو جب بھی میرؔ کو پڑھتا ہوں مجھے زندگی سے پیار آنے لگتا ہے۔'' ۳۶

اختر اورینوی نے میرؔ کی شاعری میں درسِ عمل کی نشاندہی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ ان کے خیال میں میر دعوتِ عمل نہایت دلکش و موثر انداز میں دیتے ہیں۔ ان کی شاعری زندگی سے فرار کا نہیں محبت کا درس دیتی ہے۔ انھیں محض قنوطی شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا زندگی ہر رنگ میں کلامِ میرؔ میں رقصاں نظر آتی ہے۔ بقول اختر اورینوی کلامِ میرؔ ایک طرف ''لے سانس بھی آہستہ'' کا درس دیتا ہے تو دوسری جانب میرؔ کے یہاں دعوتِ انقلاب بھی موجود ہے۔ میرؔ کو پڑھنے والا قاری زندگی سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی سے محبت کرنے لگتا ہے۔

اختر اورینوی نے حالانکہ میرؔ پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی مگر ان کا یہ مختصر سا مضمون نقدِ میرؔ میں ترقی پسند نظریات کی رو سے خاصا اہم ہے۔

محمد حسن (۱۹۲۶ء) کے تنقیدی نقطۂ نظر کو ان کے مضامین کے مجموعے ادبی سماجیات، ادبی تنقید، شعرِ نو، ''دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، کے حوالے سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر ان کی تصنیف ''دہلی میں'' اُردو شاعری کا

تہذیبی وفکری پس منظر''عہد میر تک'' ہمارے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔اس کتاب میں محمد حسن نے میر کے نام سے تو کوئی علاحدہ عنوان قائم نہیں کیا مگر انھوں نے کلام میر پر سماجی وتاریخی نقطۂ نظر سے تنقیدی نگاہ ضروری ڈالی ہے۔محمد حسن کا شمار ان ناقدین میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی پسند تحریک اور مارکسی فلسفے کی سماجی تشریحات کو ادبی مطالعے کے لیے اختیار کیا ہے۔ان کے خیال میں

''بغیر سوشل اور کلچرل ہسٹری کے نہ تو ادب کی اقدار کا تعین کیا جاسکتا ہے اور نہ صحت مند ادبی تنقید کے اصول بنائے جاسکتے ہیں۔اس دور میں نقاد پر دوہری ذمہ داریاں ہیں۔یعنی اسے تہذیبی تاریخ بھی لکھنی ہے اور ادبی اقدار کے متعین کرنے کے لیے اصول بھی بنانے ہیں''۔۳۷

اس سمت میں ان کا پہلا کامیاب قدم''اُردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر'' کی تصنیف ہے۔وہ اپنے نظریۂ ادب کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''ہر دور کا ادب عصری تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے آئینے میں کسی ملک اور قوم کے درد و داغ وجستجو و آرزو کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔وہ سماج کا پروردہ بھی ہوتا ہے اور اس کا خالق بھی اور اسی لیے ادب کا مطالعہ وسیع تر تہذیبی پس منظر میں کرنا ضروری ہے۔ادب کے ذریعہ تاریخ کی جیتی جاگتی تصویر اور عہد ماضی کے مزاج اور کردار کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔مختلف سماجی علوم کی مدد سے کسی مخصوص عہد کے مطالعے سے یہ بھی منکشف ہوسکا ہے کہ اس دور میں چند تصورات کے ابھرنے اور چند عقائد اقدار کے نمایاں ہونے کے اسباب کیا تھے؟ گویا ادب کے''کیا اور کیوں'' کا جواب تہذیبی تاریخ کی ہی مدد سے فراہم کیا جاسکتا ہے اور اس ضمن میں نسلی وراثت، معاشرت اور اس کی اقدار، معتقدات اور فلسفے، تاریخ اور سیاست کے ہنگامے، اقتصادیات

کے پیچ در پیچ اثرات بھی کا مطالعہ معاون ثابت ہوتا ہے۔"۳۸

میر کا دور انتشار کا دور تھا۔ اس عہد میں فرد کا معاشرے سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ میرؔ کو بھی دلی سے لکھنؤ جانا پڑا اپنی تہذیبی جڑوں سے کٹنے کے بعد وہ تلاش معاش میں سرگرداں لکھنؤ پہنچے اس دور کے سبھی باکمال پریشان حال تھے۔ محمد حسن اپنے تنقیدی جائزے میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ میر کا دور آج کے زمانے کے مماثل تھا جس طرح سے موجودہ صنعتی عہد میں فرد سب کے ساتھ ہو کر بھی تنہا ہے اور عہد حاضر کا انسان جس طرح شکستہ حال ہے وہی حالت میرؔ کے دور کے انسان کی بھی تھی۔ محمد حسن نے لکھا ہے:

"۔۔۔۔۔ میرؔ کی آواز عہد حاضر کے صنعتی دور کے تشنج زدہ انسان کے لیے بھی اعتبار و اسناد کا درجہ رکھتی ہے۔"۳۹

محمد حسن نے جس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تنقید میر میں خاص اہمیت رکھتا ہے کسی شاعر کا کلام اگر دو سو برس بعد بھی انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی کر رہا ہے تو یہ اس شاعر کے کلام کی عظمت کی دلیل ہے اسی لیے میر کے یہاں آج کا انسان اپنی ذہنی تسکین کا سامان تلاش کرتا ہے۔ محمد حسن اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ میر جیسا تخلیق کار جو فرد کی حیثیت سے اپنے قبیلے سے جڑا ہوا تھا جب اپنی جڑوں سے کٹنے لگتا ہے تو اس کے یہاں انفرادیت کی لے ابھرتی ہے میرؔ کو اس دور کے دوسرے شعراء کی طرح یکجائی کے ختم ہونے کا بہت غم ہے۔

محمد حسن نے میر کی شاعری کا رشتہ عہد حاضر سے جوڑا ہے۔ ان کے مطابق میرؔ کا کلام ہمارے عہد کا عکاس ہے خصوصاً جس تنہائی و بے چینی اور کشمکش کا شکار ہم سب ہیں، میر بھی تھے۔ پھر کیسے ہمارا دل اس شاعر کے کلام سے متاثر نہ ہوگا جو ہماری اپنی پریشانیوں کا آئینہ ہو۔ اب چاہے وہ تنہائی کا غم ہو یا میرؔ کے اپنے حال کی درہمی کا المیہ یا پھر زمانہ حال کی درہمی۔ سب کا تعلق ہماری اپنی ذات سے ہے۔

اٹھارہویں صدی میں لگاتار غیر ملکی حملوں کے سبب حالات اتنے خراب تھے کہ شاعر چاہ کر بھی اپنی بات براہ راست نہیں کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر بات کو علامتی اور رمزیاتی انداز میں کہتا ہے خود محمد حسن نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس عہد کا شاعر اگر محبوب

کے متعلق بھی کچھ کہتا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور پوشیدہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حال کی درہمی کے سبب اس دور میں الفاظ کا استعمال اس کے لغوی معنی میں نہیں رمزی اور کیفیاتی معنی میں ہوا ہے۔ چنانچہ اس دور کے تصورات اور موضوعات کی نوعیت کو پہچاننے کے لیے لازم ہے کہ غزل کی مخصوص لفظیات اور مثنوی کے مخصوص محاورے کو سمجھا جائے یہاں عشق سے مراد محض محبت نہیں ہے حسن سے مراد ہمیشہ محبوب مجازی یا حقیقی نہیں ہے۔
>
> واحد متکلم سے مراد لازمی طور پر شاعر یا عاشق نہیں ہوتا بلکہ اس سے مراد دور، کبھی زمانہ، کبھی انسان، کبھی کچھ ہوسکتا ہے۔ معنی کی اس تہہ داری کو سمجھے بغیر اس دور کے شعری سرمایہ کی پہچان دشوار ہے''۔[۶۰]

محمد حسن اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

> ''اس دور میں عشق و عاشقی کی کیفیات، واردات اور عاشق اور محبوب کی علامتیں اور تلازمے کئی سطحوں پر اور کئی معنوں میں مستعمل تھے۔ اس کے معنی مجازی اور حقیقی ہوسکتے ہیں اور سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی بھی۔ محبوب سے مراد کوئی حسین عورت بھی ہوسکتی ہے اور پورا نظام اقتدار بھی، بادشاہ بھی اور قاتل بھی، دوست بھی اور دشمن بھی۔
>
> اس دور کے علاوہ اس سے پہلے کے دوسرے شعراء کے یہاں بھی اسی طرح کی مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن اس دور میں یہ تہہ داری، رمزیت اور محبوب سے نظام تک ذات سے کائنات تک بہ یک وقت معنویت پھیلانے کا حربہ جس قدر واضح طور پر جس کثرت سے برتا گیا ہے۔ اس کی مثال اس سے قبل مشکل سے ملے گی۔''[۶۱]

ادب وشاعری انسانی زندگی اور اس کے خیالات وجذبات کا آئینہ ہے۔ یعنی کوئی بھی تخلیق خلا میں وجود نہیں پاتی بلکہ فنکار روایات اور سماجی ماحول سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور وہیں سے اپنی تخلیق کے لیے مواد حاصل کرتا ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ ادب ساکن و جامد تصورات کا اظہار نہیں ہے بلکہ وہ لحہ بہ لحہ بدلتے ہوئے معاشرتی نظام، تہذیبی اقدار اور سماج کے ارتقاء کا ایک جزو ہے۔ محمد حسن انھیں نظریات کی روشنی میں ایک ایسے میر کی دریافت کرتے ہیں جس نے اپنے عہد کو بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کردیا۔

ایک اہم نکتہ جس کی طرف مجنوں گورکھپوری احتشام حسین، علی سردار جعفری اور محمد حسن چاروں نے خاص طور سے توجہ دلائی ہے وہ اس بات کی تردید ہے کہ میر قنوطی شاعر ہیں ۔محمد حسن نے میر کو ایک ایسا بلند حوصلہ اور ہمت والا شاعر قرار دیا ہے، جس نے ایک طرف تو ظلم وستم کی انتہا کو بیان کیا وہیں دوسری طرف مظلوموں کے انتقام ان کے احتجاج اور ان کی شان مقاومت کو بھی بیان کیا۔

ترقی پسند ناقدین کے خیال میں ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ میر کا عہد بھی بحران کا عہد تھا۔ ملک پر برطانوی اثرات اپنا شکنجہ کس رہے تھے۔ یہ شکنجہ اقتصادی، اور سیاسی دونوں سطحوں پر تھا۔ آگرے کا بازار اور صنعتیں سب اس کی شکار تھیں۔ اسی بحران نے جب دلّی کو آلیا تو اس کا ماتم حاتمؔ، سوداؔ، قائمؔ اور میرؔ کے یہاں بھی نظر آنے لگا۔

محمد حسن کے مطابق میر کے یہاں اس دنیائے بے ثبات کی رنگینی زیادہ واضح ہے۔ میرؔ کے ہاں درد، عکس نشاط اور آرزوئے انبساط ہے وہ دنیا کو لطف ومزہ سے معریٰ نہیں سمجھتے۔ مگر اس کی بے ثباتی پر وہ کڑھتے رہتے ہیں۔ دراصل اس دور کے تمام شعراء نے اسی تہذیب کو زندگی سمجھا اور جب وہ تہذیب باقی نہ رہی تو وہ دُنیا کی ناپائیداری پر آہ وزاری کرنے لگے۔

محمد حسن نے جس طرح سے میرؔ کی شاعری پر ان کے عہد کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے میر کے کلام پر ان کے زمانے کے اثرات کی ہی نشاندہی نہیں کی بلکہ وہ اس کا رشتہ عہدِ حاضر سے بھی جوڑتے ہیں۔ ایک اہم نکتہ جس کی طرف محمد حسن نے اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ کسی شاعر کی اجتماعی زندگی کے علاوہ انفرادی زندگی بھی ہوتی ہے۔ میرؔ اگر ایک

طرف اپنے عہد سے جڑے ہیں تو دوسری طرف انھیں تنہائی کا احساس بھی ہے۔ دوستوں کے بچھڑنے کا غم بھی ہے۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد حسن نے میرؔ کی شاعری پر جو کچھ لکھا نقدِ میر میں اس کی اہمیت مسلّم ہے۔

عبادت بریلوی (۱۹۲۰ء۔۱۹۹۸ء) کا شمار اہم ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ''کلیاتِ میرؔ'' اپنے مقدمے کے ساتھ فروری ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ ایک دوسری کتاب ''میر تقی میرؔ'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ جس کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''میرؔ کے مطالعے کے نتائج تو میری آئندہ شائع ہونے والی چار کتابوں (۱) حیاتِ میر (۲) میر کی غزل (۳) منظومات میر اور (۴) میرؔ کی شاعری کا جمالیاتی پہلو، میں سامنے آئیں گے۔ ان کتابوں میں میرؔ کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کی دلچسپ تفصیل و جزئیات ہوگی جس کو تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے تجزیاتی انداز میں پیش کیا جائے گا ------ یہ کتاب جو اس وقت ''میر تقی میرؔ'' کے نام سے شائع کی جارہی ہے، اس کو ان چاروں کتابوں کی تمہید، مقدمہ یا خاکہ کہا جائے گا۔ لیکن اس میں بھی میرؔ کی شخصیت اور شاعری پر زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اختصار کے ساتھ ہی سہی، ان کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔''۴۲

فروری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئے ''کلیاتِ میرؔ'' کے مقدمے کو عبادت بریلوی نے تفصیلی انداز میں لکھا ہے۔ اور میرؔ کے کلام کی خصوصیات پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

> ''یہ مقدمہ تقریباً ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے میرؔ کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت، تصانیف اور فن کی تفصیلات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔''۴۳

عبادت بریلوی کا خیال ہے کہ زندگی میں میرؔ پر جو کچھ گزری ، جتنے صدمے اٹھائے ،جن حالات کا سامنا کیا جو سانحات انھیں پیش آئے ۔جن لوگوں کے زیر سایہ وہ رہے۔ان سبھی واقعات وحالات کی عکاس ان کی شاعری ہے۔ حالانکہ میرؔ کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔مگران کے حالات ہمیشہ خراب رہے۔ دلّی میں قیام کے دوران انھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔اس کی تصویر ان کی مثنوی خواب وخیال میں موجود ہے مغلیہ سلطنت کے زوال اور باہری حملوں سے دلّی کی جو حالت ہوئی اس کی وضاحت ذکر میر میں کی گئی ہے۔اس کتاب میں ان کے عہد کے تاریخی ،سیاسی ،اور سماجی حالات کی اتنی تفصیل و جزئیات ہے کہ ان حالات کا مطالعہ ان کی شخصیت کے مطالعے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تصوف اس دور میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میر صاحب کے کردار و شخصیت میں اس تصوف نے انسانیت کا خیال اور انسانی قدروں سے لگاؤ پیدا کیا۔میرؔ کو انسانی زندگی سے خاص انس ہے اور اسی لیے انھیں انسان عظیم نظر آتا ہے۔ میر صاحب کا دور بقول عبادت بریلوی محبت کے لیے سازگار نہ تھا اور اس عہد میں محبوب سے وفا کی امید بیکار تھی۔

عبادت بریلوی کی دوسری اہم کتاب ''میر تقی میرؔ'' فروری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی اس کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے اپنی بقیہ کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔یہ کتاب میر کے حالات زندگی ، ماحول، شخصیت، ان کی تصانیف اور فن تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مقدمے میں لکھی گئی باتوں کو مزید وضاحت سے پیش کیا ہے۔

''جہانِ میرؔ'' عبادت بریلوی کے خیالات میں تبدیلی کی عکاس ہے۔پہلی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی انھوں نے طوالت سے کام لیا ہے۔مگر اس میں ان کا Approach کچھ بدلا ضرور ہے۔ جہانِ میرؔ کے پیش لفظ میں ہی وہ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ میرؔ کی زندگی ایک ایسے دور میں گزری جہاں سکون عنقاء تھا۔اپنی طویل ۹۰ سالہ عمر میں انھوں نے مغلوں کا دور آخر دیکھا اور اس عہد میں جن واقعات سے لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی دوچار ہوئی اس کے چشم دید گواہ میرؔ تھے۔وہ خود بہت سی جنگوں میں شامل رہے۔اسی لیے ان کی زندگی پر اظہار خیال،ان کے عہد پر اظہارِ خیال کے مترادف ہے۔

عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''اس عہد کی زندگی کو میر صاحب کی زندگی کے آئینے میں اور میرؔ صاحب کی زندگی کو اس عہد کے حالات وواقعات کے آئینے میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ میر صاحب نے اس زمانے میں آنکھ کھولی جب مغلیہ شان وشوکت کی عمارت بوسیدہ ہوچکی تھی اور انحطاط وزوال کے عفریت اس کے آنگن میں رقص کررہے تھے۔ شاہانِ وقت کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ داخلی خلفشار اور بیرونی بازار نے زندگی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔''۴۴

میرؔ کا عہد آشوب ومصیبت کا دور تھا یہ بات کسی پردۂ راز میں نہیں، تاریخ گواہ ہے کہ اس دور میں دلّی جس تباہی وبربادی سے دوچار ہوئی اس سے کوئی بھی حساس انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر میرؔ تو شاعر تھے۔ شاعر بھی بے انتہا حساس اور نازک مزاج۔ چنانچہ عبادت بریلوی کا یہ کہنا کہ اس عہد کو میرؔ کی زندگی کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے، بالکل صحیح ہے۔ عبادت بریلوی نے لکھا ہے:

''میر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دلّی کی سرزمین پر انھیں حالات کے سایے میں بسر کیا اور اس زمانے میں جو کچھ لکھا، اس میں ان حالات کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں ان تمام حالت کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس کی مثال اس عہد کی کسی تحریر میں نظر نہیں آتی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میرؔ اس عہد کے ایک بڑے مورخ اور اس زمانے کی تاریخ وتہذیب کے ایک بہت بڑے مزاج داں نظر آتے ہیں۔۴۵

عبادت بریلوی نے میرؔ کی زندگی اور اس عہد کے حالات پر اپنے مقدمے، میرؔ تقی میرؔ اور جہانِ میرؔ دونوں میں تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ جب وہ پیش لفظ میں یہ کہتے ہیں کہ میر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دلّی میں بسر کیا اور ان کے کلام اور نثر دونوں میں اس

دور کی پوری تصویر موجود ہے اور اس کی مثال کسی اور زمانے کی تحریر میں نظر نہیں آتی یا میرؔ اس دور کے مزاج داں اور بڑے مورخ ہیں تو اس کا سلسلۂ نقدان تمام ترقی پسند ناقدین سے ملا ہوا دکھائی دیتا ہے جنھوں نے شعراء و مصنفین کو ان کے عہد سے منسلک کر کے دیکھا۔ خاص طور سے میر کے سلسلے میں یہ تنقیدی رویہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ظ۔ انصاری (۱۹۹۱ء۔۱۹۲۵ء) ترقی پسند ناقدین میں ''ظ۔انصاری'' ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون ''میرؔ کلچر'' میں ''میر تقی میرؔ'' کی شاعری کو ایک دلچسپ انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ظ۔انصاری کا مضمون میرؔ کو ایک ایسے فنکار کی حیثیت سے ہمارے سامنے لاتا ہے جو ہماری تہذیب کا نمائندہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بس میر وہ فنکار ہے، جو صدیوں اور نسلوں کے اس (ہمارے سرمائے کا امانت دار ہے۔ میرؔ ایک شخص یا شاعر نہیں پورا ایک کلچر نظر آتا ہے۔'' ۴۶

ظ۔انصاری نے لکھا ہے کہ میر نے اپنی زندگی کے ۹۰ (نوے) برس تیز دھوپ اور ٹھنڈی چھاؤں میں سنبھل سنبھل کر کاٹے۔ انھوں نے کبھی اپنے گھر میں اہلِ سخن کی محفلیں جمائیں، تو کبھی جنگلوں میں خیمے کے تلے بھیانک راتیں گزاریں، ایک سفیر کی ذمہ داریاں ادا کیں، جنگ کے میدان اور جگمگاتے ایوان دیکھے، برتے۔ ایسی بھرپور شخصیت مسلسل خانہ جنگیوں کے دور میں طرح طرح کی زندگی بسر کرنے والا میرؔ جو ایک انتہائی زود حس فنکار ہے جو صرف اپنے آپ میں سمٹا ہوا نہیں تھا۔ جس کے ہاں مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ نفس کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں۔ وہ ایک ایسا فنکار ہے جس نے آپ بیتی اور شاعری کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ جس نے اپنی زندگی میں ہر گام پر سلیقے سے کام لیا کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ انھوں نے لکھا ہے۔

> ''سلیقے کا لفظ میرؔ کی تہذیب، بلکہ یوں کہیں کہ تربیت گاہ کا پہلا اور آخری سبق ہے۔ دکھ سہنے کا سلیقہ، زندگی برتنے کا سلیقہ، جنوں کرنے اور ہوشیار رہنے کا سلیقہ، آگہی اور بے خبری کے

درمیان لب کشائی کا سلیقہ، بگڑ بیٹھنے یا من جانے یا منا لینے کا سلیقہ۔ اور آخر یہ کہ زندگی کی ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ۔ ہماری تو نظر سے آج تک نہیں گزرا''۔ ۴۷

ظ۔انصاری میرؔ کو ایک ایسا سلیقے مند انسان قرار دیتے ہیں جو زندگی کے ہر رنگ کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہے ناکامیابیاں بھی اسے شکستہ نہیں کرسکتیں وہ ان کو برداشت کرنے کی قوت اور حوصلہ رکھتا ہے اس لیے ہم اسے ایک منہ بسورتے کلچر کا ماتمی نہیں قرار دے سکتے بلکہ وہ ہمارے کلچر کا نمائندہ اور ترجمان ہے۔انھوں نے مزید لکھا ہے:

''اب تصور کیجئے کہ میرؔ ایک گئے گزرے اور مونہہ بسورتے کلچر کا ماتمی نظر آتا ہے یا اپنے وجود کا جن کے بیشتر اجزاء آج بھی از کار رفتہ نہیں ہوئے ہیں حکمراں طبقے اور حاکمانہ گروہوں کے پاؤں تلے کے پتھر تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی، سیاسی سیلاب نے میرؔ کے آنکھوں دیکھتے ہی سرکا دیئے تھے۔ البتہ کنارے پر ان کے ہاتھ دفینوں کی چابیاں رہ گئیں اور میرؔ ان دفینوں کا بڑا کلید بردار ہے۔ اپنے تخلیقی عمل میں تہذیب کی قدروں کا وارث۔ان معنوں میں ہم میرؔ سے ایک کلچر منسوب کرسکتے ہیں، جس میں کوئی ایک شے اور بھی دبی ملی ہے میرؔ جیسی ہمیں اس کا نام نہیں معلوم۔'' ۴۸

ظ انصاری کا یہ جملہ کہ ''میرؔ اپنے تخلیقی عمل میں تہذیب کی قدروں کا وارث ہے'' اپنے اندر زبردست معنویت رکھتا ہے اور میرؔ کو ایک نئے انداز میں ہمارے سامنے لاتا ہے۔

اس عہد کے ترقی پسند ناقدین میں **شارب ردولوی** (۱۹۳۵ء) کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ادب کے مارکسی اور سماجی محرکات پر ان کی گہری نظر ہے۔اپنی کتاب ''گلِ صد رنگ'' کے مقدمے میں انھوں نے میرؔ کی شاعری پر کئی جگہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ترقی پسند ناقدین کے یہاں عام طور پر میرؔ کے حوالے کم ملتے ہیں۔اس کا سبب شاید یہ ہو کہ ان کی توجہ

آزادی، انقلاب اور بلند بانگ شاعری کی طرف زیادہ رہی۔ حالانکہ بعض ترقی پسند ناقدین خاص طور پر میر شناسی کے لیے مشہور ہیں۔ شارب ردولوی نے بہت تفصیل سے میرؔ کے بارے میں نہیں لکھا ہے لیکن انھوں نے میر کے حالات اور ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہمیں میر کو بہتر طریقے پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ میر ان کے لیے ناکامیوں اور نامرادیوں کے شاعر نہیں بلکہ زندگی کی تڑپ رکھنے والے شاعر ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''میرؔ کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ باوجود ان کی پریشانیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کے ان کے یہاں موت کا نغمہ یا مرگ کی تاریکی نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی تڑپ اور لگن ہے۔ وہ دل پرخوں کی اس گلابی سے بھی مزہ لیتے ہیں۔ وہ بالکل مایوس ہو کر ''جیتے جی میت'' بن کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ وہ اس میں بھی سرمستی اور کیف کا ایک گوشہ تلاش کر لیتے ہیں اسی لیے ان کی حرماں نصیبی اور یاسیت کے باوجود میں انھیں قنوطی نہیں سمجھتا۔'' ۴۹؎

شارب ردولوی کے یہ خیالات اس میرؔ سے ہمیں روشناس کراتے ہیں جس کی طرف پہلا اشارہ مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین نے کیا تھا۔ یعنی زندگی سے محبت کرنے والا میر جو بقول شارب ردولوی اپنے دل پرخوں کی گلابی سے ہمت و حوصلہ دیتا ہے۔ وہ فانی کی طرح جیتے جی موت کا دامن نہیں تھامتا بلکہ اپنی محرومیوں میں مسرتوں کا پہلو تلاش کر لیتا ہے۔

یوسف سرمست (۱۹۳۶ء) کا شمار اہم ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے۔ ان کا مضمون ''میرؔ کی شخصیت اور شاعری'' خاصا اہم ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عظیم شاعری اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک وہ شاعر کی شخصیت سے اہم آہنگ نہ ہو۔ میرؔ کی شاعری کا مطالعہ اصل میں ان کی شخصیت کا مطالعہ ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔'' ۵۰؎

یوسف سرمست ایک طرف شخصیت کے واردات کا ربط شاعری سے قائم کرتے ہیں

تو دوسری طرف خارجی حالات کے اثرات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے جہاں میر کی ذاتی زندگی کے سانحات کو ان کی شاعری کی بنیاد قرار دیا مثلاً دس گیارہ سال کی عمر میں ان کے چچا کا انتقال ہونا، پھر والد کا انتقال، خان آرزو کی بے مروتی، عشق میں ناکامی، زندگی کی اس تمام کشاکش نے میر کو متاثر کیا وہیں یوسف سرمست کا خیال ہے کہ

> ''میرؔ کی شاعری میں اس زمانے کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔''۵۱

یوسف سرمست 'غم' کو میر کے اشعار کی روح قرار دیتے ہیں مگر ان کے نزدیک میرؔ اس غم اور قنوطیت سے ہارتے نہیں بلکہ زندگی بھر مصیبت اٹھانے کے بعد بھی وہ ہمیشہ مقابلے کے لیے تیار رہے اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

> ''وہ (میرؔ) آنے والی مصیبتوں سے بھاگتے نہیں تھے بلکہ ان کے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتے تھے۔ وہ ناکامیوں سے گھبرا کر فرار کی راہ اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ خاص سلیقے سے اسے نباہتے تھے۔۔۔۔۔وہ ہر طرح کی نامرادانہ زندگی بسر کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔۔۔۔۔وہ اپنی ''شکستہ پائی'' سے مایوس نہیں ہیں بلکہ اسے مستحسن سمجھتے ہیں اور یہی ان کی شخصیت کا حقیقی رنگ ہے۔ جو ان کی شاعری کو عظیم سے عظیم تر بناتا ہے۔''۵۲

یوسف سرمست میرؔ کی شاعری میں شخصیت کی تلاش کرتے ہوئے میر کو ایک ایسا باحوصلہ انسان قرار دیتے ہیں جس نے زندگی کے تلاطم میں کبھی ہمت نہیں ہاری۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ان کے عہد کے ناسازگار حالات کسی کو بھی مایوسی والم کا شکار بنا سکتے تھے مگر میر کی عظمت دیکھئے کہ وہ ان حالات کا ہمت و استقلال سے مقابلہ کرتے رہے۔ دوسرے ترقی پسند ناقدین کی طرح یوسف سرمست نے میر کو ناکامیوں سے کام لینے والا شاعر قرار دیا ہے۔

مختصر اً یہ کہ ترقی پسند تنقید نے کلام میرؔ کو نئے مفاہیم عطا کرتے ہوئے نقدِ میر کے

سلسلے کو جس انداز سے آگے بڑھایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان ناقدین نے ایک ایسے دور میں جب کہ میر کو قنوطیت اور یاسیت کا امام قرار دیا جا چکا تھا، کلام میر کو ان کے عہد کے تناظر میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس میں رجائیت اور امید و حوصلے کا پہلو تلاش کیا اور میر کی شاعری کو میر کی شخصیت سے ہم آہنگ کیا۔ ترقی پسند تنقید کا اہم کارنامہ نقدِ میر کو وسعت و معنویت عطا کرنا ہے۔ ورنہ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور علی سردار جعفری سے قبل تو تنقید میرِ آزاد اور مولوی عبدالحق کے قائم کردہ مفروضات پر چل رہی تھی۔ حالانکہ عبدالحق نے پھر بھی میر کی شاعری کو اس کے عہد و سماج کی کڑی قرار دیا ہے مگر جس طرح سے ترقی پسند ناقدین نے میر کا سماجیاتی مطالعہ کیا اس نے نقدِ میر کو نئی راہوں سے روشناس کیا۔ مجنوں کا مضمون ''میر اور ان کی شاعری'' (۱۹۳۵ء) میں شائع ہوا جس میں انھوں نے بار بار اس امر کی جستجو کی کہ کسی طرح میر کی زندگی کے وہ مخفی واقعات معلوم کیے جائیں جنھوں نے میر کو میر بنایا۔ انھوں نے اس بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی کہ میر ہو بہو وہی ہیں جو ان کی شاعری ہے۔ ان کے خیال میں میر نے اپنے ذاتی تجربات و محسوسات کو اس قدر وسعت دے کر بیان کیا کہ وہ سارے عالم کے تجربات و محسوسات بن گئے۔ میر نے ذاتی چیز کو کائناتی چیز بنا دیا۔ مجنوں کے دوسرے مضمون ''میر اور ہم'' میں ان کے ترقی پسندانہ خیالات کو بنیاد ملی۔ یہ مضمون نقدِ میر کے سلسلے میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ مجنوں اس مضمون میں ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اور ترقی پسند تصورات کی روشنی میں میر کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اس تحریک کے مطابق ادب کو اجتماعیت کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ اس مضمون کا عنوان بھی ''میر اور ہم'' رکھتے ہیں۔ اس ترکیب میں لفظ ''ہم'' بہت بامعنی ہے۔ یہ مضمون مطالعہ میر میں ایک نیا رخ ہے۔ اس لیے کہ مجنوں گورکھپوری سے قبل مولوی عبدالحق تک سبھی نے میر کو محض قنوطی شاعر سمجھا۔ مجنون گورکھپوری نے پہلی بار اس مفروضہ کو رد کیا۔ اور میر کی شاعری کی تشریح و تعبیر کے لیے تاریخی سیاق و سباق سے واقفیت اور تاریخ اور فن کے باہمی ربط کو ضروری قرار دیا۔ انھوں نے ''میر اور ہم'' میں لکھا ہے کہ میر کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کے زمانے کے معاشرتی ماحول اور ان کے اسباب و حالات پر جن کے اندر رہ کر میر کی شخصیت کی تعمیر ہوئی مفصل نہ سہی مگر دقیق نظر ضرور ڈالی جائے''

بقول مجنوں گورکھپوری اس طرح کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ میرؔ کی آواز انتہائی شائستگی اور وقار کے ساتھ اپنے زمانے کے سارے کرب و اضطراب کو ظاہر کر رہی ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے میرؔ کے مطالعہ کو ایک نئی جہت دی۔ ان کے نزدیک میرؔ صرف قنوطی اور یاس پرست شاعر نہیں ہیں، وہ زندگی کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنے والے باحوصلہ انسان ہیں۔

احتشام حسین میرؔ کی شاعری پر لکھے گئے مقدمے میں اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ناقدین نے میرؔ کی زندگی اور شاعری کے درمیان کوئی واضح ربط تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ان کا خیال ہے کہ میرؔ کی شاعری اُن کی زندگی ہے۔ میرؔ کی تخلیق ان کی ذات اوران کی شخصیت سے پہچانی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی اور زمانے میں جتنے سرد و گرم دیکھے سب کو اپنی شاعری میں پیش کر دیا۔ میرؔ کے اشعار صرف ان کے رنج و غم یا ذاتی زندگی کے ترجمان نہیں ہیں بلکہ ان کے عہد کی دلّی کی دھڑکنیں بھی اُس میں سنائی دیتی ہیں۔ میرؔ نے اپنے عہد کی تمام کشمکش کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا ہے۔ جہاں اس عہد کی تاریخیں گونگی ہیں وہاں بقول احتشام حسین شاعروں کی آواز چیخ بن کر اس صورتِ حال کی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ احتشام حسین کا خیال ہے کہ میرؔ اپنے عہد اور سماج کی جڑوں سے اس حد تک جڑے ہیں کہ انھیں ان کے عہد سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔

سرور صاحب کا ذکر اس لیے ترقی پسند ناقدین میں کیا گیا ہے کہ جس عہد کے مضامین کا ذکر ہے وہ اس زمانے میں ترقی پسند تنقید کے مدّاح تھے اور ترقی پسند ناقدین میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے مضمون ''میرؔ کے مطالعہ کی اہمیت'' اور بقیہ دوسرے مضامین میں شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کے عہد کے حالات سے واقفیت کو ضروری قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں میرؔ کی شاعری پر ان کے حالات کا زبردست اثر ہوا۔ خانِ آرزو سے تعلقات ختم ہونا، بے سہارا زندگی اور دیوانگی کا دورہ، ان سب سے میرؔ متاثر ہوئے۔ بقول آلِ احمد سرور ''اس دور کی تمام سماجی حقیقتیں میرؔ کی شاعری میں جلوہ گر ہوئی ہیں''۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے میرؔ پر کسی باقاعدہ مضمون تک تو میری رسائی نہیں ہو سکی

مگر اُن کی کتاب ''اردو شاعری کا سماجی پس منظر'' میں میرؔ کا ذکر ملتا ہے۔ اعجاز حسین نے میرؔ کی شاعری کو اس عہد کے معاشرہ کی بدحالی، بداخلاقی، بے بسی کا عکاس قرار دیا ہے۔

علی سردار جعفری نقدِ میر کے سلسلے کے اہم ترقی پسند نقاد ہیں۔ ان کی کتاب ''پیغمبرانِ سخن'' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ مگر میرؔ کی شاعری پر ان کا مضمون رسالہ شاعر میں ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کی اشاعت دیوانِ میر کے دیباچے کے طور پر ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کی طرح علی سردار جعفری نے بھی میرؔ کی شاعری کا سلسلہ ان کے عہد میں تلاش کیا۔ علی سردار جعفری نے لکھا ہے کہ عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔ علی سردار جعفری کا خیال ہے کہ میرؔ کی شاعری ان کے عہد سے مربوط بھی ہے اور ماوراء بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے وقت نوجوان شاعروں نے دوسو برس گزر جانے کے بعد بھی غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کو چھوڑ کر میرؔ کے دامن میں پناہ لی۔ میرؔ کے عہد کے مالی نقصان اور اخلاقی پستی کی اندوہناک تصویریں ان کی شاعری میں محفوظ ہیں۔

جعفری نے میرؔ کی غزلوں کا تجزیہ بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جس میں انھوں نے براہ راست سماجی، معاشی اور سیاسی مضامین کو ڈھال دیا ہے۔ بقول جعفری براہ راست انداز بیان کے علاوہ میرؔ نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست وریخت کو محبوب کے پردے میں بیان کیا ہے۔ اس دور کے باہری حملوں میں ہوئے مظالم کی داستان شاید میرؔ کے لیے براہ راست بیان کرنا مشکل رہا۔ اس لیے انھوں نے ترقی پسند ناقدین کی طرح علامتوں کے ذریعہ اپنی بات کہی۔ میرؔ کے تصورِ محبوب کے سلسلے میں علی سردار جعفری نے ایک ایسی اہم بات لکھی جس پر جتنا زیادہ غور کریں اتنے ہی نئے نکات پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ محبوب کے ظالمانہ تصور کے پیچھے حالات زمانہ کا ایک سماجی شعور ہے اور ان بظاہر سادہ شعروں کی تہہ میں دبا ہوا ایک احتجاج ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سردار جعفری نے میرؔ کی شاعری میں معنوی تہہ داری اور سماجی اشاروں کی جس دنیا کو ظاہر کیا اس پر پہلے اس طرح غور نہیں کیا گیا تھا۔

محمد حسن نے میرؔ پر کوئی باقاعدہ کتاب تو نہیں لکھی لیکن اپنی تصنیف ''اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر عہد میر تک'' میں انھوں نے میرؔ کے کلام پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کا رشتہ عہد حاضر سے ملایا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''میر کی آواز عہدِ حاضر کے صنعتی دور کے تشنج زدہ انسان کے لیے بھی اعتبار واسناد کا درجہ رکھتی ہے۔'' آج ہم اسی تنہائی، بے چینی اور کشمکش کا شکار ہیں جس کے میرؔ تھے۔ محمد حسن نے بھی علی سردار جعفری کی طرح اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ میر نے اپنی بات رمزیہ اور علامتی انداز میں کہی ہے۔

میر کے بارے میں ایک اہم نکتہ جس کی طرف تمام ترقی پسند ناقدین نے توجہ دلائی وہ میرؔ کے قنوطی شاعر ہونے کی تردید ہے۔ ترقی پسند ناقدین نے میر کو ایک ایسا بلند حوصلہ اور ہمت والا شاعر قرار دیا ہے جس نے ایک طرف تو ظلم وستم کی انتہا کو رمزیہ انداز میں پیش کیا وہیں دوسری طرف مظلوموں کے انتقام، ان کے احتجاج اور ان کی شان مقاومت کو بھی بیان کیا۔ ان کا خیال ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ میر کی شاعری ان کی زندگی کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ ہم میرؔ کے عہد کو ان کی شاعری میں زندہ سانس لیتا، چلتا دیکھتے ہیں اس اہم نکتہ کی طرف سب سے پہلے ترقی پسند ناقدین نے اشارہ کیا۔ صرف میر ہی نہیں بلکہ تمام شخصیتوں کے مطالعے میں ترقی پسند ناقدین نے اسی نقطۂ نظر سے کام لیا۔ حالانکہ ترقی پسند ناقدین نے غالبؔ یا کسی اور شاعر کے مقابلے میں میر پر کم لکھا ہے لیکن انھوں نے میر کے بارے میں عام نقطۂ نظر کو تبدیل کردیا کہ میر حرماں نصیب یاس پرست شاعر ہیں۔ ترقی پسندوں کے نزدیک میر زندگی کے شاعر ہیں جو زندگی وہ جیتے ہیں اسی کو اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید فنی تخلیقات کو ماحول، سماج، اور زمانے سے جوڑتی ہے۔ ترقی پسند تنقید نے اُردو شاعری کے استعاراتی اور علامتی نظام کو جس طرح ایک نئی معنویت بخشی۔ اُسی طرح ترقی پسند ناقدین نے میرؔ کی صوفیانہ یا عاشقانہ علامتوں کو ایک نئی معنویت دینے کی کوشش کی۔ ترقی پسند تنقید سے پہلے میرؔ عاشق اور قنوطی تھے یا پھر تصوف کے گیت گاتے تھے۔ ترقی پسند ناقدین نے کلام میر کو صرف ان کے اپنے عہد کا عکاس قرار نہیں دیا، اس کا سلسلہ ہمارے عہد سے بھی ملا دیا۔ اسی وجہ سے آج ہم میر کو غالبؔ کی بہ نسبت زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں اور میرؔ کے کلام میں اپنے جذبات واحساسات کی مصوری کے ساتھ

اس تناؤ اور کشمکش کو دیکھ سکتے ہیں جس سے ہم دو چار ہیں اور کلام میرؔ اس تناؤ اور کشمکش کی تجسیم کرتا ہے۔

بہرحال ترقی پسند ناقدین نے میرؔ کو سماجیاتی مطالعے اور عہد میرؔ کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ یہی نقدِ میرؔ کو ترقی پسند ناقدین کا خصوصی عطیہ ہے۔

حواشی

۱۔ مجنوں گورکھپوری۔ میرؔ اور ان کی شاعری۔ ص۔۳۲۔۳۱ نکاتِ مجنوں کتابستان اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ ایڈیشن ۱۹۵۷ء

۲۔ مجنوں گورکھپوری۔ میرؔ اور ان کی شاعری۔ ص۔۲۰۔ نکاتِ مجنوں کتابستان اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ ایڈیشن ۱۹۵۷ء

۳۔ مجنوں گورکھپوری۔ میرؔ اور ان کی شاعری۔ ص۔۲۰۔ نکاتِ مجنوں کتابستان اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ ایڈیشن ۱۹۵۷ء

۴۔ مجنوں گورکھپوری۔ میرؔ اور ان کی شاعری۔ ص۔۲۰۔ نکاتِ مجنوں کتابستان اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ ایڈیشن ۱۹۵۷ء

۵۔ مجنوں گورکھپوری۔ میرؔ اور ان کی شاعری۔ ص۔۳۹۔ نکاتِ مجنوں کتابستان اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ ایڈیشن ۱۹۵۷ء

۶۔ مجنوں گورکھپوری۔ میرؔ اور ان کی شاعری۔ ص۔۲۲۔ نکاتِ مجنوں کتابستان اسرار کریمی پریس الٰہ آباد۔ ایڈیشن ۱۹۵۷ء

۷۔ مجنوں گورکھپوری۔ میر اور ہم۔ ص۔۵۴۔۵۳۔۲۵۲۔ ماخوذ از ادب اور زندگی، اردو گھر علی گڑھ، تیسرا ایڈیشن ۶۵۔۱۹۶۴ء

۸۔ مجنوں گورکھپوری۔ میر اور ہم۔ ص۔۲۵۸۔ ماخوذ از ادب اور زندگی، اردو گھر علی گڑھ، تیسرا ایڈیشن ۶۵۔۱۹۶۴ء

۹۔ مجنوں گورکھپوری۔ میر اور ہم۔ ص۔۵۶۔۲۵۵۔ ماخوذ از ادب اور زندگی، اردو گھر علی گڑھ، تیسرا ایڈیشن ۶۵۔۱۹۶۴ء

۱۰۔ مجنوں گورکھپوری۔ میر اور ہم۔ ص۔۲۶۳۔ ماخوذ از ادب اور زندگی، اردو گھر علی گڑھ، تیسرا ایڈیشن ۶۵۔۱۹۶۴ء

۱۱۔ مجنوں گورکھپوری۔ میر اور ہم۔ ماخوذ از ادب اور زندگی۔ اُردو گھر علی گڑھ

۱۲۔ احتشام حسین کلیاتِ میرؔ۔ جلد اوّل، مقدمہ، ص۔۳۔ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد ۱۹۷۲ء

۱۳۔ احتشام حسین کلیات میرؔ۔ جلد اوّل، مقدمہ، ص۔ ۷۔ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۲ء

۱۴۔ احتشام حسین کلیات میرؔ۔ جلد اوّل، مقدمہ، ص۔ ۸۔ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۲ء

۱۵۔ احتشام حسین کلیات میرؔ۔ جلد اوّل، مقدمہ، ص۔ ۹۔ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۲ء

۱۶۔ احتشام حسین کلیات میرؔ۔ جلد اوّل، مقدمہ، ص۔ ۱۰۔ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۲ء

۱۷۔ احتشام حسین کلیات میرؔ۔ جلد اوّل، مقدمہ، ص۔ ۱۲۔ ۱۳۔ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۷۲ء

۱۸۔ آل احمد سرور۔ میر کے مطالعے کی اہمیت۔ افکارِ میرؔ، ایم حبیب خاں ص۔ ۱۲۸۔ لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج دہلی ۱۹۶۷ء

۱۹۔ آل احمد سرور۔ میرؔ کے مطالعے کی اہمیت۔ افکارِ میرؔ، ایم حبیب خاں ص۔ ۱۲۸۔ لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس ،دریا گنج دہلی ۱۹۶۷ء

۲۰۔ آل احمد سرور۔ میرؔ کے مطالعے کی اہمیت۔ افکارِ میرؔ، ایم حبیب خاں ص۔ ۱۳۰۔ لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج دہلی ۱۹۶۷ء

۲۱۔ آل احمد سرور۔ میرؔ کے مطالعے کی اہمیت۔ افکارِ میرؔ، ایم حبیب خاں ص۔ ۱۳۲۔ لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج دہلی ۱۹۶۷ء

۲۲۔ آل احمد سرور۔ میرؔ کے مطالعے کی اہمیت۔ افکارِ میرؔ، ایم حبیب خاں ص۔ ۱۳۲۔ لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج دہلی ۱۹۶۷ء

۲۳۔ آل احمد سرور۔ میرؔ کے مطالعے کی اہمیت۔ افکارِ میرؔ، ایم حبیب خاں ص۔ ۱۳۲۔ لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریا گنج دہلی ۱۹۶۷ء

۲۴۔ آل احمد سرور۔ میرؔ میری نظر میں۔ ص۔ ۱۲۔ بحوالہ "آجکل" "میر تقی میرؔ نمبر" مارچ ۱۹۸۳ اردو پبلی کیشن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

۲۵۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین اردو شاعری کا سماجی پس منظر۔ ص۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ مطبوعہ نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد ۱۹۶۸ء

۲۶۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ دیباچہ ص۔ ۱۱۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۲۷۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ دیباچہ ص۔ ۶۰۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۲۸۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ دیباچہ ص۔ ۶۷۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۲۹۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ تمہید ص۔ ۷۹۔ ۸۰۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۳۰۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ دیباچہ ص۔ ۱۰۵۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۳۱۔ میر تقی میرؔ۔ ذکرِ میرؔ بحوالہ۔ آپ بیتی۔ پیغمبرانِ سخن ص۔ ۱۰۸

۳۲۔ محمد حسن عسکری بحوالہ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ دیباچہ ص۔ ۱۱۳۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۳۳۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ ص۔ ۱۲۵۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۳۴۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ ص۔ ۱۲۶۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۳۵۔ علی سردار جعفری۔ پیغمبرانِ سخن۔ ص۔ ۱۳۳۔ ۱۳۱۔ مکتبہ گفتگو، بمبئی ۱۹۷۰ء

۳۶۔ اختر اورینوی، میر دہلوی۔ حدیثِ میر۔ احمر لاری۔ ص۔ ۵۳۔ میر اکیڈمی ۱۹۶۷ء

۳۷۔ محمد حسن۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہد میرؔ تک) سیما آفسیٹ پریس، دہلی۔ ۱۹۸۹ء

۳۸۔ محمد حسن۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہد میرؔ تک) ص۔ ۱۴۔ سیما آفسیٹ پریس، دہلی۔ ۱۹۸۹ء

۳۹۔ محمد حسن۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہد میرؔ تک) ص۔ ۲۱۔ سیما آفسیٹ پریس، دہلی۔ ۱۹۸۹ء

۴۰۔ محمد حسن۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہد میرؔ تک) ص۔ ۲۱۸۔ سیما آفسیٹ پریس، دہلی۔ ۱۹۸۹ء

۴۱۔ محمد حسن۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہد میرؔ تک) ص۔ ۶۷۔ سیما آفسیٹ پریس، دہلی۔ ۱۹۸۹ء

۴۲۔ عبادت بریلوی، میر تقی میر۔ دیباچہ ادارۂ ادب و تنقید لاہور فروری ۱۹۸۰ء

۴۳۔ عبادت بریلوی۔ کلیاتِ میرؔ۔ ص۔ ۴۔ فروری ۱۹۵۸ء اُردو دنیا کراچی

۴۴۔ عبادت بریلوی۔ جہانِ میرؔ۔ پیش لفظ ص۔ ۲۔ ادارۂ ادب و تنقید لاہور ۲۵؍جون ۱۹۸۵ء

۴۵۔ ظ۔ انصاری۔ "میر کلچر" مشمولہ ماہنامہ آج کل میر تقی میر نمبر ص۔ ۵۵۔ پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۸۴ء

۴۶۔ ظ۔ انصاری۔ "میر کلچر" مشمولہ ماہنامہ آج کل میر تقی میر نمبر ص۔ ۶۱۔ پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۸۴ء

۴۷۔ ظ۔ انصاری۔ "میر کلچر" مشمولہ ماہنامہ آج کل میر تقی میر نمبر ص۔ ۶۴۔ پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۸۴ء

۴۸۔ ظ۔ انصاری۔ "میر کلچر" مشمولہ ماہنا کل میر تقی میرؔ نمبر مارچ ۱۹۸۴ء

۴۹۔ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ گلِ صد رنگ مقدمہ۔ ص۔ ۱۴۔ تنویر پریس، امین آباد لکھنؤ اگست ۱۹۶۰ء

۵۰۔ یوسف سرمست، عرفانِ نظر۔ ص۔ ۱۔ کاروان پرنٹنگ پریس۔ حیدر آباد۔ دسمبر ۱۹۷۷ء

۵۱۔ یوسف سرمست، عرفانِ نظر۔ ص۔ ۲۔ کاروان پرنٹنگ پریس۔ حیدر آباد۔ دسمبر ۱۹۷۷ء

۵۲۔ یوسف سرمست، میرؔ کی شخصیت اور شاعری، عرفانِ نظر۔ ص۔ ۶۔ ۵۔ کاروان پرنٹنگ پریس۔ حیدر آباد۔ دسمبر ۱۹۷۷ء

باب چہارم

میرؔ کے دوسرے اہم ناقدین

(ترتیب بہ حساب سنہ اشاعت کتب/مضامین)

۱۔	صفدر آہ	(الف)	فلسفۂ میرؔ ۱۹۳۶ء
		(ب)	میر اور میریات ۱۹۷۲ء
۲۔	کلیم الدین احمد		اردو شاعری پر ایک نظر ۱۹۴۴ء
۳۔	جعفر علی خاں اثرؔ	(الف)	میرؔ اور عشق (رسالہ نگار) ۱۹۲۶ء
		(ب)	مزامیر ۱۹۴۷ء
		(ج)	میرؔ کی باتیں (رسالہ ادبی دنیا اگست) ۱۹۵۰ء
۴۔	خواجہ احمد فاروقی		میرؔ حیات اور شاعری ۱۹۵۴ء
۵۔	سید عبداللہ		نقدِ میر ۱۹۵۸ء
۶۔	نثار احمد فاروقی	(الف)	میرؔ کی آپ بیتی (ترجمہ ذکرِ میرؔ) ۱۹۵۷ء
		(ب)	دلّی کالج میگزین ۱۹۶۲ء
		(ج)	تلاشِ میرؔ ۱۹۷۴ء میر تقی میرؔ ۱۹۸۵ء
۷۔	حسن عسکری	(الف)	جدیدیت غالب اور میرؔ جی رسالہ ساقی جون ۱۹۴۵ء
		(ب)	ساقی (میرؔ نمبر) ستمبر ۱۹۵۸ء
		(ج)	میرؔ اور نئی غزل اور دوسرے مضامین
۸۔	ناصر کاظمی	(الف)	بنائے تازہ (مضمون) رسالہ سویرا نمبر ۲۱،۲۰،۱۹
		(ب)	دھواں سنا ہے پچھلے اس نگر کی طرف۔ رسالہ ماہِ نو ۱۹۵۴ء
		(ج)	خوشبو کی ہجرت، رسالہ سویرا نمبر ۱۸،۱۷

۹۔ فراق گورکھپوری	(الف) میرؔ کی عالمگیر مقبولیت دلی کالج میگزین ۱۹۶۲ء
	(ب) اور میرؔ کی شاعری کے کچھ پہلو (حدیثِ میر) ۱۹۶۷ء
۱۰۔ شبیہہ الحسن	''میرؔ کے نہاں خانے'' (مضمون) تنقید و تحلیل ۱۹۵۸ء
۱۱۔ سلیم اختر	میر تقی میرؔ: دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب (مضمون)
	غالب نامہ ۲۰۰۰ء
۱۲۔ خالد سہیل	میرؔ کا فن اور پاگل پن (مضمون) میر تقی میرؔ عالمی سمنار مارچ ۲۰۰۰ء
۱۳۔ رالف رسل	"Three Mughal Poets" ۱۹۶۸ء
۱۴۔ محمد عمر	اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میر کا عہد۔ ۱۹۷۳ء
۱۵۔ حامدی کاشمیری	کارگہہ شیشہ گری ۱۹۸۲ء
	انتخاب کلام میرؔ ۱۹۸۸ء
۱۶۔ جمیل جالبی	میر تقی میرؔ ۱۹۸۳ء
۱۷۔ قاضی افضال حسین	میرؔ کی شعری لسانیات ۱۹۸۳ء انتخاب غزلیات میرؔ ۱۹۸۴ء
۱۸۔ قاضی عبدالودود	عیارستان، میرؔ ۱۹۸۴ء
۱۹۔ گوپی چند نارنگ	اسلوبیات میرؔ ۱۹۸۵ء
۲۰۔ مُحب عارفی	میر تقی میرؔ اور آج کا ذوقِ شعری ۱۹۸۹ء
۲۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد اوّل ۱۹۹۰ء
	شعر شور انگیز جلد دوم ۱۹۹۱ء
	شعر شور انگیز جلد سوم ۱۹۹۲ء
	شعر شور انگیز جلد چہارم ۱۹۹۴ء

بیسویں صدی کے ابتدائی تیس پینتیس برسوں میں نقدِ میرؔ میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا، سوائے مجنوں کے مضمون ''میر اور ان کی شاعری'' اور صفدر آہ کی 'فلسفۂ میرؔ'' کے اس دور میں میرؔ پر کوئی خاص کتاب سامنے نہیں آئی، کیونکہ یہ دور غالبؔ پرستی کا دور تھا۔ ایسے میں سب سے پہلے اثرؔ لکھنوی نے میرؔ کی حمایت میں قلم اُٹھایا اور ''مزامیر'' کے ذریعہ میر کی بازیافت کی۔ اس کتاب سے قبل میرؔ پر اثرؔ کے مختلف مضامین شائع ہو چکے تھے مگر ''مزامیر'' میں وہ میر پرست کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اثرؔ لکھنوی کے علاوہ، صفدر آہ، سید عبداللہ، خواجہ احمد فاروقی، نثار احمد فاروقی کی کتابوں اور حسن عسکری، ناصر کاظمی، فراقؔ گورکھپوری، کے مضامین نے نقدِ میرؔ میں گراں قدر اضافے کیے، اس دور میں سماجی، تاریخی، نفسیاتی، فنی، جمالیاتی، اسلوبیاتی غرض ہر نقطۂ نظر سے میرؔ کا مطالعہ کیا گیا۔

موازنہ کی بنیاد پر میرؔ و غالبؔ کی عظمت کی شناخت کی گئی۔ اثرؔ لکھنوی نے میرؔ کو غالبؔ کے پیش رو کے طور پر پیش کیا۔ اسی درمیان حامدی کاشمیری اور مُحب عارفی کی کتابیں بھی سامنے آئیں۔ مگر بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کو نقدِ میرؔ کا عروج کہا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے آخری دہائی میں گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتِ میرؔ، قاضی افضال حسین کی ''میرؔ کی شعری لسانیات'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کی 'شعرِ شور انگیز'' تفہیم میر میں نئی پیش رفت ہیں۔

قاضی سید محمد صفدر آہؔ ۲۸/ اگست ۱۹۰۵۔ ۲۹/ جولائی ۱۹۸۰ء

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے صفدر آہ نے میرؔ پر دو کتابیں لکھیں ان کی پہلی تصنیف کا نام ''فلسفہ میرؔ'' ہے اور دوسری ''میر اور میریات'' ہے فلسفہ میر جولائی ۱۹۳۶ میں شائع ہوئی، جب کہ صفدر آہ اس کا سنہ اشاعت ''میر اور میریات'' میں ۱۹۳۴ء لکھتے ہیں، حالانکہ کتاب کے صفحہ اوّل اور صفحۂ آخر میں اس کا سنہ اشاعت ۱۹۳۶ء لکھا ہوا ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''میر اور میریات'' ۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ بہر حال 'فلسفۂ میرؔ''

میر پر لکھی گئی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ خود صفدر آہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اسی سال نیرنگ کا ''میر نمبر'' شائع ہونے والا تھا۔ صفدر آہ کا مضمون کسی سبب سے رسالہ نیرنگ میں شامل نہ ہو سکا۔ جب دوبارہ سے انھوں نے اس کتاب کو پڑھا تو پھر سے اس کی اشاعت کا خیال آیا۔ لکھتے ہیں:

> ''دبی زبان سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ غالباً یہ پہلا تبصرہ ہے جو کلام میر پر نکل رہا ہے لہٰذا اگر میں اپنی اس ادبی خدمت پر فخر کروں تو شاید اسے خودستائی کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔''[1]

کتاب کا اہم حصہ وہ ہے جس میں میر کی شاعری خصوصاً میر کی غزل گوئی پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے صفدر آہ کے خیال میں میر کی شاعری کی اہم خصوصیت سادگی و سلاست ہے۔ ان کی شاعری تصنع سے پاک ہے۔ تاثیر اس کا اہم جز ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> میر صاحب اپنے اشعار میں بالعموم کسی دوسرے شخص سے تخاطب نہیں رکھتے بلکہ تاثر اور جذبات کے جوش میں بار بار خود کو پکار اٹھتے ہیں، رنج و الم، شادی و مسرت غرض جو کیفیات ان کے قلب و دل کو مس کرتی ہیں اون کے اثرات کی کہانی وہ خود ہی کو سنا کر کبھی رو لیتے ہیں اور کبھی شاد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصنع کے ناپاک ہاتھ ان کی شاعری تک کبھی نہ پہنچ سکے۔''[2]

صفدر آہ کے مطابق میر کے غم کا تعلق ان کی ذات سے ہے وہ خود ہی رو لیتے ہیں اور خود ہی ہنس دیتے ہیں۔ جس قسم کی کیفیات ان کے دل پر جس وقت اثر کرتی ہیں وہ اس کو اپنی غزلوں میں ڈھال لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا کلام تصنع سے پاک ہے۔ ان کی شاعری سچے جذبات کی شاعری ہے۔ صفدر آہ نے لکھا ہے کہ میر کا کلام مکمل طور پر ان کی زندگی اور ان کے کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اگر کوئی شخص ان کی شخصیت اور حالات زندگی سے واقف نہ ہو تو بھی وہ ان کے اشعار کے ذریعہ ان کی زندگی و حالات کا خاکہ اپنے ذہن و دماغ میں مرتب کر سکتا ہے۔

صفدر آہ کا تنقیدی طریقہ کار یہ ہے کہ وہ غزل کے اصولوں کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر

اس کی روشنی میں کلام میر کا جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ غزل میں عامیانہ الفاظ کا استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ نہ الفاظ اتنے ثقیل ہوں کہ بالعموم مستعمل نہ ہوں بلکہ ایک موثر اور شستہ زبان میں ادائے مطلب کرنا چاہئے بہت زیادہ تشبیہات و استعارات صنائع بدائع، مبالغہ کا استعمال نہیں ہونا چاہئے بہت زیادہ شوخ مضامین بھی طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔

صفدر آہ نے کلام میر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر کی شاعری میں نہ تو عامیانہ الفاظ کا استعمال ملتا ہے اور نہ ہی ثقیل الفاظ کا بلکہ ان کی زبان موثر اور شستہ ہے اگر کسی مضمون میں شوخی بھی ہے تو ایک محدود دائرے میں ہے۔

صفدر آہ میر کا موازنہ ان کے ہم عصر شعراء درد اور سودا سے کرتے ہیں۔ دراصل یہ اس دور کی روایت سی ہوگئی تھی کہ شعراء کے ہم عصروں سے ان کا تقابل کیا جاتا تھا۔ صفدر آہ لکھتے ہیں کہ جہاں تک غزل کا سوال ہے میر کی مثال نہیں مل سکتی۔ وہ غزل کے معاملے میں بے عدیل ہیں۔ اور تاثیر کے بھی بادشاہ ہیں۔ کیونکہ تاثیر ان کی غزلوں کے مقابلے میں ان کے ہم عصروں کے یہاں بہت کم ہے۔

> ------میر صاحب کے یہاں نشتریت، محزونیت، واردات قلبی اور دیگر وجدانی کیفیات کا جلوہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے برخلاف سودا کے یہاں، جبروت، شوکت الفاظ، تصنع اور دماغی قوتوں کا تماشا دکھائی دے گا۔------
>
> وہی بات جسے میر صاحب نہایت سکنت کے ساتھ نرم لہجے میں بیان کریں گے سودا پر شوکت سے پر شوکت لہجے میں پیش کریں گے۔--------
>
> گویا مختصر الفاظ میں میر صاحب اور سودا کی شاعری میں فرق اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ میر صاحب کی شاعری بالقلب اور سودا کی شاعری بالدماغ ہوتی تھی۔"۳

دراصل سودا کا میدان غزل نہیں قصیدہ تھا لہٰذا میر جیسے غزل کے استاد کی طرح ان کے یہاں نرمی و تاثیر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ قصیدہ کی شان و شوکت پائی جاتی ہے۔ غزل کے علاوہ

صفدر آہ میر کی تمام اصناف شاعری قصیدہ، مثنوی، رباعی سلام ومراثی پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں ۔انھوں نے مسدس، مربع مستزاد، ترجیع بند وترکیب بند ہفت بند سب پر اظہار خیال کیا ہے۔

صفدر آہ میر کے عہد وماحول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر کسی قوم کی صحیح حالت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے مستند شعراء کا کلام اس سلسلے میں خاص مدد کرسکتا ہے۔

> ''ایک حقیقی شاعر کا مجموعۂ کلام اپنے عہد کے رسم ورواج طرزِ معاشرت اور اسی قسم کی دیگر باتوں کی ہمیشہ زندہ رہنے والی تاریخ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اوس ماحول سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔جن پر اس کی شاعری کی بنیاد ہوتی ہے۔بحیثیت ایک کامل شاعر ہونے کے میر صاحب کے مجموعۂ کلام میں بھی یہی بات ہے جس کے مطالعہ سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا۔''[۴۴]

صفدر آہ کا یہ خیال کہ کسی بھی شاعر کے کلام کی بنیاد اس عہد اور ماحول پر ہوتی ہے جس میں وہ زندگی گزارتا ہے کافی وزن رکھتا ہے، کیونکہ سماجی تنقید کا سارا زور اسی بات پر ہے کہ شاعر/مصنف نے کن حالات میں زندگی گزاری۔اور میر تو اس عہد میں شاعری کرر ہے تھے جب ہر طرف سے تباہی وبربادی ہندوستان کو اپنے شکنجے میں کسے ہوئے تھی۔وہ ایک ایسا دور تھا جس کو تاریخ فراموش نہیں کرسکتی تو پھر میر جیسا حساس شاعر کیسے اس عہد کو اپنے کلام سے دور رکھ سکتا ہے۔صفدر آہ نے اپنی بات کو مدلل انداز میں کہنے کے لیے کلام میر سے مثالیں بھی خوب دی ہیں۔انھوں نے لکھا ہے:

> ''میر صاحب کا کلام خود تاریخ کا ایک پر معلومات ورق ہے جس کی عبرت اور محزونیت دیکھ کر ایک مورخ نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ وہ جس دور کے شاعر ہیں وہ ایک ایسا دور تھا کہ جس میں ہندوستان کی قومی سلطنتیں کچھ تو خانہ جنگیوں کی وجہ سے اور کچھ غیر ملکی لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے تباہ ہو رہی تھیں دیسی بادشاہ محض بادشاہِ شطرنج کی صورت میں رہ گئے تھے۔ہر طرف افلاس

غربت اور تباہی کا دور تھا۔ خونریزی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی۔
قادر غلام نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ یہ دردانگیز اور اہم
واقعہ کلام میر میں اس طرح ملتا ہے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں ۵

صفدر آہ کے یہ اقتباسات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کسی بھی شاعر کو ہم اس کے دور سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ سب کی جڑیں اپنے زمانے میں پیوست ہوتی ہیں اور کوئی بھی اپنے عہد کو فراموش نہیں کر سکتا۔ صفدر آہ کا یہ خیال کہ میرؔ کا کلام تاریخ کا ایک ورق ہے۔ اپنے اندر معنی کی وسعت رکھتا ہے۔ کیونکہ نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال آپسی خانہ جنگیاں کیا کچھ نہیں ہے جو میرؔ کے کلام میں موجود نہیں۔ بہر حال ان کا Approach براہِ راست نہ سہی مگر بالواسطہ طور پر انھیں سماجی ناقدین کے قریب لے آتا ہے۔

صفدر آہ کی دوسری کتاب ''میرؔ اور میریات ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی حالانکہ فلسفہ میرؔ کو اس دور میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا خاص سبب اس کا موضوع تھا۔ پھر آخر صفدر آہ نے دوسری کتاب کیوں لکھی؟ اس کا جواب خود صفدر آہ نے ''میرؔ اور میریات'' کے پیش لفظ میں دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''فلسفہ میرؔ'' میں خوبیوں کے ساتھ بعض بے حد اہم نقائص بھی موجود ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ اس کتاب کے بعض ادبی نظریے ایسے ہیں جن کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔
۲۔ اس کتاب میں محض یادداشت اور سماعت پر بھروسہ کر کے ایسے شعر بھی آ گئے ہیں جو میرؔ کے شعر نہیں ہیں یا بعض شعروں میں میرؔ کے الفاظ بدل گئے ہیں۔
۳۔ اس کتاب میں بعض حالات اور واقعات تجسس اور تحقیق کے بغیر غلط درج ہو گئے ہیں۔ ۶

بہر حال ''فلسفہ میرؔ'' میں خود صفدر آہ کو چاہے جتنے نقائص نظر آئیں میرؔ پر پہلی باقاعدہ تصنیف ہونے کے سبب اس کی اہمیت اپنی جگہ پر ہمیشہ مسلم رہے گی۔ رہی ''میرؔ اور

میریات'' تو وہ میر تنقید کے سلسلے میں ''فلسفۂ میرؔ'' کے بعد ہی اپنا مقام پائے گی۔

حالانکہ تاریخی اعتبار سے بھلے ہی صفدر آہ کی یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی اور فلسفۂ میرؔ ۱۹۳۶ء میں مگر ''میر اور میریات'' کا مطالعہ ہمیں ان کی محنت اور جانفشانی کا قائل کر دیتا ہے۔ صفدر آہ نے اس کتاب میں کلام میر کو نکات اور ذکر میرؔ کی روشنی میں تاریخی اعتبار سے دیکھا۔ دراصل صفدر آہ ان ناقدین میں ہیں۔ جنھوں نے میرؔ کی شاعری کی طرف خصوصی توجہ کی۔ ان کی زندگی کے بارے میں بعض اہم باتوں کی نشاندہی کی اور اس طرح میرؔ کے زمانے کے تاریخی حالات زیادہ تفصیل سے بیان کیے جو اشارتاً ''ذکر میرؔ'' میں ہمیں ملتے ہیں۔

صفدر آہ نے ایک نئے مطالعے کی بنیاد ڈالی۔ وہ مطالعہ تھا ''میرؔ خود اپنے کلام کی روشنی میں'' یعنی میرؔ کی زندگی یا حالات، یا میر کے بارے میں جو باتیں کہی جاتی رہیں۔ انھیں میر کے کلام میں انھوں نے Trace کیا۔ مثلاً میرؔ نے اپنے سید ہونے کا ذکر کیا۔ اپنے والد کے درویش ہونے کا ذکر کیا۔ اپنی ماہانہ آمدنی یا میر اپنے گھر کے اندر کس طرح تھے، کن نشوں کے عادی تھے، دربار سے ان کا کیا تعلق تھا، یہ ساری چیزیں نثری حوالوں کے بجائے پہلی بار انھوں نے خود میر کے کلام سے Trace کیں یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے، جو پہلی بار کیا گیا یعنی اب تک یہ حوالے تو دیئے گئے کہ فلاں کی شاعری میں فلاں کا ذکر ہے لیکن کسی کی شاعری کو اس کی زندگی سے کسی نے مرتب نہیں کیا تھا اس کو سوانحی مطالعہ کہا جائے یا سماجی مطالعہ کہا جائے لیکن صفدر آہ نے پہلی بار اس کی کوشش کی اور میرؔ کے بارے میں بہت سی چیزیں پہلی بار ان کی شاعری سے مرتب کیں۔

''میر اور میریات'' دو حصّوں میں منقسم ہے ظاہر ہے پہلا حصّہ سوانحی، تاریخی، اور تہذیبی ہے۔ یعنی میر دہلی میں اور دہلی سے ان کی لکھنؤ آمد، لکھنؤ میں وہ تقریباً ۲۹ سال رہے اس دوران وہ کن حالات سے گزرے اور باہر کی دنیا سے ان کا کیسا ربط وضبط رہا، ان کی فارسی شاعری اور اردو شاعری، ان ساری چیزوں کا جائزہ حصہ اوّل میں ہے۔ حصہ اوّل میں صفدر آہ نے میرؔ کے دو اہم ناقدین محمد حسین آزاد اور قاضی عبدالودود پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

دوسرے حصّے کو ہم میرؔ پر تنقید کا حصہ کہہ سکتے ہیں یہ حصہ بہت اہم ہے اس لیے کہ

اس میں صفدر آہ نے اصناف کا مطالعہ یعنی غزل رباعی، مثنوی، قصیدہ کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن کا مطالعہ الگ الگ کیا ہے اور اس کے بعد اس کے تحت پائی جانے والی شعری خصوصیات جو بے حد اہم ہیں۔ مثلاً حزن وملال، میر کا لہجہ، میر کے فلسفیانہ نکات یا میر کے یہاں انسان دوستی، آفاقیت، میرؔ کے بہتر نشتر جن کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف، تصوف کے مختلف رجحانات کے اثرات، میرؔ کی شاعری میں مصوری یا تصویر کشی کا فن پھر ایک اور چیز جس کی طرف صفدر آہ نے توجہ کی وہ میر کا دوسرے شعراء کے ساتھ تقابلی مطالعہ ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ تذکرہ نگار بھی تقابلی مطالعہ کرتے رہے اور صفدر آہ تک بلکہ ان کے بعد بھی میرؔ کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا رہا۔ یہ شاید اس وقت کی تنقید کا ایک رویہ تھا کہ دو چیزوں کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے مرتبے اور عظمت کا تعین کیا جائے۔ لیکن ایک اہم پہلو صفدر آہ کے یہاں یہ ملتا ہے کہ انھوں نے میر کے اثرات کو میرؔ کے بعد آنے والے بعض اہم شعرا کے یہاں تلاش کیا ہے اور اس میں انھوں نے خاص طور پر نظیرؔ، غالبؔ، آرزو لکھنوی کا ذکر کیا ہے۔

صفدر آہ نے اس کتاب کے دیباچے میں ایک جملہ لکھا ہے جو بے حد اہم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''میرؔ جیسا بڑا شاعر ایک اہم پس منظر کے بغیر نہیں پیدا ہوتا''۔ اس طرح ہم دیکھیں تو صفدر آہ کی تنقید کے ڈانڈے سماجی تنقید سے جا ملتے ہیں۔ جس پر ترقی پسند ناقدین زور دیتے رہے ہیں یعنی میرؔ کی عظمت کا راز ان حالات میں پوشیدہ ہے جن حالات میں میر کا ذہنی اور فکری ارتقاء ہوا اور اسی سے وہ میرؔ کے درد و کرب، یا ان کے ''دل پرخوں کی گلابی'' کو وابستہ کرتے ہیں۔

صفدر آہ کے خیال میں ہر بڑے شاعر کی طرح میرؔ بھی اپنے عہد کے ترجمان ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کے عہد کے غمگین سائے کلام میرؔ میں ہر جگہ منڈلا رہے ہیں۔ میر کا زمانہ غارت گری، اخلاقی پستی، بے اعتمادی اور شدید غیر یقینی حالات کا تھا۔ میرؔ کی حساس طبیعت اور شریف دل پر ان حالات نے جو ضرب لگائی۔ میرؔ کا اس سے تڑپ اٹھنا یقینی تھا۔ میرؔ کی شاعری کے ایک ایک لفظ میں یہی درد بھرا ہوا ہے۔[۷]

غم، مایوسی، الجھن، خدا سے شکایت کیا نہیں ہے جو اس عہد میں موجود نہیں، شاید اسی لیے میرؔ کو ترقی پسندوں سے قبل کے ناقدین نے صرف غم واندوہ کا شاعر سمجھ لیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک ہماری تنقید تذکروں اور چند رسائل تک محدود تھی، مگر جیسے جیسے مغربی اثرات اردو ادب میں داخل ہوئے تنقید نے بھی اپنے آپ کو وسعت دی اور میرؔ کے غم کی گہرائیوں میں ان کا عہد سامنے آنے لگا۔ صفدر آہ نے مزید لکھا ہے:

> ''میرؔ کے اشعار میں انسانیت کا درد، اور محبت وحیات کے آنسو بھرے ہیں۔ ان کے عہد کی پر حزن تاریخی حقیقتیں جیسے محلول ہو کر ان کی غزلوں میں سما گئی ہیں میرؔ کے کلام میں جو فضا پیدا ہوتی ہے اس میں بلاشبہ حزنیت اور یاس ہے۔ لیکن یہ حزنیت اور یاس اس ماحول کا لازمی نتیجہ تھیں۔ میر کے یہاں اگر حزنیت نہ ہوتی تو وہ اپنے عہد کے ترجمان کسی طرح نہ تسلیم کیے جاتے۔۔۔۔۔ میر کی غزل میں ان کا عہد بول رہا ہے اور ان کے شعر حقیقت وقت کے سچے ترجمان ہیں۔ آج کے زمانے یا صدیوں بعد آنے والے زمانے کی مجال نہیں کہ میرؔ کے نام اور ان کی بیان کی ہوئی صداقتوں کو مٹا سکے۔'' [۸]

صفدر آہ جہاں ایک طرف میرؔ کے غم کو ان کے عہد کی دین بتاتے ہیں وہیں دوسری طرف میرؔ کے کلام میں کچھ شگفتہ اشعار کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ میرؔ کے کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں جن میں زندگی ہنستی نظر آتی ہے مگر یہ تعداد بہت کم ہے۔

بھلے ہی میرؔ کے یہ اشعار تعداد میں کم ہوں مگر ان میں خوشی کا عنصر ضرور موجود ہے اور پھر میرؔ جس عہد میں تھے اس عہد میں اگر انسان مسکرا بھی لے تو بہت ہے کیونکہ ایک طرف تو مغل سلطنت کا زوال، دوسری طرف نادر شاہ ابدالی کے حملے اور پھر آپسی خانہ جنگیاں، میر اگر یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد صرف خوشی و مسرت کی بات کرتے تو آج اتنے عظیم نہ ہوتے۔ جس کا عہد ہی اتنی زبردست کشمکش اور تضاد کا شکار ہو وہ شاعر بھلا کیسے مسکرا سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر اس کے یہاں شگفتگی موجود ہے تو یقیناً اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

غرض یہ کہ صفدر آہ کی دونوں کتابیں خواہ وہ "فلسفہ میر" ہو یا "میر اور میریات" نقدِ میر میں خاص اضافہ ہیں۔ صفدر آہ نے میر کے حالاتِ زندگی، میر کے فن، اور میر کی فنکاری کا ہر پہلو سے مطالعہ کیا ہے وہ میر شناسی کے نئے گوشے سامنے لائے ہیں۔ صفدر آہ نقدِ میر کے سلسلے کے بہت اہم ناقد ہیں جنھوں نے اس وقت مطالعۂ میر کی ابتدا کی جب عام طور پر میر کے بارے میں نہیں لکھا جا رہا تھا۔ ان کی دونوں کتابیں مطالعۂ میر کے سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کلیم الدین احمد (۱۹۸۳ء-۱۹۰۸ء)

کلیم الدین احمد بت شکن کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو تنقید میں انھوں نے یہی فریضہ انجام دیا اور بہت سے بت توڑے۔ مگر نقدِ میر کے سلسلے میں کلیم الدین احمد کوئی نئی بات نہیں کہہ پائے۔ "اردو شاعری پر ایک نظر میں" میر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ تاثراتی انداز اختیار کرتے ہیں اور میر کی شخصیت کے فریب سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے لکھتے ہیں:

> "میر وہی داخلی و خارجی اثرات قبول کرتے تھے جو ایک خاص رنگ کے یعنی درد و غم کا نمونہ ہوتے تھے۔۔۔۔۔ مسرور و متبسم اثرات میر کو پسند نہ تھے ان کی پژمردہ دلی شگفتہ جذبہ یا شاد کام خیال کی طرف مائل نہ ہوتی تھی۔" ۹

کلیم الدین احمد میر کو پژمردہ دل شاعر قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں خوشی و مسرت سے میر بہت دور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام پر بھی ان کی شخصیت کا اثر پڑا۔

انھوں نے مزید لکھا ہے:

> "۔۔۔۔۔۔ میر ازل سے دردمند دل لے کر آئے تھے عشق کی کاوشوں نے اس دردمندی میں اضافہ کیا۔ ان کی افتاد زندگی نے عشق کی تائید کی۔ انھیں چاروں طرف اپنی حرماں نصیبی کا نقشہ نظر آیا۔ ماحول نے اس طرزِ خیال کی مزید تائید کی یہی

> سبب ہے کہ میر کی دنیا اتنی تاریک ہے کہیں امید کا ستارہ چمکتا ہوا نہیں دکھائی دیتا۔ ان کی زندگی درد سے معمور تھی۔ اپنوں کی بے رخی، تنگ دستی وعسرت، پھر دلی کی بربادی، عام بربادی وانقلاب نے ان کے حساس دل کو غم والم کا مرقع بنا دیا تھا۔'' ۱۰

کلیم الدین صرف میر کے ذاتی غم کا ہی ذکر نہیں کرتے بلکہ اس عہد کے ماحول کو بھی میرؔ کی مایوسی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اس دور میں جب دلّی کی تباہی و بربادی نے بڑے سے بڑے انسان کو در بدر کر دیا تھا میر بھلا کیسے ان حالات سے اچھوتے رہ سکتے تھے۔ دلّی کی تباہی و بربادی نے ان کے دل کو غم والم کی تصویر بنا دیا۔

کلیم الدین احمد میرؔ کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں لکھتے۔ ان کے یہاں محمد حسین آزاد کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور وہ انھیں کی طرح میرؔ کو یاس و حرماں نصیبی کا شاعر سمجھتے ہیں۔ وہ نقدِ میرؔ میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتے۔

اثر لکھنوی (۱۹۶۷ء۔۱۸۸۵ء)

نواب جعفر علی خاں اثر کا شمار اردو کے اہم اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک خصوصیت جو اپنے ہم عصروں میں انھیں ممتاز بناتی ہے یہ ہے کہ وہ اہم ناقدانِ میر میں سے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنے عہد کے مدّاحِ میر ہیں۔ ان کی کتاب ''مزامیر'' کلامِ میرؔ کا ایک خوبصورت انتخاب ہے جو ۱۹۴۷ء میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔ جعفر علی خاں اثر کے مطالعہ میرؔ کو جمالیاتی اور تاثراتی مطالعہ کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ جعفر علی خاں اثر صرف میرؔ ناقد ہی نہیں بلکہ میرؔ پرست ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں جب میرؔ پر یاسیت کی تہمت عام تھی جعفر علی خاں اثر نے فنی اور جمالیاتی مطالعے سے میرؔ کی اہمیت کا اظہار کیا۔ ''مزامیر'' کی جلد اوّل میں ان کا وہ مقدمہ شامل ہے جس کا حوالہ تنقید میر کے سلسلے میں اکثر دیا جاتا رہا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے نقدِ میرؔ میں ان کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> مخدومی حضرت میرزا جعفر لکھنوی مدظلہٗ میرؔ کے سب سے بڑے پرستار ہیں انھوں نے اپنی عالمانہ تنقیدوں سے میر

کے خلاف بدگمانیوں کا طلسم توڑا کہ وہ محض ایک مبتذل شاعر ہے یا یہ کہ اس کے کلام کا بڑا حصہ نا قابل اعتناء ہے۔انھوں نے طرح طرح سے کلام میر کی تشریح و تعبیر کی، اس کی فنی نزاکتوں کے راز سمجھائے، معانی کی تہوں کو کھولا، اور کلام میر کا ایک نہایت پاکیزہ انتخاب ''مزامیر'' کے نام سے شائع کیا۔ جس کا فاضلانہ مقدمہ میرؔ کو سمجھنے کی پہلی مثبت کوشش ہے۔ اس طرح میر کے نقادوں میں حضرت اثر لکھنوی کو تقدم زمانی کا شرف بھی حاصل ہے۔''[11]

''مزامیر'' کے مقدمے کی ابتدا ہی انھوں نے اس شکایت سے کی ہے کہ ''ناقدین عام طور پر میرؔ کے غائر مطالعہ کی زحمت کم گوارا کرتے ہیں اور محض ان اشعار کی بناء پر جو زبان زد ہیں رائے قائم کر لیتے ہیں کہ ان کے یہاں سادگی و سلاست، درد و خستگی ہے اور بس۔۔۔۔۔۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کے دواوین میں کل بہتر نشتر قابل اعتناء ہیں، باقی کلام تبرک ہے۔ ڈاکٹر خورشید احمد نے لکھا ہے:

''انھوں نے (اثر لکھنوی) آبِ حیات والے میرؔ کو چھوڑ کر ایک ایسے میرؔ کو دریافت کیا، جس کی شاعری میں ''بلندی فکر و رعنائی تخیل'' تھی۔ انداز بیان میں تنوع، تازگی، شگفتگی و ندرت تھی، لوچ و نزاکت اور بانکپن تھا۔ اثر نے یہ بھی ثابت کیا کہ میرؔ طرزِ غالب کے پیش رو ہیں۔ اثر ہی کے ذریعہ موازنۂ میر و غالب کا نیا موتیف تنقید میں داخل ہوا۔۔۔۔۔۔ بہر حال اثر کا بڑا تنقیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے میرؔ کی بازیافت کی۔''[12]

اثر لکھنوی نے اپنی کتاب میں ان تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو اس وقت تک میرؔ کے کلام پر کیے جاتے رہے ہیں۔ ''مزامیر'' کے مقدمے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے تک میرؔ کو نہ تو اچھی طرح پڑھا گیا اور نہ سمجھا گیا۔ حالانکہ صفدر آہ اور بعض دوسرے لوگوں کی کتابیں اور مضامین ''مزامیر'' کی اشاعت سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ جس میں میر کے کلام کا جائزہ مختلف نوعیتوں سے لیا گیا تھا اور ان محاسن کو نمایاں کرنے کی کوشش کی

گئی تھی جو میر کے کلام میں پائے جاتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اثر لکھنوی نے صرف میر پر ہونے والے عام اعتراضات یا خاص طور پر میر کے بہتر نشتر والی مشہور رائے کا جائزہ لیا کیونکہ جو مضامین میرؔ کی تشریح و تفہیم کے سلسلے میں اس دور میں لکھے گئے وہ اتنے مشہور نہ ہو سکے کہ میرؔ کے بارے میں عام اور مشہور رایوں کو متاثر کر پاتے، اس لیے جعفر علی خاں اثر نے بہت تفصیل سے میر کی شاعری کا جائزہ لیا اور نہ صرف یہ کہ اس طرح کے اعتراضات کے جواب دیئے بلکہ محاسن کلام میرؔ کو واضح کرنے کی کوشش کی ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''مزامیر'' کے مقدے سے پہلے بھی انھوں نے میرؔ کے بارے میں کئی مضامین لکھے جن کے متعلق ان کو یہ شکایت بھی ہے کہ لوگوں نے ان مضامین کے خیالات اور اکثر باتوں کو اپنے مضامین میں بغیر حوالہ دیئے استعمال کیا جسے وہ مخصوص لکھنوی تہذیب کی زبان میں ''اظہار پسندیدگی کا یہ طریقہ مستحسن نہ سہی ہمت افزا ضرور ہے''۱۳۔ لکھتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اثر لکھنوی کا کام صرف مزامیر تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے قبل وہ کتنے ہی مضامین میر پر لکھ چکے تھے۔ ان کے یہ مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اثر لکھنوی کا اندازِ تنقید جمالیاتی ہے جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ وہ پہلے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہیں جو میرؔ کی قنوطیت، یاسیت یا اور دوسرے سلسلوں میں مشہور کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ میر کے محاسن شعر پر گفتگو کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر میرؔ کے اشعار کو پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے میر کے سوانحی حالات کو بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری میں اس عہد کی جو تصویریں ملتی ہیں اور جس کامیابی سے میر نے الفاظ کے ذریعہ انھیں **Picturise** کیا ہے اس کا بیان کیا ہے۔ وہ میرؔ کی پیکر تراشی پر بے حد زور دیتے ہیں اور اسے محاکات کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں

> ''میرؔ کی شاعری تمام ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ تخیل اور محاکات کے بہترین نمونے علاوہ دیگر محاسن مثلاً سلاست، صفائی، حسنِ بندش، لطف تشبیہ و استعارہ اور ہر ایک درجہ کمال پر موجود ہے۔ پھر لطف یہ کہ باوجود اس ہمہ گیر تخیل اور قوت اختراع کی آخری حدوں پر پہنچنے کے میر نے

"حقیقت" کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔۔۔۔ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس کی مصوری میر نے بہترین الفاظ اور موثر ترین پیرائے میں نہ کی ہو۔ ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع ہیں اور صاف و سادہ الفاظ میں معانی کا ایک دریا موجزن ہے"[۴۴]

اس اقتباس سے اتنا اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ میرؔ کی شاعری کے سلسلے میں جو باتیں بڑی تفصیل سے بعد کے ناقدین لکھتے رہے ہیں انھیں اثرؔ لکھنوی نے مختصر الفاظ میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اثرؔ لکھنوی نے اپنے اس بیان کے بعد میرؔ کی شاعری کا تفصیلی و تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اردو شاعری پر کیے جانے والے اعتراضات کی روشنی میں میرؔ کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی ہے مثلاً قدیم اردو شاعری میں عاشق کا تصور ہمیشہ ایک بے ننگ و نام اور بوالہوس شخص کا رہا ہے۔ اثرؔ لکھنوی نے میرؔ کے اشعار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرؔ کے یہاں عاشق کا تصور اس وقت کی عام اردو شاعری کے عاشق کے تصور سے مختلف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "میرؔ نے انسان کی عظمت ہمیشہ پیش نظر رکھی۔"

جعفر علی خاں اثرؔ نے میرؔ کی ایک اور شاعرانہ خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جس پر شاید اس سے پہلے توجہ نہیں دی گئی تھی "وہ ہے میرؔ کی شاعری میں آواز یا نشست الفاظ سے پیدا ہونے والے مفہوم کی ترجمانی" اس کے لیے اثرؔ لکھنوی نے ایک گریک اصطلاح Onomatopoeia کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مفہوم لفظ سازی یا آوازوں سے لفظ کی تخلیق ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے خود اثرؔ لکھنوی نے لکھا ہے کہ:

"اردو شاعری میں Onomatoposis کا فقدان ہے یعنی آواز یا نشست الفاظ مفہوم کی ترجمانی نہیں کرتے۔ مغربی شاعری میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں مثلاً دریا کی روانی، خنجر کی برش وغیرہ یہ بات نہیں کہ صوت یا نشست الفاظ کسی جذبے یا قلبی واردات کی پیش خوانی کرے یہ میرؔ کے کمالِ فن کا معجزہ ہے کہ اس نے اردو شاعری میں جس پر سخت قیود عائد ہیں۔۔۔۔ وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو مغربی شاعری میں اتنی آزادی کے

بعد بھی معدوم ہیں''۔ ۱۵

اس سلسلے میں اثر لکھنوی نے میرؔ کے مختلف اشعار پیش کر کے ان کی تشریح کی ہے اور آواز مفہوم اور صورت حال سے میر کی شاعری میں نئے معنوی زاویے پیدا کیے۔

اثر لکھنوی نے بڑی شدت کے ساتھ اس اعتراض کا بھی جواب دیا ہے کہ میرؔ کے یہاں مناظر فطرت کا مطالعہ نہیں ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے میرؔ کی شاعری سے وہ اشعار نقل کیے ہیں جن میں لالہ وگل، نسرین، وسمن، سرو لب جو، دامن کوہ، ابر جنگل، جھالہ برساں، زرد ڈھاکہ، پھولی ہوئی سرسوں، نمود آفتاب، چمن غنچہ، وغیرہ کا ذکر ہے۔ انھوں نے خاص طور پر میرؔ کے استعارات کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ میر کے استعارات میں ایسی بلاغت ہے جس کی تعریف مشکل ہے اثر لکھنوی کا قاعدہ ہے کہ وہ جو بھی دعویٰ کرتے ہیں اس کی دلیل میں کلام میر سے صرف مثالیں ہی نہیں دیتے بلکہ ان اشعار کی ایسی خوبصورت تشریح کرتے ہیں کہ اس کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔

جدید ناقدین نے میر کے یہاں پائے جانے والے غیر مستعمل الفاظ یا ہندی، برج، اودھی، اور پنجابی کے الفاظ کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اثر لکھنوی نے ''مزامیر'' کے مقدمے میں تفصیل سے ایسے الفاظ کی نشاندہی کی ہے اور اشعار کی تشریح میں جو اثر اور معنویت ان الفاظ سے پیدا ہوتی ہے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سیّد عبداللہ نے لکھا ہے:

''اثر نے میرؔ کی مخصوص زبان اور اس کی بلاغتوں کی رہنمائی کی۔'' ۱۶

اثر لکھنوی نے میرؔ کے اشعار کی تشریح کے ذریعہ ان کی مختلف خوبیوں کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''میرؔ کی شاعری میں اتنی خوبیاں اور اس قدر تنوع ہے کہ ان کا احصاء قریب قریب ناممکن ہے۔ حسن و عشق اور ان کے متعلقات کا تو ذکر ہی کیا زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس کی مصوری میرؔ نے بہترین الفاظ اور موثر ترین پیرائے میں نہ کی ہو۔ مذہب، حکمت، فلسفہ، تصوف، مابعد الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات کوئی

موضوع ان کی شاعری کی ''پہنچ'' سے باہر نہیں ہے۔'' ۱۷ے

اس طرح یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اثرؔ لکھنوی نے میرؔ کے کلام کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے جو ان کی نگاہ میں میرؔ کے کلام میں ہو سکتے ہیں۔ اثرؔ لکھنوی نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ''میرؔ نے۔۔۔۔۔۔۔اردو کو ہندی سے بہت قریب کر دیا''۔ یہ ایک اہم بات ہے جو میرؔ کی زبان کے سلسلے میں اثرؔ لکھنوی نے لکھی ہے۔ اس سے پہلے وہ ان نامانوس الفاظ کی نشاندہی کر چکے ہیں جو میرؔ بڑی آزادی سے اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں پر میرؔ کی بحروں اور مختلف زحافات کے حوالے سے اثرؔ لکھنوی نے اردو اور ہندی کو قریب لانے کی بات کہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میرؔ کے یہاں فکر بھی ہے اور سادگی و پرکاری بھی۔ نقدِ میرؔ میں اثرؔ لکھنوی کی یہی اہمیت ہے کہ انھوں نے دقیق تنقیدی اصطلاحات کے بجائے خوبصورت اور دلکش زبان میں کلام میرؔ کی خوبیوں کی وضاحت کی ان کی تنقید میں جو تشریحی پہلو ہے وہ بھی قابل توجہ ہے اس لیے کہ انھوں نے کلام میرؔ کے جس پہلو کا ذکر کیا ہے یا جس خوبی کا حوالہ دیا ہے اس سے متعلق اشعار کے ساتھ ساتھ تشریح بھی کرتے گئے ہیں۔

اس طرح نقدِ میرؔ میں ایک فنی و جمالیاتی اور تشریحی و تاثراتی ناقد کی حیثیت سے اثرؔ لکھنوی کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

خواجہ احمد فاروقی (۱۹۹۵ء۔۱۹۱۷ء)

صفدر آہ کی کتاب ''فلسفۂ میرؔ'' کے بعد جس ناقد نے اپنی گراں مایہ تصنیف کے ذریعہ نقدِ میرؔ کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں کلیدی رول ادا کیا، وہ خواجہ احمد فاروقی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نہ صرف اپنے عہد کے بڑے نقاد ہیں بلکہ نقدِ میرؔ کے سلسلے کا اہم نام ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''میرؔ حیات اور شاعری'' میرؔ تقی میرؔ پر پہلی کتاب ہے جس میں میرؔ کی سوانح، شخصیت، اس عہد کی تاریخ و تہذیب اور میرؔ کے کلام کی اہمیت، سب کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کر لیا گیا ہے۔ یہ کتاب نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی میرؔ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں ایک اہم دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ بقول فاروقی یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں پایۂ تکمیل

کو پہنچ گئی تھی مگر مسودہ کے ضائع ہو جانے کے سبب وقت پر شائع نہ ہو سکی۔ اس کا نقشِ ثانی ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ سے پہلی بار شائع ہوئی۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں میرؔ کی حیات اور شاعری پر ان کے عہد کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ فاروقی لکھتے ہیں:

> ''میر کی سحر کار آواز الگ پہچانی جاتی ہے۔ انھوں نے جو انقلابات دیکھے تھے اور جو تکلیفیں زمانے کے ہاتھوں اٹھائی تھیں ان کا اثر صاف ان کے کلام میں نظر آتا ہے بلکہ میرؔ کو الفاظ میں تحویل کرنے ہی سے ان کا شاعرانہ آرٹ صورت پذیر ہوتا ہے۔ انھوں نے شعر نہیں کہے، دل اور دلّی کے مرثیے لکھے ہیں۔ محبت اور انسانیت کو جلا بخشی ہے۔ غم عشق اور غم آفاق نے مل کر ان کے اشعار میں آگ کی سی لپٹ پیدا کر دی ہے اور لفظ و معنی کی دوئی کو مٹا دیا ہے۔ ان کی شاعری کی پشت پر اردو کے ارتقاء کی تاریخ ہے اور اس میں برسہا برس کی روایات، تمدنی وراثت، تاریخی اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے۔''[۱۸]

خواجہ احمد فاروقی کی یہ رائے کہ ''میر کی شاعری کی پشت پر اردو کے ارتقاء کی تاریخ ہے اور اس میں برسہا برس کی روایات، تمدنی وراثت تاریخی اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے'' ان کے نظریہ تنقید کی نشاندہی کرتی ہے۔ فاروقی صاحب نے ان چند سطور میں تفہیم میرؔ کے سلسلے میں کئی بنیادی اشارے کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ''میر کی شاعری اردو کے ارتقاء کی تاریخ ہے''۔ یہ بات میر کی شاعری کے لسانیاتی عمل کو ذہن میں رکھ کر کہی گئی ہے اس میں شک نہیں کہ میر نے زبان کا جس طرح استعمال کیا ہے اور عام بول چال کے الفاظ سے جو فائدہ اٹھایا ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ اسی لیے خواجہ احمد فاروقی نے اسے اردو کے ارتقاء کی تاریخ قرار دیا ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کی تنقید نگاری کے بارے میں جدید عہد کے اہم ناقد پروفیسر افضال حسین کا خیال ہے کہ:

"........مصنف نے میر کی شاعری کی بجائے
ان کی حیات اور شخصیت نیز میر کے عہد کے متعلق مواد کی تحقیق پر
توجہ مرکوز رکھی ہے۔" ۱۹

خواجہ احمد فاروقی کی اس کتاب کے پانچ ابواب میں دو طویل ترین ابواب جو کتاب کے نصف سے زیادہ کا احاطہ کر لیتے ہیں، تاریخ اور شخصیت سے متعلق ہیں۔ میر کے اسلاف، شجرہ، نسب، خاندانِ میر، علی متقی یا محمد علی (میرؔ کے والد) ان کے حالات اور سیرت، میرؔ کی ولادت، سید امان اللہ چچا اور والد کا انتقال، میرؔ کی تربیت، دہلی کا سفر، تعلیم، شعر گوئی، خانِ آرزو سے ان کے تعلقات، ان کی دیوانگی، سب کچھ اس حصے میں سمٹ آیا ہے۔ پھر اسی باب میں میرؔ اور دتی (میر کا تاریخی ماحول) سے بحث ہے۔ جس میں نادر شاہ کے حملے ۱۷۳۹ء محمد شاہ ابدالی کے پہلے حملے سے لے کر میرؔ کے ترک دتی تک۔ لکھنؤ روانگی اور ان کی وفات پر مفصل اظہار خیال کیا گیا ہے۔

میرؔ جس وقت دلی آئے مغلیہ سلطنت مائل بہ زوال تھی نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ایسی تباہی پھیلائی کہ دتی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اس دور میں میر بھی معاشی تنگ حالی سے گزرے۔ راجہ جگل کشور کے علاوہ کوئی مددگار نہ تھا۔ خود انھوں نے "ذکر میرؔ" میں ابدالی کے حملوں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کے کوچ کے بعد بھی خانہ جنگیوں کے سبب دتی کی حالت خراب رہی۔

میرؔ لکھتے ہیں:

"کہ بازار کہاں جن کا ذکر کروں، طفلانِ تہہ بازار کہاں،
حسن کہاں جس کو پوچھوں، جوانانِ رعنا چل بسے، پیرانِ پارسا
گزر گئے، محلے خراب، کوچے برباد، ہر طرف وحشت ہویدا، اور
انس ناپید، ناگاہ اس محلے میں پہنچا، جہاں میرا گھر تھا، دن رات
صحبتیں گرم رہتی تھیں، شعر پڑھتا تھا اور عاشقانہ بسر کرتا تھا،
راتوں کو روتا تھا اور حسینوں سے عشق کرتا تھا۔ وہاں کوئی شناسا نہ ملا
کہ دو گھڑی باتیں کر لوں۔ کچھ دیر کھڑا حیرت سے تکتا رہا۔ سخت

صدمہ ہوا اور عہد کیا کہ اب پھر نہ آؤں گا اور جب تک زندہ ہوں شہر کا قصد نہ کروں گا۔'' ۲۰

ان حالات میں کوئی بھی حساس شاعر اپنے ماحول سے کیسے خود کو الگ رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ اس ماحول کا اثر میرؔ کی شاعری پر بھی ہوا خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''یہ سارا ماحول میرؔ کی غزلوں میں سما گیا۔ انھوں نے شعر نہیں کہے۔ ''دل اور دلی کے مرثیے'' لکھے ہیں۔۔۔۔۔۔ میرؔ کا تاریخی ماحول ان کی غزلوں میں ڈھل گیا ہے۔ ۲۱

میرؔ کی غزلوں / شاعری کا مطالعہ قاری کو اس دور میں لے جاتا ہے جس میں میرؔ نے زندگی گزاری میرؔ کے متعلق فاروقی کا یہ خیال درست ہے کہ انھوں نے ''دل اور دلی کے مرثیے'' کہے ہیں۔

لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔ اگر ان کے کلام کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک سماجی شعور ہے۔ اس میں تاریخی سچائیاں جھلکتی ہیں۔ ان کی شاعری، معاشرتی فرائض کا احساس رکھتی ہے اور جہاں انھوں نے اپنے انفرادی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہاں بھی اجتماعی حقیقتیں الفاظ کے جھروکوں سے جھانکتی ہیں۔ ۲۲

فاروقی بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ میرؔ کے حالات زندگی کے پس منظر میں ان کے کلام کو سمجھا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ میرؔ کے کلام پر ان کے عہد، زمانے، حالات، انفرادی زندگی ہر شے کا اثر موجود ہے۔ میرؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے غزلیات والے حصے میں لکھتے ہیں:

''میرؔ کی شاعری پر غور کرتے وقت ان کے خاندانی ماحول کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔'' ۲۳

''۔۔۔۔۔۔ ان کی عاشقانہ سیرت کی تعمیر میں ان کے خاندان کی تہذیبی اور معاشرتی روایات کو بڑا دخل ہے انسان

کے دکھ درد کا احساس۔ اپنی اور دوسروں کی عزّت، عشق کی غیرت
اور حسن کے احترام کے سرچشمے، ان کے تہذیبی اور خاندانی ورثہ
میں مل جائیں گے۔'' ۲۴

اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ میرؔ کے والد کی ان کو عشق کی تلقین، خود میرؔ کا کسی خاتون کے عشق میں گرفتار ہونے سے لے کر زندگی کے مختلف تجربات و واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور میر کے کلام سے مثالیں دیتے ہیں۔

مگر ایک خاص بات جس کی طرف خواجہ احمد فاروقی نے قاری کی توجہ مبذول کی ہے وہ یہ کہ اس دور میں سماجی انحطاط تو ضرور ہوا مگر انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کے اس منتشر دور میں بھی ہمت و حوصلے اور ایثار و قربانی کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ میرؔ جسے ہمیشہ درد و غم قنوطیت اور بہتر نشتر کا شاعر قرار دیا گیا ان خراب حالات میں بھی اپنی جگہ ''چٹان کی طرح مضبوط رہے۔ میرؔ نے زندگی کی پریشانیوں کا سامنا ہمت و حوصلے اور ایک مضبوط عزم کے ساتھ کیا۔

''۔۔۔۔۔۔اس زمانے میں جب دہلی کے عوام سیاسی
آندھیوں کے رحم و کرم پر تھے اور اور ان کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ
نہیں رہی تھی، میر اپنی جگہ چٹان کی طرح مضبوط رہے۔ حالاں
کہ انھوں نے یہ واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔۔۔۔۔۔
وہ آسودۂ ساحل نہیں، اس قلزم خون کے شناور تھے پھر بھی، انھوں
نے غم عشق اور غم آفاق کو مردانہ وار اٹھایا اور زمانہ کی بے مہریوں
کے آگے گردن نہیں جھکائی۔ میرؔ نے زندگی کا وہ سلیقہ پیدا کیا جو
ساری عمر ناکامیوں سے کام لینے سے پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔ ان
کے غم میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت، رکھ رکھاؤ، ضبط اور خودداری کا
احساس اور مقابلہ کی ہمت اور توانائی ہے۔۔۔۔۔۔۔ انھوں
نے جس غم کا اظہار کیا ہے وہ صرف اپنی بے رونقی کا نہیں بلکہ اپنے
طبقہ اور تمدن کی بے رونقی کا بھی غم ہے''۔ ۲۵

مندرجہ بالا اقتباس ایک ایسے میرؔ کو ہمارے سامنے لاتا ہے جو قنوطی نہیں ہے، جس

کا کلام صرف یاس و غم سے بھرا ہوا نہیں ہے بلکہ وہ چٹان کی طرح مضبوط اور زندگی کی پریشانیوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ اس کے غم میں ایک رکھ رکھاؤ، ضبط اور خودداری کا احساس ہے۔ یہاں خواجہ احمد فاروقی براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس اقتباس کے آخر میں بھی وہ میرؔ کے یہاں رکھ رکھاؤ، ضبط خودداری، اجتماعیت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ میرؔ کو صرف اپنی بے رونقی کا نہیں بلکہ اپنے طبقہ اور تمدن کی بے رونقی کا بھی غم ہے۔

کتاب کے باب سوم کا عنوان ''شاعری'' ہے جس میں میرؔ کے نظریۂ شاعری'' سے بحث کی گئی ہے اور ان کے کلام کی خصوصیات پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ داخلیت، خارجیت، تصور حسن و عشق، فلسفۂ غم، تصوف، قصائد، نشتریت، سہل ممتنع، سلیقہ، محاورے، موسیقیت، مثنویات، مراثی، ہجویات، اور ساتھ ہی فارسی کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ میرؔ کی اہم خصوصیت الفاظ کے انتخاب کی طرف بھی فاروقی اشارہ کرتے ہیں کہ میرؔ نے کس طرح ہندی الفاظ کو اپنی شاعری میں استعمال کیا۔ لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی کرشمہ آفریں طبیعت نے ہندی اور فارسی کے خوبصورت امتزاج سے اردو زبان کو وسعت بخشی اور اسے اس قابل بنادیا کہ وہ مختلف مضامین کو نظم کر سکے۔''[۲۶]

اگرچہ اس کتاب میں میرؔ کی زندگی، عہد، شاعری، تصانیف، ہر ایک پر تفصیلی اور تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ یہ پہلی ایسی کتاب تھی جس میں میرؔ کو ہر زاویہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے جن اہم ناقدین نے نقدِ میرؔ کے سلسلے کو آگے بڑھایا انھوں نے خواجہ احمد فاروقی کو نظر انداز کر دیا۔ بہت کم ناقد ایسے ہیں جنھوں نے میرؔ پر لکھی گئی اپنی کتابوں میں خواجہ احمد فاروقی کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ناقدین نے نکتہ چینی سے کام لیا ہے۔ سید عبداللہ نے نقدِ میرؔ میں لکھا ہے:

> ''۔۔۔۔۔۔ اس دوران میں خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''حیاتِ میرؔ'' شائع ہوئی اس سے بھی فائدہ ہوا مگر دل و دماغ کو صحیح معنوں میں سیرابی نصیب نہ ہوئی۔ تشنگی بدستور باقی رہی''۔[۲۷]

نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔۔۔ یہ کتاب بھی میرؔ کا حق ادا کرنے میں
> ناکام رہی ہے''۔[۲۸]

قاضی عبدالودود بھی طوالت کی شکایت کرتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے تحقیقی نقطۂ نظر سے فاروقی پر سخت تنقید کی ہے۔ اس کتاب کی طوالت پر اعتراض کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> ''غیر ضروری مطالب کثرت سے داخل کتاب ہیں اور
> طول بے جا سے بہت کام لیا گیا ہے۔۔۔۔۔ مصنف نے میر کے
> ''تاریخی ماحول'' کی بحث میں کتاب کے ۱۳۴ صفحے لیے ہیں۔ دس
> پانچ صفحے کافی ہوتے۔ یہ بھی نہیں کہ مصنف نے میرؔ کے عہد کا اصلی
> مآخذ سے ذاتی مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا
> ہے وہ تقریباً کل سرکار کی کتاب اور ذکر سے ماخوذ ہے۔''[۲۹]

ان ناقدین کی آراء اپنی جگہ پر حق بجانب سہی چاہے وہ سید عبداللہ ہوں جن کو ''میرؔ حیات اور شاعری'' سے سیرابی نہ ہوئی'' یا نثار احمد فاروقی جنھیں یہ محسوس ہوا کہ یہ کتاب ''میر کا حق ادا کرنے میں ناکام رہی۔'' یا پھر قاضی عبدالودود جنھوں نے فاروقی پر سخت تنقید کی ہے۔ مگر فاروقی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں لکھی گئی۔ اس وقت تک اثر کا منتخب کردہ انتخاب بھی شائع نہیں ہوا تھا ایسے وقت میں ان کے مسودہ کا ضائع ہوجانا خواجہ احمد فاروقی کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ ورنہ یہ کتاب شاید اثر کے ''مزامیر'' سے پہلے شائع ہوتی۔ اس کے باوجود خواجہ احمد فاروقی نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا اور مفصل طور پر نہ صرف میرؔ کی حیات اور تاریخی ماحول کو ہمارے سامنے پیش کیا بلکہ میر کی شاعری کو بھی ان کی شخصیت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ خواجہ احمد فاروقی کی اس اہم ناقدانہ کاوش کو اگر سرسری طور پر نظر انداز کردیا جائے تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مگر ہر انسان کو اس کی محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے کے مطابق فاروقی کا حوالہ چاہے ناقدین نے بہت زیادہ نہ دیا ہو یا ان پر اعتراضات بھی کیے گئے ہوں اس کے باوجود ان کے سب سے بڑے

معترض ''قاضی عبدالودود'' نے اپنی کتاب کے آخر میں ان کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

''میر کے حالاتِ زندگی، ان کی شخصیت اور ان کی نظم و نثر پر اچھے برے، بہت سے مضامین نکلے ہیں اور شاید ایک دو مختصر کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں، لیکن ایک ایسی کتاب کی جس میں ان امور سے مفصل بحث ہو، کمی تھی ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی ہمت کو آفریں ہے کہ انھوں نے اس کا بیڑا اٹھایا اور اپنی ۱۴ سالہ کاوشوں کے نتائج ''میر تقی میر: حیات اور شاعری'' کے نام سے پیش کیے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کی بدولت بہت سا مواد جو ''بکھرا ہو'' تھا ایک مقام پر مجتمع ہو گیا۔'' [۳۰]

قاضی عبدالودود کا یہ اعتراف اس بات کا اقرار ہے کہ خواجہ احمد فاروقی نقدِ میر کے سلسلے کا اہم نام ہے۔

سید عبداللہ (۱۹۸۶ء۔۱۹۰۶ء)

تنقیدِ میر کے سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی کتاب ''نقدِ میر'' دراصل ان تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ سید عبداللہ نے نقدِ میر میں شامل اپنے مضمون ''میں اور میر'' میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے قبل تک وہ حافظ اور اقبال کے مداح تھے مگر ۱۹۴۷ کے حالات نے انھیں میر کے نزدیک لا دیا۔ اپنے غموں کا مداوا انھیں میر کے اشعار میں نظر آیا اور میر ان کا رفیق زندگی بنتا گیا۔ میر کے عہد کی رفاقت سید عبداللہ کو اُن کے غموں میں سہارا دیتی ہے اور میر انھیں ایک سچے ساتھی کے روپ میں نظر آتے ہیں ایسا ساتھی جو کبھی فریب نہیں دے گا جس سے روح کو سکون حاصل ہوگا۔ اُن کے نزدیک میر کا دور ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین دور ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''میرے نزدیک یہ دور، ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کا بڑا پُر معنی دور ہے اور میر کی شاعری اور زندگی میرے خیال میں اس دور کی تاریخ کا نہایت کامیاب اور وسیع ماخذ ہے۔'' [۳۱]

سید عبداللہ میرؔ کی زندگی اور ان کی شاعری کو اس عہد کی تاریخ سے واقفیت کا بڑا ذریعہ قرار دیتے ہیں وہ میرؔ کی زندگی کا عکس ان کی شاعری میں دیکھتے ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے:

''سید عبداللہ میرؔ کی شاعری میں ان کی سوانح کا عکس ہر جگہ ڈھونڈھتے ہیں اور سوانح کے حوالے سے شاعری یا شاعری کے حوالے سے سوانح کے عناصر مرتب کرنے کے روایتی انداز سے چھٹکارا حاصل نہیں کرپاتے۔''۳۲

ابوالکلام قاسمی کی رائے کے بعد سید عبداللہ کا یہ اقتباس قابلِ غور ہے۔ میرؔ کی مثنویوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو مثنوی کو بھی غزل کی طرح شدید شخصی احساسات و جذبات کا ذریعہ واظہار اور سانچا بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی مثنویاں خالصتاً شخصی ہیں۔۔۔۔۔۔ کہانی اپنی ہی ہے نام اوروں کے رکھ لیے ہیں۔ دنیا والوں میں سے کسی کی سرگذشت نہیں بلکہ خود اپنا ہی کردار اوروں کے۔۔۔۔۔۔۔ پردے میں ظاہر کیا ہے ان کی مثنویاں میر حسن کی مثنوی کی طرح خیال اور افسانوی دنیا کی کہانیاں نہیں بلکہ اپنے ہی غم دل کے قصے ہیں۔''۳۳

اسی طرح ڈاکٹر خورشید احمد کا بھی خیال ہے کہ سید عبداللہ سوانح کا عکس شاعری میں تلاش کرتے ہیں اور یوں شاعر کی نفسیات، سوانح اور شاعری سب گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

''۔۔۔۔۔۔ سید عبداللہ۔۔۔۔۔۔ نے حسب استعداد میرؔ کی شخصیت اور سوانح کا عکس ان کی شاعری میں دیکھا ہے یا شاعری سے ان کی شخصیت اور سوانح کا خاکہ مرتب کیا ہے۔ اس طرح میرؔ کی نفسیات، سوانح حیات اور شاعری سب ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہوگئی ہیں۔''۳۴

سید عبداللہ نے میر کا رنگ طبیعت کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون میر کے حالاتِ زندگی پر تحریر کیا ہے اس مضمون میں انھوں نے میر کی پیدائش، بچپن، میر کی سیرت کے اوّلین نقوش میر کے والد اور چچا کی سیرت و شخصیت، ان دونوں کے انتقال، بے دماغی اور بد دماغی، افسردگی، میر کی دردمندی، میر کا غم، ہر موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے خود اس مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے۔

> ''۔۔۔۔۔۔ کسی شاعر کے ذہن وفکر کے تدریجی ارتقاء اور اس کے فن کی درجہ بدرجہ ترقی اور وسعت کو سمجھنے کے لیے شاعر کی زندگی کے ان واقعات کا علم ضروری ہے جن کے زیر اثر:۔
>
> (الف) اس نے زندگی کے متعلق نقطۂ نظر قائم کیا
>
> اور
>
> (ب) اس نقطۂ نظر کے اظہار کے لیے وہ تخلیق کی مختلف صورتیں پیدا کرتا رہا۔
>
> اس کے علاوہ شاعر کی ذہنیت کو سمجھنے کے لیے اس کے زمانے کے اجتماعی احساسات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔'' ۳۵

سید عبداللہ کلام میر کو اس دور کے احساس زوال اور عام انسانی غم والم کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ میر کا زمانہ آشوب سے بھرا تھا۔ اب چاہے وہ اکبر آباد کا زمانہ ہو یا دہلی کے اجڑنے سے قبل اور بعد کا زمانہ۔ میر کی شاعری ان تمام حالات کی عکاسی کرتی ہے یہ حالات اس دور کے انسان کے درد وغم اور پریشانی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لہٰذا میر کے کلام میں ان حالات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ جن سے وہ گزرے ہیں اگر کوئی بغور ان کے کلام کا مطالعہ کرے تو اسے احساس ہوگا کہ وہ اسی دور سے گزر رہا ہے۔ جس سے میر گزرے خود سید عبداللہ نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء میں جن حالات سے گزرے ان کا عکس انھیں میر کے کلام میں نظر آیا۔

حالانکہ درد بھی اسی دور کے شاعر تھے۔ عبداللہ میر سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں ضبط و برداشت ہے جب کہ میر کے یہاں احتجاج ملتا ہے۔ وہ

اپنے غم کے اظہار میں تسکین پاتے ہیں۔

میر اتنے مقبول کیوں ہیں؟ عبداللہ اس سوال کا جواب مختلف طرح سے دیتے ہیں مگر ایک اہم بات جس کی طرف وہ اشارہ کرتے ہیں:

''-------اس سے انکار نہیں کہ اصل نوا، دردانگیز اور پرتاثیر ہے کیونکہ یہ ان کے ذاتی غم کی سچی نوا ہے اور اس میں زمانے کے اجتماعی آلام اور عالمگیر انسانی غم کی دردناک آواز بھی شامل ہوگئی ہے۔ لہٰذا بعد میں آنے والوں کے لیے بھی وہ نامانوس اور اجنبی نہیں۔''۳۶

وہ مزید لکھتے ہیں:

''میر تقی میر کی عظمت کا بڑا راز یہ ہے کہ ان کے کلام میں شدید ذاتی جذبات موجود ہیں جن میں بڑی سچائی اور بڑا درد ہے۔ حسنِ اتفاق یہ ہے کہ وہ حسن عصر کے شاعر ہیں۔ اس کا اجتماعی احساس بھی ان کے ذاتی احساس سے ہم آہنگ ہے اس لحاظ سے وہ اپنے دور کے نمائندہ ترجمان بھی ثابت ہوئے ہیں ------مگر ان کی مقبولیت کی بڑی بنیاد یہ ہے کہ وہ عام انسانی احساسات کے مطابق بات کرنا چاہتے ہیں۔''۳۷

میر کی اس خصوصیت کے علاوہ سید عبداللہ ان کی ایک اور اہم خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں میر صرف اپنے غموں کے سبب مقبول نہیں بلکہ انھوں نے اس غم کے گھاؤ پر مرہم بھی رکھا ہے۔

''انھوں نے اپنے مخاطبوں اور پڑھنے والوں کے اس خاموش مطالبہ پر اکثر نظر رکھی ہے کہ غم کے اس گہرے گھاؤ پر مرہم کے بھی چند پھائے رکھتے جایئے-----محبوب سے چھیڑ چھاڑ، طنز اور چٹکی کے علاوہ خطاب اور تخاطب کا عام انداز ------ کائنات اور فطرت کی مختلف اشیاء سے راہ ورسم اور بات چیت،

عام بیانات کو واقعات بنا کر پیش کرنے کا طریقہ۔۔۔۔۔۔ان سب وسائل سے کام لے کر وہ اپنی شاعری میں زندگی اور جوش کا ایسا عنصر پیدا کر دیتے ہیں جو نہایت فرحت بخش اور پر لطف ہوتا ہے۔۔۔۔۔ میرؔ کی شاعری کو مقبول بنانے اور اس کو زندہ رکھنے میں اس حیات بخش عنصر کا بڑا حصہ ہے۔" ۳۸

سید عبداللہ نے اس کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد کو "میرؔ کا ایک نقاد" کے عنوان سے بحث کا موضوع بنایا ہے۔ وہ آزاد کے حامیوں میں سے ہیں مگر میرؔ پر لکھتے وقت آزاد نے جو ناانصافیاں کی ہیں اس مضمون میں انھیں نشان زد کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میرؔ اتنے نازک مزاج نہیں تھے جتنا آزاد کی آبِ حیات کی اشاعت نے انھیں بنا دیا۔ اپنے مضمون میرؔ کے "قبولِ عام کی بنیادیں" میں بھی وہ ایک طرف میرؔ کی درد انگیزی کو ان کی مقبولیت کا سبب قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف ان کی شاعری کے حیات بخش عنصر کو میرؔ کی مقبولیت کا خاص سبب بتاتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میرؔ کی اسی خاصیت کو بیان کرتا ہے کہ وہ میرؔ جسے صرف درد و اثر کا شاعر قرار دیا گیا تھا۔ اس کے یہاں زندگی کی خوشیوں کا عنصر اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

سید عبداللہ حالانکہ ترقی پسند تحریک سے براہِ راست وابستہ نہیں تھے لیکن اسے ترقی پسند تحریک کی مقبولیت ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اثر سید عبداللہ کی تنقید میرؔ میں موجود ہے۔ عبداللہ بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری خواص سے کم عوام سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرؔ کے محبوب کو بھی عوامی محبوب قرار دیتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔میرؔ کی شاعری میں ان کے مشاہدات کی جو دنیا نظر آتی ہے وہ خاص کی دنیا سے بہت کم مشابہت رکھتی ہے اس میں عوام کا ماحول صاف صاف نظر آتا ہے، ان کے الفاظ و علامات سے پڑھنے والے کے تخیل میں جس دنیا کے محسوسات و تصورات ابھرتے ہیں، وہ بے کسوں، بے بسوں، غریبوں، مجبوروں اور مقہوروں کے گھر بار، زندگی اور تجربات کے نقشے

ہیں۔ان کی خیالی بستی میں ایسے لوگوں کا غلبہ ہے جو قصر و محل کے
رہنے والے نہیں بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو ''گلخن'' کے پاس بیٹھ
کر اپنے ''خار و خس'' کو جلا کر رات گزار لیتے ہیں۔''۳۹

سید عبداللہ، جھاڑو، ٹوکرے والے، خاکروب، گنوار، خادم، غلام، فقیر، جوگی، سپاہی، بےنوا، درویش، تھکے ہارے راہرو سب کو میرؔ کی دنیا کا انسان بیان کرتے ہیں۔ان کے خیال میں میرؔ کی عوامی دنیا میں طرح طرح کے انسان بستے ہیں۔ان میں منعم، غنی، زردار اور بادشاہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

میرؔ کے محبوب کے متعلق لکھتے ہیں:

''میرؔ کا محبوب عوامی محبوب معلوم ہوتا ہے اس کی اداؤں
میں سادگی اور عوامیت ہے وہ کم از کم (مجھے) بہت اونچے طبقے کا
معلوم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔'' ۴۰

سید عبداللہ نے میرؔ کی مقبولیت کا اہم سبب ان کی شاعری کا عوامی ہونا قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرؔ کے محبوب کو بھی ایک عام انسان قرار دیتے ہیں۔اپنے انھیں خیالات کے سبب وہ ترقی پسند تحریک کے نزدیک نظر آتے ہیں بلکہ وہ ترقی پسند نقادوں، مجنوں اور علی سردار جعفری سے بھی کہیں زیادہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ میرؔ کی دُنیا عام لوگوں کی دُنیا ہے۔ چنانچہ جہاں وہ اپنی تنقید میں سوانحی انداز اختیار کرتے ہیں وہیں سماجی اندازِ تنقید بھی ان کے یہاں موجود ہے مگر ایک اہم بات جس کی طرف قاضی افضال حسین نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں اشارہ کیا ہے:

''نقدِ میر'' از ڈاکٹر سید عبداللہ میرؔ پر مضامین کا واحد
مجموعہ ہے، جس میں میرؔ کی فنکاری کے متعلق تنقیدی اشارے
ملتے ہیں۔لیکن فیصلے تک پہنچنے کی عجلت کے سبب ڈاکٹر عبداللہ کے
اخذ کردہ نتائج حقیقت سے دور جا پڑے ہیں۔''۴۱

قاضی افضال حسین نے اپنے دعوے کی دلیل میں ''نقدِ میرؔ'' سے مختلف مثالیں بھی دی ہیں تشبیہ کے دائرہ کار کے متعلق لکھتے ہوئے انھوں نے ذکر کیا ہے کہ ''عبداللہ کے

بقول تشبیہ کا دائرہ کار عام طور پر محدود ہوتا ہے مگر میرؔ نے اس میں بھی مشابہت کے بیان میں ندرت پیدا کر لی"۔

قاضی افضال سید عبداللہ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں:

> "میر کے ایسے اشعار میں بیان کا انوکھا پن تو اپنی اعلیٰ ترین صورت میں موجود ہے لیکن ان تشبیہات میں خصوصاً وجہ شبہ کے بیان میں کوئی ندرت نہیں۔ میر نے فارسی، اردو غزل میں مدتوں سے نظم ہو رہی مماثلتیں ہی اپنے جذبات واحساسات کے بیان کے لیے استعمال کی ہیں۔"۴۲

سید عبداللہ نے میرؔ کی حیات اور شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی مختلف خصوصیات پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے میر کے انداز کے متعلق لکھتے ہیں:

> "میرؔ کا انداز کسی ایک خوبی سے عبارت نہیں اس کی بنیاد بہت سے محاسن پر ہے جن سے مجموعی طور پر ان کے کلام میں لطف اور اثر پیدا ہوتا ہے۔ اجمالاً یہ کہنا کافی ہوگا کہ پر خلوص سچے جذبات اور اثر، کلام کی سادگی اور لہجہ، عام انسانی اپیل، موسیقیت، ان سب عناصر کے اجتماع کا نام میر کا انداز ہے۔"۴۳

پروفیسر گوپی چند نارنگ، سید عبداللہ کی تنقیدی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سید عبداللہ میریات کے واحد نقاد ہیں جن کی نظر میرؔ کی صوتیات تک گئی ہے انھوں نے تکرار حروف سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر کاف اور گاف سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں بعض بعض غزلوں کے الفاظ تو انھیں دونوں حرفوں سے بھرے پڑے ہیں۔

آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم — شوق حد سے زیادہ ہے ہم کو
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے ۴۴

سید محمد عبداللہ کی نگاہ میں میرؔ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی سادگی اور شدید جذباتی کیفیتوں کو عام فہم اور موثر طریقے پر بیان کرنے میں ہے۔ سید عبداللہ کی تنقید کے بارے میں ان کے ہم عصر ناقدین نے زیادہ توجہ نہیں دی اور نہ کسی معاملے میں ان کی غیر معمولی اہمیت کا اعتراف کیا گیا، اگر دیکھا جائے تو سید عبداللہ کا کام اس لیے وقیع ہے کہ انھوں نے ہمیں مطالعۂ میرؔ کی طرف متوجہ کیا۔ مختلف عنوانات اور مختلف موضوعات پر میرؔ کے بارے میں مضامین لکھ کر ہمیں میرؔ کی غیر معمولی شعری اہمیت کا احساس دلایا اس طرح طالب علم ہوں یا عام پڑھے لکھے لوگ ان کے لیے میر شناسی کے جو وسائل انھوں نے یکجا کر دیئے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تنقیدِ میرؔ فلسفیانہ نہ ہو لیکن ایک عام پڑھنے والے کے لیے میرؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا اور میرؔ کی زندگی اور شخصیت کا احاطہ ضرور کر لیتی ہے اس لیے نقدِ میرؔ کا جب بھی ذکر آئے گا۔ سید عبداللہ کا نام ضرور لیا جائے گا۔ نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے:

> ''ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور) میرؔ کے ناقدوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''نقدِ میر'' بہت قابل قدر ہے اور میرؔ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔''[۴۵]

نثار احمد فاروقی (۲۰۰۴ء۔۱۹۳۴ء)

نثار احمد فاروقی اُردو زبان و ادب کے معتبر محقق اور ناقد ہیں۔ تنقیدِ میرؔ کے سلسلے میں اُن کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے ۱۹۵۷ء میں ''ذکرِ میرؔ'' کا اردو ترجمہ ''میرؔ کی آپ بیتی'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد دلی کالج میگزین کا ''میر نمبر'' ۱۹۶۲ء، تلاش میرؔ ۱۹۷۴ء اور پھر انتخاب کلام میر ''میر تقی میرؔ کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ ''تلاش میر'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔

خلیق انجم نے نثار احمد فاروقی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میرؔ پر جتنا تحقیقی کام نثار احمد فاروقی نے کیا ہے وہ انھیں میرؔ شناسوں میں ممتاز حیثیت دلاتا ہے۔ اس لیے کہ میرؔ کے

بارے میں معلومات کے اتنے مصادر نہیں ملتے جتنے مثلاً غالب
کے حالات وکمالات پر مل جاتے ہیں۔اس لیے میر کی تلاش نسبتاً
ایک دشوار کام ہے۔تلاش میر ایسے ہی چند تحقیقی مضامین کا مجموعہ
ہے۔ان کے مطالعہ سے نثار احمد فاروقی کے گہرے مطالعے، دقیقہ
شناس نظر اور نکتہ رس طبیعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔''۶۳

نثار احمد فاروقی کا سب سے پہلا اور اہم کارنامہ ''ذکر میر'' کا اردو ترجمہ ہے۔اس کے بعد ان کی عظیم خدمات میں دلّی کالج میگزین کا ''میر نمبر'' ہے۔جس کے مرتب اور ایڈیٹر خود نثار احمد فاروقی ہیں وہ لکھتے ہیں:

''دلّی کالج اُردو میگزین'' (ایوننگ کلاسز) کا شمارۂ خصوصی
ہے جو خدائے سخن میر محمد تقی میر دہلوی متوفی ۱۸۱۰ء کے حالات
وکمالات کا جائزہ پیش کرتا ہے۔اس میں میر کی زندگی اور شاعری کے
بیشتر اہم پہلوؤں سے بحث ہوگئی ہے اور اب اس کی حیثیت محض کسی
میگزین کے شمارہ خصوصی کی نہیں بلکہ میر پر ایک مستقل کتاب کی ہو
گئی ہے۔اسی لیے ہم نے اسے کتابی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔
یعنی اس میں مضامین کی ترتیب، لکھنے والوں کے مراتب کے لحاظ
سے نہیں بلکہ موضوع کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔''۶۴

(اس میگزین پر تفصیلی گفتگو باب پنجم میں کی جائے گی)

''تلاش میر'' میں نثار احمد فاروقی کے ۱۹ اہم مضامین شامل ہیں زیادہ تر مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں مگر ''میر کا آرٹ'' مضمون تنقیدی نوعیت کا ہے۔اس مضمون کی ابتدا میں نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''میر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یا اس پر نقد ونظر کا
حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے ادبی سماج سے
پوری طرح باخبر ہوں۔ اس زمانے کے اوضاع و اطوار اور
موضوع ومعیار سے واقف ہوں، اور میر کی شاعری کو اسی عہد کے

سیاق میں پڑھنے کی کوشش کریں۔ اس ماحول کی تصویر کشی میں
مختلف عناصر سے مدد لینی ہوگی۔ تاریخی حالات، تہذیبی قوتیں،
معاشی تقسیم، اور طبقاتی نظام کو بھی سمجھنا ہوگا۔''۴۸؎

نثار احمد فاروقی کلامِ میر کو سمجھنے کے لیے صرف ان کے عہد اور ماحول سے واقفیت پر ہی زور نہیں دیتے بلکہ وہ میر کی شخصیت اور ان کے نجی حالات زندگی و ماحول سے ہمارا واقف ہونا بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں کسی بھی شاعر کے کلام کے ساتھ ہم اس وقت تک انصاف نہیں کر سکتے جب تک اس کے عہد، شخصیت اور خود اس کے ذاتی حالات و ماحول سے واقف نہ ہوں۔ ان کے نزدیک میر کی سوانح کے تین ماخذ ہو سکتے ہیں۔ اوّل ان کی حیات اور وفات کے بعد لکھے گئے تذکرے۔ دوئم ذکرِ میر اور سوئم میر کا کلام۔

نثار احمد فاروقی کے خیال میں ان تین ماخذات سے ہمیں شاعری کے متعلق میر کے نظریات اور تصورات، شاعری میں ان کی زندگی اور شخصیت کا انعکاس اور ان کے فن کے عناصر ترکیبی اور اس دور کی شاعری کے مجموعی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے یعنی یہ تینوں ماخذات میر کے عہد، ان کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ میر کی شاعری کے عناصر پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''میر کی شاعری سے پوری طرح باخبر ہونے کے لیے
ہمیں بیک وقت کئی پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھنی ہوگی یعنی میر کا
سیاسی اور ادبی سماج اس کی انفرادی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور ان
سب حالات کا اس کی شاعری میں انعکاس ہے ساتھ ہی ہمیں اس
عہد کا معاشی نظام بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ جس نے اقتصادی سطح
پر انسانوں کو ہزار خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پھر ساری ادبی
تحریکیں، ان کی عوام و خواص کے ذہنوں پر گرفت، شرافت و
فضیلت کے معیار ۔۔۔۔۔ اور عام زندگی کے دوسرے بنیادی
مسائل یہ سب میر کی شاعری پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوئے
ہیں۔''۴۹؎

نثار احمد فاروقی کے خیال میں کسی بھی شاعر کے کلام کا مطالعہ اس کے عہد کے پس منظر میں زیادہ بہتر طریقہ پر کیا جا سکتا ہے اور پھر میرؔ کا عہد تو تھا ہی پر آشوب۔ میرؔ کو کبھی سکون کے ساتھ اپنے فن پر ریاض کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور بہت ہی خلفشار اور سیاسی ہیجان کا دور ہے۔ میرؔ بھی ان حالات کی بے رحمی کا شکار ہوئے اور بقول نثار احمد فاروقی جب میرؔ نے ''ذکر میرؔ'' لکھی تو:

> ''اپنے بارے میں ضروری اور بنیادی باتیں بھی نہیں بتائیں۔ تمام تر اپنے عہد کے سیاسی واقعات کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ ذکر میرؔ کو پڑھنے والا کوئی شخص بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس کتاب کا نام ''ذکر عہد میرؔ'' ہونا چاہئے تھا۔'' ۵۰

> ''جس طرح میرؔ کی زندگی اس کے عہد کے سیاسی خلفشار اور سماجی مظاہر میں گم ہو گئی ہے۔ اسی طرح یہ دور اس کی شاعری کا جز ولا ینفک بن گیا ہے۔ خود میرؔ کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ ''دل اور دلّی'' کے مرثیے لکھتا ہے۔ یہ ''دلّی'' دراصل اس ہند ایرانی شائستگی کی علامت ہے جس کے آثار میرؔ کی نگاہوں کے سامنے برباد ہو رہے تھے۔'' ۵۱

نثار احمد فاروقی بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ ''میرؔ کے ذہن و مزاج، شخصیت و افکار، اور افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر پیرایہ اور اس سے زیادہ بلیغ ترسیل ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کے عہد کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا آئینہ سامنے رکھ دیا جائے۔ نثار صاحب جہاں ایک طرف میرؔ کے عہد، تاریخ سوانح، اور شخصیت کا ذکر کرتے ہیں وہیں انھوں نے ''تلاشِ میرؔ'' میں میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اپنے مضمون ''میرؔ کا آرٹ'' کے مقصد کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کلیات میرؔ کے گہرے مطالعے سے میرؔ کے آرٹ کی جو باریکیاں معلوم ہوتی ہیں اور اس کے فن کے جو نئے گوشے دریافت ہوتے ہیں انھیں اس طرح پیش کیا جائے کہ ان

نزاکتوں سے لطف اندوز ہونے اور جہانِ میر کے نئے افق
تلاش کرنے میں میرؔ کے ایک طالب علم کی رہنمائی ہو۔''۵۲

اپنی اسی ترتیب کے مطابق انھوں نے میر کے شعری نظریات، نکات الشعراء اور کلیات میرؔ کے حوالے سے بیان کیے ہیں۔

نکات الشعراء کا ذکر کرتے ہوئے نثار احمد فاروقی ان تمام اقسام شعری کا ذکر کرتے ہیں جن کو میرؔ نے اس تذکرے کے آخر میں بیان کیا ہے۔ خاص طور سے وہ چھٹی قسم جسے انداز کا نام دیا گیا ہے اور جو تمام صنعتوں پر محیط ہے۔ اس میں تجنیس، ترصیع، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی خیال وغیرہ ساری خوبیاں شامل ہیں۔ خود میر نے بھی اسی اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ میرؔ نے لکھا ہے:

''جو شخص اس فن میں طرزِ خاص کا مالک ہوگا وہی اس کی لطافت اور معنویت کو سمجھ سکتا ہے۔ مجھے عوام کے معیار و مذاق سے کچھ سروکار نہیں، یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اپنے شاگردوں اور مقلدوں کی رہنمائی کی ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اسی مذاق سے محظوظ ہوں کیونکہ بہر حال شاعری کا میدان بہت بڑا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اس چمنستان ظہور میں یک رنگی نہیں، رنگا رنگی ہے۔''۵۳

میرؔ نے جس طرح سے اپنے تذکرے کے آخر میں اپنے شعری نظریات کا ذکر کیا ہے اس نے اس عہد کی شاعری کے تقریباً تمام بنیادی اسالیب کا احاطہ کرلیا ہے۔ میر کے ان نظریات کی روشنی میں ان کے ساتھ ساتھ ان کے ہم عصروں کے کلام کو بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ نثار احمد فاروقی نکات الشعرا کے علاوہ میر کے ان تنقیدی جملوں سے بھی ان کے شاعرانہ افکار کی نشاندہی کرتے ہیں جو انھوں نے دوسرے شعرا کے متعلق نکات الشعراء میں لکھے ہیں

۔۔۔۔ مثلاً شاعر نادرہ گوئے ریختہ، خوش فکر، تلاش لفظ تازہ، یا طبعش بسیار مائل بہ ایہام، ازین جہت شعراء، بے رتبہ، یا شعر او خالی از لطف نیست، اگرچہ در بندہ لفظ تازہ است،

برزبان خامۂ او خیل ہائے معنی سیاہی می کند، یا بسیار خوش فکر و
عاشق سخن، خالی از دردمندی نیست، سررشتہ مربوط گوئی بدست
ایشان یافتہ می شود از اسالیب کلام شان واضح می گردد کہ بہرہ
بسیارے از دردمندی دارند، یا بسیار بصفا حرف می زد، وغیرہ۔۵۴

ان جملوں سے میرؔ کے تنقیدی نظریات کے علاوہ اس دور کے تنقیدی معیار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

نثاراحمد فاروقی کے خیال میں میرؔ کی شاعری کا ابتدائی حصہ ان کے کلام میں سب سے زیادہ خاص ہے۔اس حصہ کے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

''میرؔ کی شاعری کو باعتبار افکار تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جہاں میرؔ نے اپنے اس نظریۂ فن کی مکمل تبعیت کا اظہار کیا ہے اور اس حصہ کو میرؔ کی شاعری کا نمائندہ حصہ کہنا چاہیۓ۔ اس میں لفظی رعایت بھی ہے اور مینا کاری بھی، تشبیہوں کی ندرت بھی ہے اور بیان کی پاکیزگی بھی، لب و لہجے کی شائستگی، سلاست لفظی، تصویر کشی اور خیال کی تجسیم یہ ساری خوبیاں بیک وقت مل جاتی ہیں''۔۵۵

نثاراحمد فاروقی کا خیال ہے کہ

''میرؔ کے ابتدائی دور کے کلام میں بڑی انفرادیت تھی مگر بعد میں میرؔ غیر شعوری طور پر رائج الوقت معیاروں کی طرف جھکتے گئے۔ حالانکہ ہونا تو اس کے برعکس چاہیۓ تھا کہ میرؔ کا آخری دیوان ان کے پچھلے تمام دیوانوں پر بھاری ہوتا۔اور اس میں ان کی اپنی شخصیت اور فکر کی زبردست نمائندگی ہوتی۔ فاروقی کے مطابق ایسا نہیں ہوا اگر ہم بغور کلام میرؔ کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ میرؔ کا اسلوب ایک خاص حد تک پہنچ کر رہ گیا ہے۔ان کے آرٹ کی نمائندگی کرنے والے بہترین اشعار دیوان اول میں

بیشتر اور دیوان دوم میں کم تر ملیں گے وہ نکات فکر اور ندرت خیال
جو دیوان اوّل کی ہیئت اور مواد میں ملتی ہے۔ دوسرے دواوین
میں اس پر اضافہ نہیں ہوا ہے۔" ۵۶

نثار احمد فاروقی اپنی بات کی دلیل دیتے ہوئے میرؔ کی شاعری کے دوسرے حصے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"میرؔ کے کلام کا دوسرا حصہ دہلی کے اٹھارہویں صدی
عیسوی کے ادبی مذاق اور معیار کے زیر اثر لکھا گیا ہے اور اس پر
فارسی کا اثر ہے، یا محض تلاش الفاظ ہے یا ایہام یا تجنیس ہے۔ ۵۷

میرؔ کی شاعری کے تیسرے حصے کے متعلق نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے۔

"اور تیسرا حصہ وہ ہے جس میں اسلوب کی نفاست اور
نادرہ کاری نہیں ہے بلکہ فنی کرتب دکھائے گئے ہیں سخت ردیف و
قوافی، پیچیدہ مضمون، ژولیدہ انداز بیان اور بے ساختگی کی جگہ
ساختگی کا اثر نمایاں ہے۔۔۔۔۔۔ اس میں نہ میر کا منفرد آرٹ
ہے نہ عصری تقاضوں کی تکمیل۔ اور روایتوں کی تقلید۔" ۵۸

نثار احمد فاروقی کا اسے کارنامہ ہی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کلام میرؔ کی تقسیم اس طرح کی ہے ورنہ اس سے قبل اس طرح کی کوئی تقسیم نہیں ملتی انھوں نے نہ صرف میر کے کلام کو تین حصوں میں منقسم کیا بلکہ اپنے دعوے کی دلیل میں اشعار بھی دیئے مثلاً تیسری قسم کے لیے وہ جس طرح کے اشعار مثال میں دیتے ہیں ایک لمحہ کے لیے یقین نہیں ہوتا کہ یہ اشعار میر کے ہیں۔

مگر ساتھ ہی نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ میرؔ کے کلام کا یہ بہت قلیل حصہ ہے اس طرح کے اشعار کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔

نثار احمد فاروقی نے میر کے کلام کی تقسیم کے ساتھ ان کے فن پر بھی گہری تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ مثلاً ان کی بحریں خاص طور سے ہندوستانی بحریں ان کا Rythm، انتخاب الفاظ اور ان الفاظ سے معنی میں تہ داری اسلوب میں شیشہ کاری سب کو میرؔ نے نہایت سلیقے

سے پیش کیا ہے۔ ان تمام خوبیوں میں تکرار الفاظ، سہل ممتنع اور میر کا لب و لہجہ خصوصی توجہ کا طالب ہے کیونکہ بعد میں جدید ناقدین نے انھیں خصوصیات پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھی ہے۔ تلاش الفاظ رنگا رنگ متحرک اور مختلف جہات والی امیجری بھی میر کے کلام کا اہم حصہ ہیں۔ فاروقی لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی شاعری کے اسلوب پر جتنا غور کریں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ لفظوں کا مصور ہے ایک نہایت ماہر فن کار جو Canvas پر موقلم سے ایک تصویر بناتا ہے اور جانتا ہے کہ اس تصویر میں جہات (Dimensions) کس طرح دکھائی جائیں گی، کون سا رنگ شوخ ہو، کون سا ہلکا ہو، کہاں وضاحت کی ضرورت، کدھر ابہام درکار ہے۔''[59]

میرؔ کی جس خوبی کی طرف نثار احمد فاروقی نے مندرجہ بالا اقتباس میں اشارہ کیا ہے الفاظ پر میر کی قدرت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کس طرح میرؔ لفظوں پر قادر تھے۔ بقول فاروقی میرؔ معمولی الفاظ سے بھی غیر معمولی کام لیتے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے معمولی لفظ جو ہماری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے میرؔ کے اشعار میں قوت اور تاثیر کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً سا، ہی۔ تس۔ کچھ تئیں، ٹک وغیرہ۔ فاروقی علم نفسیات کے ایک مسلمہ اصول (خیالات کا تسلسل) Association of thought کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح نفسیات میں اس اصول کے تحت ایک بات سے دوسری بات یاد آتی ہے ''میرؔ بھی الفاظ کو ایسے تناسب سے جمع کرتا ہے کہ ان کے ربط باہمی سے خیال کا ایک بڑا Canvas بن جاتا ہے اور ہر لفظ دوسرے متناسب لفظ کی قوت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔''

نثار احمد فاروقی نے حالانکہ میرؔ پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی مگر ''ذکر میرؔ'' کا ترجمہ ہو یا دلی کالج میگزین کا ''میرؔ نمبر'' یا پھر تلاش میرؔ اور انتخاب کلام میرؔ ہر جگہ ان کے مضامین صرف تحقیقی نوعیت کے نہیں۔ ان میں تنقیدی عنصر پورے طور پر موجود ہے۔ نثار احمد فاروقی نے میرؔ کے کلام کو تاریخی سماجی، فنی ہر اعتبار سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اسی خوبی کے سبب تنقید میرؔ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

حسن عسکری (۱۹۷۸ء۔۱۹۲۱ء)

میرؔ کی حمایت میں قلم اٹھانے والے ناقدین میں اثرؔ کے علاوہ حسن عسکری کا نام خاصا اہم ہے۔ حسن عسکری نے میر پر بہت سے مضامین لکھے جن میں سے کچھ تو جھلکیاں میں شائع ہوئے اور کچھ ان کی مختلف کتابوں میں۔ خصوصی طور سے میرؔ کی شاعری پر ان کے نظریۂ تنقید کا اندازہ ''میر اور نئی غزل'' (حصہ اوّل و دوم) انتخاب میر مقدمہ (ساقی میرؔ نمبر ستمبر ۱۹۵۸) ''جدیدیت، غالب اور میر جی'' اور ''میرؔ کی فنی شخصیت'' سے ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ انسان اور آدمی، ادب اور انقلاب، ہمارا ادبی شعور اور مسلمان، ادب یا علاج الغربا، ادب اور جدلیات اردو میں طنز کے اسالیب، چھوٹی بحر، بھلا مانس، غزل گو، مزے دار شاعر، کچھ فراقؔ صاحب کے بارے میں، فراقؔ صاحب کی شاعری میں عاشق کا کردار اور تقسیم ہند کے بعد میں بھی میرؔ کے خصوصی حوالے ملتے ہیں۔ یہ تمام مضامین نقدِ میر کے سلسلے میں ان کے خیالات کی وضاحت کرتے ہیں۔ پروفیسر شافع قدوائی نے لکھا ہے:

> ''حسن عسکری کے ان تمام مضامین پر بیک وقت نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے میرؔ سے متعلق مقبول عام تصورات سے شعوری طور پر اجتناب کیا اور کلام میرؔ کے ایک نئے زاویۂ نظر سے مطالعہ کرنے پر زور دیا''۔ ۶۰

حسن عسکری میرؔ کو انسان دوست قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں میرؔ قدم قدم پر دوسرے انسانوں سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں، ان کے معیار سے اپنے آپ کو جانچتے ہیں اور پھر اپنی خامیوں کو بڑی جرأت سے تسلیم بھی کرتے ہیں۔ حسن عسکری نے لکھا ہے:

> ''۔۔۔۔۔۔ وہ دوسروں کو بھی اپنی اپنی انفرادیت اور خودی کے اظہار کا اتنا ہی حق اور موقع دیتے ہیں جتنا اپنے آپ کو، اور اپنی برتری منوانے پر ذرا بھی اصرار نہیں کرتے۔ اکثر وہ خود اپنے اوپر ہنستے ہیں، خود اپنے اوپر طنز کرتے ہیں، ایسا طنز نہیں جس میں تلخی اور بیزاری شامل ہو بلکہ یہ طنز میرؔ کی سب سے انفرادی اور سب سے ممتاز چیز ہے۔'' یہاں لا کر وہ دونوں حقیقتوں کو ایک جگہ

ملا دیتے ہیں۔ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی تسلیم کرتے ہیں اور اپنے
نقطۂ نظر کی اہمیت اور برتری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرتے ہیں،
اپنے اوپر ہنستے بھی ہیں اور اپنے آپ سے محبت بھی کرتے ہیں۔
اس طنز میں اپنے آپ سے مایوسی اور نفرت نہیں ملتی بلکہ اپنے آپ
سے لطف لینے کی صلاحیت ملتی ہے۔'' ۶۱

حسن عسکری نے جس طرح اپنے مختلف مضامین میں میرؔ کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے اس نے انھیں ناقدین میر میں خاصا اہم بنا دیا ہے ورنہ میرؔ جس کو قنوطیت اور بیزاری سے الگ کر کے بہت کم دیکھا گیا اس کے یہاں انسان دوستی کی بات کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ میر اپنی برتری منوانے پر ذرا بھی اصرار نہیں کرتے بلکہ خود پر ہنستے اور طنز کرتے ہیں۔ حسن عسکری کے بقول میرؔ تو عاشق و معشوق کو بھی انسانی سطح پر برابر سمجھتے ہیں ابوالکلام قاسمی نے عسکری کی اس خصوصیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''محمد حسن عسکری میر کی شناخت کرتے ہوئے زندگی کی
بصیرت اور ذہنی دنیا کی بات نہیں کرتے۔ عسکری نے میرؔ کو انسان
دوستی اور عشق کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اس
خیال کو بڑی شہرت حاصل ہوئی کہ میرؔ کی شاعری کا عاشق محبوب
سے محبت کا طالب نہیں بلکہ اتنا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ
انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے۔ اس کے عالم و فاضل ہونے کی وجہ
سے نہیں بلکہ انسان ہونے کی وجہ سے''۔ ۶۲

صرف عاشق ہی نہیں بحیثیت انسان ہونے کے حسن عسکری کے میرؔ کو محبوب کی مجبوریوں کا بھی احساس ہے مندرجہ ذیل اقتباس کا تنقیدی مطالعہ کیجیے تو عسکری کا کمال دیکھیے:

''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محبوب کی بے اعتنائی کو بھی میرؔ ہمیشہ
سخت دلی اور ظلم یا فطری بدکرداری نہیں سمجھتے۔ ان کے بہترین
شعروں میں محبوب بھی انسان ہوتا ہے اور اس کی وہی خصوصیات
ہوتی ہیں جو اور انسانوں کی۔ میرؔ کو فرد کی لازمی تنہائی کا پورا

احساس ہے۔ دو انسانوں کے جذبات و احساسات میں پوری
مطابقت بالکل ناممکن ہے، نہ ایک انسان دوسرے انسان کی
زندگی میں پوری طرح شریک ہوسکتا ہے۔ اگر محبوب بے اعتنائی
کرتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اس کی وجہ کج خلقی یا اذیت پسندی
ہو، بلکہ فطری اور انسانی مجبوری بھی ہوسکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ
محبوب چاہے بھی اور عاشق پر مہربانی بھی نہ کرسکے۔ ایسی صورت
میں عاشق اپنی بدنصیبی پر افسوس تو کرسکتا ہے لیکن محبوب کی شکایت
بالکل بے جا ہے۔ تنہائی زندگی کا قانون ہے اور اس کے سامنے
عاشق اور محبوب دونوں مجبور و معذور ہیں۔ اگر قصور ہے تو عاشق کی
لامحدود آرزوؤں کا۔ آرزوؤں کی شدت کا۔ چنانچہ عاشق کے
لیے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ جس طرح ہوسکے
اپنا غم برداشت کرے۔ ۶۳

حسن عسکری کی اس انسان دوستی کے پیچھے اصل میں ان کی یہ سوچ کارفرما تھی کہ میرؔ ہماری نئی ذہنی اور روحانی ضرورتوں کا شاعر ہے جو غالبؔ کی شاعری سے پوری نہیں ہوتیں بلکہ ہمارے سامنے جو مسئلے ہیں انھیں میرؔ نے زیادہ شدت سے محسوس کیا ہے۔ اور ان کے خیال میں میرؔ نے ہمیں سے ''ہم آہنگ'' کیا ہے۔ حسن عسکری میرؔ کے متعلق قائم کردہ مفروضات یاس، غم اور محرومی کا رَد اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''میرؔ نے زندگی کے متعلق جو کچھ سمجھا اور سوچا۔ اس کا لب
لباب یہ ہے کہ بھرپور زندگی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنی
خودی کو کائنات، زندگی اور تمام انسانوں کے سامنے نذر کردے لیکن
ساتھ ہی اپنی خودی سے مایوس اور بے زار بھی نہ ہو، اور یہ رائے کوئی
قنوطیت پسند اور یاس پرست آدمی نہیں دے سکتا۔'' ۶۴

ترقی پسند ناقدین کی طرح حسن عسکری بھی میرؔ کو قنوطی اور یاس پرست نہیں سمجھتے ان کے خیال میں میرؔ زندگی سے مایوس یا بیزار ہونے کی بجائے تسلیم و رضا اور صبر کی تلقین

کرتے ہیں اسی لیے وہ میر و غالب کا موازنہ کرتے وقت اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "میر غالب سے زیادہ جدید ہے کیونکہ وہ نئے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے، آج کا ہمارا غزل گو غالب کی نہیں میر کی شاعری میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ اور اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ۱۹۴۹ء کی مثال دیتے ہیں کہ اس عہد کے لیے میر کی شاعری کہیں زیادہ معنی خیز ہے اسی لیے نئے غزل گوؤں کی طبیعت کو میر سے ایک خاص فطری تعلق ہے"۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے شعرِ شور انگیز میں لکھا ہے

"۔۔۔۔۔۔۔عسکری صاحب نے ایک مخصوص اور ذرا محدود نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے میر کے بہترین اشعار کی جگہ میر کی مکمل یا اگر مکمل نہیں تو نمائندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح میر کے بہت سے عمدہ اشعار کے ساتھ کم عمدہ اشعار بھی انتخاب میں آگئے ہیں، لہٰذا اس انتخاب کی روشنی میں میر کے شاعرانہ مرتبے کے باب میں صحیح رائے قائم نہیں ہوسکتی۔" ۶۵

شمس الرحمٰن فاروقی حسن عسکری کی میر پرستی پر بھی معترض ہیں۔

"عسکری نے میر کو غالب سے بڑھا دیا لیکن عسکری صاحب نے میر کی برتری کے لیے جو دلائل دیئے ہیں وہ خود ایک مفروضے پر مبنی تھے۔ پھر انھوں نے فراق کے لیے تقریباً یہ کہہ دیا کہ وہ میر سے بڑے شاعر تھے اس لیے میر کے بارے میں حسن عسکری کی تحسین مشتبہ رہی۔" ۶۶

بہر حال شمس الرحمٰن فاروقی کی اس رائے کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حسن عسکری نے میر کو ایک نئے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی انھوں نے کلام میر کو انسانی تعلقات کے تناظر میں سمجھ کر تفہیم میر کو ایک نیا سیاق فراہم کیا۔ جوان کی تنقیدی بصیرت کی دلیل ہے بقول حسن عسکری:

"اپنے شدید ترین لمحوں میں بھی ایک عام آدمی کی

مجموعی زندگی ان کی (میرؔ کی) نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی بلکہ
ان کی شاعری کا موضوع دراصل یہی مسئلہ ہے کہ فرد کے ذاتی
تجربات کا مقام زندگی اور کائنات میں کیا ہے۔''۶۷

حسن عسکری کا یہ خیال ان کی تنقیدی بصیرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرؔ کی شاعری کی تفہیم میں ایک اضافہ ہے۔

ناصر کاظمی

میرؔ پر لکھا گیا ناصر کاظمی کا اہم ترین مضمون سب سے پہلے 'بنائے تازہ' کے عنوان سے میرؔ کی غزلوں کے ایک مختصر انتخاب کے ساتھ رسالہ ''سویرا'' نمبر ۱۹۔۲۱ میں شائع ہوا۔ مگر اس مضمون سے قبل ''دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف'' اور ''خوشبو کی ہجرت'' بھی شائع ہو چکے تھے۔ یہ دراصل وہ مکالمات ہیں جو ناصر کاظمی اور ان کے دوستوں انتظار حسین، حنیف رامے اور شیخ صلاح الدین کے مابین ہوئے ''خوشبو کی ہجرت'' رسالہ ''سویرا نمبر ۱۷۔۱۸ میں اور ''دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف ۱۹۵۴ء میں ماہِ نو میں شائع ہوا۔

''دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف'' بظاہر تو مکالمہ ہے مگر اس مکالمہ میں ناصر کاظمی نے بعض اہم نکات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی ہے وہ میرؔ کی کلیات کو تاج محل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرؔ کی کلیات کی مثال تو تاج محل کی سی ہے -----
وہ تاج محل جو ابھی ابھی تیار ہوا ہے، اس کے گرد ملبہ جوں کا توں
پڑا ہوا ہے اور مچانیں ابھی اتاری نہیں گئیں۔''۶۸

یہاں تاج محل سے ناصر کاظمی کی مراد میرؔ کا لطیف کلام اور ملبہ سے میرؔ کی شاعری کے حشو و زوائد ہیں دراصل میرؔ کا تاج محل غالبؔ کے تاج محل کی طرح صاف و شفاف نہیں بلکہ اس میں لطافت اور کثافت کا میل ہے اور بقول ناصر کاظمی اگر ہم اسے ملبے والا تاج محل سمجھ رہے ہیں تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کم نہیں ہوتی۔

اس مکالمہ کا عنوان میرؔ کے اس شعر سے لیا گیا ہے

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

ناصر کاظمی نے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ نگر تمھارے ذہن کی بستی نہیں بلکہ میر کا دل ہے اس کے دل کی آگ چٹھیوں کی بجائے محبت روشن کرتی ہے۔۔۔۔۔ وہ اس لیے کہ میر نے دل کے علاوہ دل میں بھی ایک دلی بسائی ہوئی تھی وہ دل اور دلی دونوں بستیوں سے الگ ایک نئی بستی کی بات بھی کرتا تھا اس لیے دل اور دلی یعنی احساس اور احساس کا منبع دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں۔''۶۹

ناصر کاظمی نے میر کو صرف بہتر نشتروں کا شاعر قرار نہیں دیا بلکہ وہ لکھتے ہیں:

''میر کے جو برے بھلے انتخاب ہو رہے ہیں ان میں میر سے انصاف نہیں ہوا ہے اس کے بہتر نشتروں کا ہلاک میں بھی ہوں، لیکن ان نشتروں پر ہی بات ختم نہیں ہو جاتی۔ مجھے تو اس کی غیر معروف سے غیر معروف غزلوں میں بعض اشعار یا مصرعے پدم سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے اور پھنکارے نظر آتے ہیں۔ یہ سانپ انگشت کے برابر ہوتا ہے۔ مٹی کے رنگ کا عام نظروں سے اوجھل رہتا ہے اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا میں نے یہ زہر بھی سہارا ہے۔''۷۰

یعنی ناصر کاظمی اپنے سے قبل ہوئے انتخابات میر سے مطمئن نہیں تھے خاص طور سے محمد حسین آزاد کے بہتر نشتروں والے قول سے اسی لیے انھوں نے اپنا ایک الگ انتخاب شائع کیا جس کے مقدمے کے طور پر ان کا مضمون ''میر ہمارے عہد میں'' شامل تھا۔ اس مضمون کے متعلق شیخ صلاح الدین نے لکھا۔۔۔ کہ

''یہ اُردو کے معدودے چند بہت اچھے مضامین میں شامل ہے۔ جس کی روشنی میں میر کو سمجھا جا سکتا ہے۔''۷۱

اس میں شک نہیں ناصر کاظمی کا یہ مضمون خاصا اہم ہے اس کی ابتداء ہی میں انھوں

نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ہمارے زمانے میں میرؔ کے چرچے کا کیا سبب ہے؟ اقبالؔ، غالب، انیسؔ اور نظیرؔ کی اہمیت اپنی جگہ مگر آج کل صرف میرؔ کیوں ناقدین کا موضوع بنے ہوئے ہیں؟

اپنے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے میرؔ کو اپنا جیون ساتھی قرار دیا ہے۔ ایک ایسا ساتھی جس سے ہر قدم پر جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابتدا میں وہ میرؔ کا ضخیم کلیات پڑھنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ والدہ صاحبہ کے کہنے سے بہتر نشتر ضرور یاد کر لیے تھے مگر آہستہ آہستہ ان کی دلچسپی میرؔ میں بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے میر کے دو تین سو نشتر تلاش کر لیے۔ ناصر کاظمی نے لکھا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اپنی زندگی کے رنگ مجھے میرؔ کے یہاں نظر آنے لگے۔

"اب میر کی شاعری میں کسی حد تک مجھے اپنی شخصیت کے اور کچھ اور نئے پہلو بھی نظر آنے لگے یا یوں کہیے کہ میر صاحب کے کچھ اور رنگوں نے مجھے متوجہ کیا۔ جگنو پکڑنے اور سنگریزے چننے کے ساتھ ساتھ لفظ تازہ کی تلاش تو مجھے ابتدا ہی سے تھی، اب انھیں لفظوں کی تہ میں جہانِ معنی نظر آنے لگا۔ میر کی سیدھی سادی اور پرسکون بحروں اور عام لفظوں کی تہ میں مجھے اپنے جذبات کا اضطراب محسوس ہونے لگا۔۔۔۔ اور میر صاحب کا یہ شعر بچپن میں پڑھا تھا ؎

جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

یہ شعر اس وقت بھی جی کو لگا تھا لیکن آج سے نو سال پہلے کی بات ہے جب ایک رنج دلی سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ بات سنی جو گمان میں نہ تھی اور وہ کچھ دیکھا جو خیال میں بھی نہ تھا۔۔۔۔۔۔ یہ "دیکھا" کا لفظ تو میر نے اس طور سے برتا ہے کہ جی ہی نکل جاتا ہے۔ ماضی کے بے شمار تجربات جو انسانوں پر بیتے میر نے انھیں سنا اور ایک مقام نظر پر اس طرح مجتمع کر دیا ہے کہ ہر لفظ ایک اسم

بن گیا ہے جو استعارے کا گداز لیے ہوئے ہے۔"۲ے

اس پورے اقتباس میں ناصر کے تاثرات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ناصر کاظمی کو جب میر کے کلام میں اپنے جذبات کی عکاسی نظر آنے لگی تو میر کی شاعری میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "میر نے ماضی کے بے شمار تجربات جو انسانوں پر بیتے ۔۔۔۔کو ایک مقام پر مجتمع کر دیا ہے۔"لفظ'دیکھا' " سے جس طرح کا اثر ناصر کاظمی پر ہوا وہ آج ہمارے اوپر بھی ہوتا ہے اپنے انھیں تاثرات کا اظہار ناصر کاظمی نے کیا ہے۔ ناصر کاظمی کے خیال میں جو لوگ میر پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے کلام میں بھرتی کے اشعار بہت ملتے ہیں ان کو اس بات کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہئے کہ میر نے تقریباً اسی سال کی عمر گزاری اور اس طویل عمر میں انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ انھیں زبردست تجربات ہوئے لہٰذا ان پر کیا گیا یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔

ناصر کاظمی ان حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں جو میر کے بے شمار تجربات کا سبب بنے ان کی زندگی کس طرح گزری کیسے ماحول اور حالات میں انھوں نے آنکھ کھولی، بڑے ہوئے، کیسے روزگار کی تلاش میں وطن چھوڑ کر دتی گئے۔ کس طرح انھیں عشق ہوا اور اس عشق نے میر کو دیوانہ بنا دیا۔ پھر مغلیہ سلطنت کے زوال اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے تو غضب کر دیا۔ کال، سیلاب، خانہ جنگی، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی کی قتل و غارت گری، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کے حملوں نے دلی کو اجاڑ دیا۔ اس دتی کے ساتھ میر کا دل بھی اُجڑ گیا۔

اس کے بعد بھی میر نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنے زمانے کے حالات کا نقشہ جس طرح میر نے اپنے اشعار میں کھینچا ہے وہ انھیں کا کارنامہ ہے۔ ناصر کاظمی لکھتے ہیں کہ میر نے جس طرح سے پامال چیزوں، بھوکے جانوروں اور شکستہ لشکریوں کی تصویر کشی کی ہے اور کیسے کیسے سنگلاخ الفاظ کا غزل میں استعمال کیا وہ زبان پر ان کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے کہ میر کس قدر بے خوفی سے الفاظ کا استعمال کرنے میں ماہر ہیں۔ الفاظ خواہ غیر مانوس اور غیر فصیح کیوں نہ ہو وہ ان کے استعمال سے نہیں جھجکتے۔ میر زبان کے استعمال میں جتنے بے ساختہ اور بے کواک تھے اتنا کوئی بھی شاعر نہیں۔ وہ الفاظ کا اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ ان کے شعر میں معیوب یا گراں نہیں محسوس ہوتے یہ میر کی ایک بہت بڑی صفت ہے۔ خواہ الفاظ

بھونڈے اور ثقیل ہی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً چار پائیاں، کشتۂ عالم، پلیتھن، نکی، یہ سب ایسے الفاظ ہیں جو بظاہر ہمیں مبتذل نظر آتے ہیں، مگر ان میں میرؔ کے تجربات اپنی پوری شدت کے ساتھ پوشیدہ ہیں۔ ناصر کاظمی نے لکھا ہے:

> "۔۔۔۔۔ میرؔ کے یہ قہقہے اس معاشرے کی عبرتناک تصویریں ہیں۔ یوں ان کے غم کو محض غم پرستی بھی کہنا جائز نہیں کہ وہ اپنے دکھ درد اور خواہشات کو ایک عام انسانی جذبات کی حیثیت دے کر اسے اس طرح ادا کر جاتے ہیں جیسے وہ تمام دوسرے انسانوں کی طرف سے کہا ہو۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کو ایک اجتماعی رویے کی شکل دے دیتے ہیں ۔۔۔۔ اس دور مصائب میں بھی میر نے اپنی قومی روایت، خاندانی نجابت اور عالی حوصلگی کو نہیں چھوڑا۔۳ے

ناصر کاظمی کے خیال میں میرؔ غم پرست نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اپنے ذاتی غم کو بھی اجتماعی غم کی شکل دے دی ہے اس لیے ان کا غم، اس عہد کا نمائندہ غم بن جاتا ہے۔ میرؔ کیسے بھی خراب حالات ہوں اپنا حوصلہ و ہمت نہیں کھوتے۔

ناصر کاظمی کا یہ مضمون شروع سے آخر تک بے حد تاثراتی ہے۔ کہیں ان کی زبان انشائیہ کا رنگ اختیار کر لیتی ہے کہیں طنز کا اور کہیں عقیدت کا، لیکن ان کے مضمون کے مطالعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تنقیدِ میرؔ کے سلسلے میں بعض باتوں کی نشاندہی کی ہے جس میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کے عہد میں میرؔ کی مقبولیت کا سبب کیا ہے۔ کیا یہ سبب صرف بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی تک محدود ہے یا اس سے آگے بھی میرؔ کے کلام کے تاثر کی کڑیاں کہیں جڑتی نظر آتی ہیں۔ ناصر کاظمی نے ان حالات کی طرف اشارہ کیا ہے جن حالات میں میرؔ کی شاعری نے پرورش پائی اور اس بات کی شکایت کی ہے کہ میرؔ کی شاعری کو مجموعی حیثیت سے نہیں دیکھا گیا ہے میر کا دیوان کتنے ہی لوگ بغل میں دبا کر پھریں لیکن انھیں مجموعی طور پر کسی نے نہیں سمجھا۔ اس سلسلے میں ناصر کاظمی کا یہ دلچسپ اقتباس دیکھیے۔:

> "چند اندھوں نے ہاتھی کو اپنے طور پر ٹٹولا، کسی نے دم کو

محسوس کیا، کسی نے کان، کسی نے سونڈ، کسی نے دانت اور کسی نے
ٹانگ اور باہم مل کر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔
یہی قصہ بڑے شاعر کا ہے کہ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آتا۔ ہوا
یہ کہ میرؔ کی پوری شخصیت اور شاعری کے مختلف النوع عناصر کو ایک
اکائی میں پرو کر نہیں دیکھا گیا۔ البتہ اس کی شاعری کے چند نمایاں
پہلوؤں کو الگ الگ کر قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے کا دعویٰ
ضرور کیا گیا ہے، کسی نے انھیں غم کا امام کہا تو دوسری طرف آواز اٹھی
کہ نہیں صاحب! میر صاحب کی شاعری میں خوشگوار عناصر بھی ہیں
کسی نے ان کے کفر و الحاد پر طنز کی تو اسے فرشتہ سیرت انسان ثابت
کرنے کی کوشش کی گئی، غرض جتنے منہ اتنی باتیں لیکن نظم نگاروں
نے ہیئت کے تجربے چھوڑ کر میرؔ کی طویل بحروں میں طبع آزمائی
شروع کردی یا ایک گروہ نے میرؔ کی چھوٹی بحروں کو اصل میر سمجھا
بہر حال یہ تو ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بعد بہت
سے فرقے چھوڑ جاتا ہے۔"۴۴

اس طرح انھوں نے ان تنقیدی رویوں کو اپنا ہدف بنایا ہے کہ جن کے تحت میرؔ کا سطحی مطالعہ کیا جاتا رہا ہے ان کا خیال ہے کہ یاسیت یا غم کو ان کی شاعری کا بنیادی محرک اور رویہ سمجھ لینا مناسب نہیں اس لیے کہ:

"بڑے شاعر کا احساس الم غم پرستی نہیں خود آگاہی اور
زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔"۴۵

ناصر کاظمی کسی فن پارے کو تاریخی دستاویز کی حیثیت سے دیکھنے کو درست قرار نہیں دیتے اس طرح وہ تاریخی یا سماجی مطالعے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ یوں بھی شاعر کا کلام یا کوئی بھی ادبی تخلیق تاریخی یا سماجی دستاویز نہیں ہوتی اس کی زبان، فکر الفاظ، استعاروں اور محاوروں کے پیچھے وہ عہد سانس لیتا ہے جس سے تخلیق کار کا تعلق ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ اگر شاعر کا تجربہ وسیع ہو تو شاعری بھی اپنے زمانے کی تصویر بن جاتی ہے اور اس طرح

وہ عصری اثرات کو کسی حد تک قبول کر لیتے ہیں شاید جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

''واقعات کی مماثلت کی وجہ سے میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے۔''۶ے

مجموعی حیثیت سے ناصر کاظمی کا مضمون میرؔ تنقید میں کوئی نیا پہلو تو نہیں پیدا کرتا لیکن ان کا اسلوب اور میر سے اس کا تعلق لوگوں کو مطالعۂ میر کی طرف متوجہ ضرور کرتا ہے۔

فراقؔ گورکھپوری (۱۹۸۳ء۔۱۸۹۶ء)

میرؔ کی حمایت میں جن مصنفین نے اثرؔ لکھنوی کے بعد اور محمد حسن عسکری کے ساتھ قلم اٹھایا ان میں فراقؔ اور ناصر کاظمی قابلِ ذکر ہیں۔ فراقؔ نے اپنے مضمون میرؔ کی عالمگیر مقبولیت اور ناصر کاظمی نے اپنے مختلف مضامین میں میر کی شاعری کا ایسا تنقیدی جائزہ لیا کہ میرؔ شناسی کی باقاعدہ تحریک ہی شروع ہو گئی۔ فراقؔ میرؔ کی عالمگیر مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس فقرہ میں عالمگیر کا لفظ ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے یعنی میرؔ کی شاعری نے اب سے دو سو برس پہلے جنم لیا اور اس دو سو برس کے عرصہ میں اُردو میں کئی دیو قامت ہستیاں پیدا ہوئیں۔ ان تمام مشاہیر اُردو کا آپس میں اختلاف مذاق و مزاج رہا ہے۔ اور اس کے باوجود میرؔ کی عظمت کے سامنے سب کے سب نے سرِ تسلیم خم کیا ہے یعنی اُردو کی تمام دنیا سے گذشتہ دو سو برس سے میرؔ کو عالمگیر مقبولیت حاصل رہی ہے ایک آدمی بھی اُردو دنیا میں میر سے منکر نہیں ہوا ہے۔''۷ے

فراقؔ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں اور وہ بھی دلیل کے ساتھ کہ گذشتہ دو سو برس میں اُردو کے بڑے سے بڑے شاعر نے میرؔ کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ ان کا خیال ہے کہ میرؔ کی عظمت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ ہمارے دل کی بات کہتے ہیں۔ ان کے اشعار ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

لکھتے ہیں:

''ہمارے داخل ترین محسوسات کی اتنی فطری مصوری اور وہ بھی کم سے الفاظ میں، سادہ سے سادہ الفاظ میں معمولی سے معمولی الفاظ میں اُردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکا ہے ان کے ایسے اشعار ہمارے دلوں سے آخری تہوں سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ میر نہیں بول رہے ہیں ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے۔ فروعات ضمنیات اور تمام مصنوعات سے معریٰ اور آزاد ہو کر یہی بات میر کی آواز کو زندگی بنا دیتی ہے۔''۸ے

فراق گورکھپوری میر کی شاعری کے عالمگیر ہونے کا سبب اس سادگی اور فطری انداز کو قرار دیتے ہیں جس کے سبب میر کا کلام براہِ راست ہمارے دل پر اثر کرتا ہے۔ اس شاعری میں صنعتوں کی زیادتی نہیں ہوتی بلکہ ایسے فطری انداز میں میر اپنی بات کہتے ہیں کہ لگتا ہے میر ہمارے ہی جذبات کی عکاسی کر رہے ہوں۔ فراق نے اپنی بات کی دلیل کے طور پر میر کے تقریباً ۵۵ اشعار کا مختصر انتخاب بھی اپنے اس مضمون میں دیا ہے۔ جس میں میر کے بہترین اشعار شامل ہیں۔ فراق کے خیال میں ان تمام اشعار میں شاعری کے خارجی عناصر سے اجتناب کیا گیا ہے۔ ان اشعار کی سب سے اہم خصوصیت ان کی تاثیر ہے ان کے خیال میں میر ہمارے داخلی واردات پر پڑے پردوں کو اٹھاتے ہیں اور زندگی میں غموں کے بعد جو سنبھالے کی کیفیت آتی ہے اور زندگی مصیبتوں اور پریشانیوں کے بعد جس طرح نئی توانائیاں حاصل کرتی ہے۔ میر کے اشعار پڑھنے کے بعد وہی اثر پیدا ہوتا ہے۔

لیکن فراق گورکھپوری ایک بڑی عجیب بات کہتے ہیں وہ یہ کہ ''میر نے کبھی سماجی زندگی کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ لگا سکتے تھے'' میر نے زمانے کی افراتفری سے پریشان ہو کر اپنی شخصیت میں پناہ لی ہے۔

فراق میر کے یہاں آفاقیت کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ میر کے لہجے اور انتخاب الفاظ کا ذکر کرتے ہیں کہ میر کا لہجہ انسانی ہے۔ وہ جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسانیت کے دل پر ہاتھ رکھا ہے۔ میر کے الفاظ آفاق کے

حامل ہیں۔ میرؔ کے یہاں فردیت وشخصیت عالمگیر بن جاتی ہے۔ان کی معمولی باتیں بھی آفاقی شعور کی پیداوار ہیں۔

مگر جس شاعر کے کلام میں آفاقی عنصر موجود ہے وہ اپنے سماج سے بے گانہ کس طرح رہ سکتا ہے لیکن فراق گورکھپوری میرؔ کی شخصیت کو ان کی شاعری سے الگ نہیں کر پاتے۔ لکھتے ہیں:

> ''اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام میں اس کی ذاتی شخصیت اور کردار کا اتنا شدید اندازہ نہیں ہوتا، جتنا ناقابلِ انکار اندازہ شخصیت میرؔ کے کلام سے ہوتا ہے۔ میرؔ کا ہر شعر خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو میرؔ کی تصویر پیش کر دیتا ہے۔'' ۷۹

ابوالکلام قاسمی نے بھی فراقؔ کے یہاں اس تضاد کا ذکر کیا ہے:

> ''فراق گورکھپوری نے اپنی تنقید میں تخلیقی اور تاثراتی انداز اختیار کر کے گو کہ میرؔ کے بعض نئے گوشوں کی نشاندہی بھی کی ہے مگر میرؔ کے شخصی حالات کا حوالہ انھیں کوئی آزاد رائے قائم کرنے سے باز رکھتا ہے وہ اس لے کو اتنا تیز کر دیتے ہیں کہ انھیں ایک ساتھ میرؔ کے لہجے میں دھیما پن اور ٹھہراؤ بھی نظر آتا ہے، اور اسی پست اور منفعل آواز میں وہ حیات وکائنات کے رعب وجلال اور للکار کا بھی مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ فراق کی میرؔ شناسی میں لہجے کی شناخت کا یہ تضاد شخصیت کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینے کے باعث پیدا ہوا ہے۔'' ۸۰

فراقؔ کے خیال میں میرؔ صرف قنوطی شاعر نہیں ہیں۔ ان کے اندر زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کی زبردست قوت ہے وہ ہر مشکل مرحلے میں ثابت قدم نظر آتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''میرؔ کی شاعری اپنی تمام گریہ وزاری کے باوجود حوصلہ شکن شاعری، بے حوصلگی کی شاعری، دنیا سے بیزاری کی شاعری،

کم ہمتی کی شاعری، مشتعل جذبات کی شاعری، بیمار تصورات کی
شاعری ہرگز نہیں ہے، یہ شاعری بامردی کی شاعری ہے۔ میرؔ کی
آواز میں ایک للکار چھپی ہوئی ہے۔ یہ ایک مردانہ وار آواز ہے، یہ
آواز ایک ایسے دلیر اور سورما کی آواز ہے جو ایک لٹتے اور مٹتے
ہوئے ہندوستان، ایک بھیانک دور سے گزرتے ہوئے ہندوستان
اور موت سے دوچار ہوتی ہوئی ایک زندگی کی آواز ہے۔ میرؔ کی
شاعری ہمیں موت نہیں دیتی ہے زندگی دیتی ہے۔ یہ شخص سر سے
پیر تک گھائل ہو کر بھی زندگی کی آبرو پر آنچ نہیں آنے دیتا" ۸۱

فراقؔ کے اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چاہے فراقؔ صرف شخصیت اور سوانح میں الجھ کر رہیں مگر ترقی پسندی کا اثر ان پر کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجنوں، علی سردار جعفری اور حسن عسکری کی طرح کلامِ میرؔ میں رجائیت کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ اپنے مضمون میں ''میرؔ کی شاعری کے کچھ پہلو'' میں وہ میرؔ کو اپنے وقت کا سب سے بڑا باشندۂ ہند قرار دیتے ہوئے بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ

''میرؔ کا غم حوصلہ شکن نہیں، میرؔ ہمیں رونا رلانا ہی نہیں
سکھاتے بلکہ سوچنا اور غور کرنا اور گہرے سے گہرے احساسات
حاصل کرنا بھی سکھاتے ہیں'' ان کے کلام میں ایسے اشعار بڑی
تعداد میں موجود ہیں جن کا موضوع دکھ درد یا رنج و غم نہیں ہے۔" ۸۲

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف تخلیقی اور تاثراتی تنقید کا ہی سہارا نہیں لیتے سماجی تنقید بھی ان کے یہاں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ لہٰذا نقدِ میرؔ میں ان کے مضامین کا ذکر ناگزیر ہے۔

شبیہہ الحسن ولادت ۲۰ ردسمبر ۱۹۲۸ء۔ وفات ۱۳ رمئی ۱۹۹۸ء

''میرؔ کے نہاں خانے'' شبیہہ الحسن نونہروی کا تحریر کردہ دلچسپ مضمون ہے یہ مضمون ان کی کتاب ''تنقید و تحلیل'' میں ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا شبیہہ الحسن نے میرؔ کے نہاں خانوں کو سمجھنے کے لیے ان کے معاشی و معاشرتی عوامل کے علاوہ ان کی زندگی میں ہونے

والے اہم سانحات کے مطالعہ کو ناگزیر قرار دیا ہے لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی شخصیت اور فن کو سانحوں اور مصائب کے پس منظر میں سمجھنا اک صحیح طریقہ کار ہوگا۔''۸۳

شبیہہ الحسن کے خیال میں میرؔ کی زندگی میں بنیادی اہمیت اس سانحے کو حاصل ہے جس کا ذکر انھوں نے واضح الفاظ میں کہیں نہیں کیا۔ مگر کہیں علامتی انداز میں تو کہیں ڈھکے چھپے انداز میں اس کا اشارہ ضرور کردیا ہے ۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اِک سانحہ سا ہوگیا

شبیہہ الحسن میرؔ کو سمجھنے کے لیے ان حالات کا مطالعہ ناگزیر قرار دیتے ہیں جن سے میرؔ گزرے اور جنھوں نے میرؔ کو شاعر بنایا۔ مثلاً میرؔ کے والد، ان کا میرؔ کو عشق کی تلقین کرنا، دہلی کی تباہی و بربادی، نادر شاہ احمد شاہ ابدالی کے حملے، آپس کی خانہ جنگیاں اور ساتھ ہی عشق کے راز کا افشاء ہونا۔ یہ سب ایسے حالات تھے جس نے میرؔ کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا اور وہ اپنے غموں کو شاعری میں ڈھالنے پر مجبور ہو گئے۔

شبیہہ الحسن نے لکھا ہے:

> ''اس درمیان میں میرؔ کے نجی معاملات نے جو انقلاب انگیز کروٹ بدلی تھی وہ دہلی کے انقلابات سے کسی طرح کم نہ تھی ان کا راز افشاء ہو چکا تھا اور ان کے نجی حالات نے وہ رخ اختیار کرلیا تھا جس میں دہلی کے انقلابات کی تصویر صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس قسم کے لمحات ہر فن کار کو نہیں نصیب ہوتے۔۔۔۔۔۔
> میر نے ان حالات سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے دل کے آئینہ میں دہلی اور دہلی کے آئینہ میں اپنے دل کی جھلکیاں محسوس کرلیں اور اس طرح میرؔ کے انفرادی حالات کی وجہ سے اس زمانہ کی مکمل تاریخ میرؔ کی شاعری میں ڈھل گئی۔''۸۴

شبیہہ الحسن پورے مضمون میں میرؔ کے عشق کی شدت اور دل کے لگاؤ کو ان کی

شاعری کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بغیر عشق کی تڑپ اور لگن کے ایسی شاعری کا وجود ممکن نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ میر نے براہ راست کہیں اپنے عشق کا خلاصہ نہیں کیا پھر میر کے والد کی عشق کی تلقین نے بھی اس سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔

ایک اہم بات شبیہ الحسن نے جس پر خصوصی توجہ کی ہے کہ میرؔ کے حالات ایسے تھے کہ انھیں یاس وقنوطیت کا شکار ہو جانا چاہئے تھا مگر یہی چیز ان کی عظمت کو بھی واضح کرتی ہے میرا پنے صبر وتحمل سے سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں اور مایوسی میں مبتلا نہیں ہوتے۔

میر کے ناساز گار حالات کے باوجود یاسیت کا شکار نہ ہونے کا سبب شبیہ الحسن نونہروی ان کی عشق میں ''کامیابی'' کو قرار دیتے ہیں۔

ان کے خیال میں زندگی میں مایوسی کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں زندگی میں ناکامی یا عشق میں ناکامی ''میرؔ کی زندگی ضرور کشمکش و پریشان حالی کا شکار رہی مگر جہاں تک عشق کا معاملہ ہے بقول شبیہ الحسن:

''میر کو ان کا مدعا حاصل ہو گیا تھا''۔

' محبوب سے نزدیکی نے ہی انھیں مایوسی کا شکار نہ ہونے دیا۔ شبیہ الحسن نے اس سلسلے میں دلیل کے طور پر اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

شبیہ الحسن میر اور ان کے محبوب میں ایک قسم کے نفسیاتی ربط کا ذکر کرتے ہیں اس قسم کی وابستگی کے سبب ہی بیداری کی حالت میں بھی میر محبوب کا ذکر آتے ہی اپنے دل کو تھام لیتے ہیں۔

شبیہ الحسن فنکار کے لیے تین خصوصیات اہم قرار دیتے ہیں یعنی وہ شاعر، عاشق، اور مجنوں ہو۔ مگر یہ انفرادی خصوصیات ہیں جو کسی ایک شخص میں یکجا نہیں ملتیں۔ میرؔ کی عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ شاعر، عاشق اور مجنوں سب کچھ تھے۔

> ''۔۔۔۔۔ ان کی عظمت کی گہرائی اور شدت کا راز بھی یہی ہے کہ فنکار کی وہ خصوصیتیں جو انفرادی طور پر شخصیتوں میں الگ الگ ملتی ہیں میرؔ کے یہاں سمٹ کر جمع ہو گئی تھیں۔۔۔۔۔۔
> میر کو میرؔ نہ تنہا ان کی شاعری نے بنایا اور نہ ان کے عشق وجنون نے

جب یہ تمام اوصاف مل گئے تو وہ محمد تقی سے میرؔ بنے ان کی عظمت
اسی بنا پر ہے کہ کسی اور شخصیت میں یہ تثلیث خوشگوار توحید میں نہیں
تبدیل ہو سکی۔''۸۵

اپنے مضمون میں شبیہہ الحسن نے بڑی خوبصورتی سے میرؔ کے نہاں خانوں سے پردے اٹھادیئے ہیں خاص طور سے ان کے عشقیہ معاملات کو لے کر جس تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور کلام سے مثالیں دی ہیں وہ ان کو نفسیاتی تنقید کے قریب لا دیتا ہے۔ شبیہہ الحسن نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ صرف عشق میر کے راز کے افشاء ہونے کا ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی کلام میر پر اس کے اثرات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ غرض کہ ان کا مضمون نقدِ میر میں نفسیاتی تنقید کے سلسلے کا پہلا قدم ہے اس لیے بے حد اہم ہے۔

سلیم اختر (۱۹۳۴ء)

سلیم اختر کا شمار عہدِ حاضر کے ممتاز ناقدین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے میرؔ پر کوئی باقاعدہ کتاب تو نہیں لکھی مگر ان کا مضمون ''میر تقی میر'' دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب'' میر پر نفسیاتی تنقید کی رو سے خاصا اہم ہے۔ سلیم اختر شاعر کی نفسیاتی وجنسی واردات کو سمجھنے کے لیے اس کی کلیات کا مطالعہ ناگزیر قرار دیتے ہیں اس لیے ان کے خیال میں میرؔ کا نفسیاتی مطالعہ بھی اسی وقت بخوبی کیا جا سکتا ہے جب ان کا پورا کلیات پیش نظر ہو۔ اس کے بعد ہی ہم میرؔ کو سمجھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ دوسروں کے انتخابات کو بنیاد بنا کر ہم میر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ لکھتے ہیں:

''میرؔ کی کلیات ایک غیر معمولی تخلیقی جینیس کی کیس
ہسٹری بھی ہے صرف جنون والے اشعار ہی منتخب کر لیں اور ان
کے ساتھ مثنوی ''خواب وخیال'' کو ملا لیں تو تمام جزئیات سمیت
میرؔ کے جنوں کی کیس ہسٹری مکمل ہو جائے گی اور تب کہیں جا کر
ایسے اشعار کے نفسیاتی معانی سمجھ میں آئیں گے۔''۸۶

سلیم اختر نے جس طرح سے میرؔ کے کلیات کو ایک غیر معمولی جینیس کی کیس

ہسٹری قرار دیا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے خاصا اہم ہے اور انھیں میرؔ کے نفسیاتی نقادوں کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔

ان کے خیال میں میرؔ کا کلیات ایک بحرِ بے کراں ہے جس کی شناوری آسان نہیں مگر غواصی پر بہت کچھ ملے گا۔ میر کے کلیات کا مطالعہ ہمیں ان کے جنون کی کیس ہسٹری کو سمجھنے میں مدد دے گا کیونکہ محض انتخابات تک محدود رہنے سے ہم میرؔ کے نفسیاتی معاملات سے بخوبی آگاہ نہیں ہو سکتے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> "میر کے بارے میں تو وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحلیل نفسی کے تصور کے عین مطابق تخلیق کار کی ابنارملٹی کی مکمل مثال کے طور اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تخلیق کے ترفع (Sublimation) سے ناآسودہ شخصیت کیسے آسودگی حاصل کرتی ہے، تصور میں اک جہاں سب سے الگ تشکیل کر کے کیتھارسس کیسے حاصل ہوتا ہے اور پھر کیسے تخلیق کو انائی تسکین کا ذریعہ بنایا جاتا ہے ان سب مباحث کا میرؔ کی شخصیت اور شاعری میں اس کے اظہار کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔"۸۷

ماہر نفسیات Arttherapy کی مدد سے نفسیاتی مریض کا علاج کرتے ہیں۔ جس کے تحت وہ مریض کو کسی ایسے تخلیقی عمل میں مصروف کرتے ہیں جس سے اس کی پریشانیوں کا ترفع ہو سکے۔ میرؔ بھی جنونی تھے اس زمانے میں انھیں کوئی ماہر نفسیات تو کیا ملا ہو گا مگر قدرتی طور پر ان کی ابنارملٹی نے تخلیق کے ترفع سے آسودگی حاصل کی ان کی بے چینیوں، تڑپ اور محرومیوں کو شاعری میں پناہ ملی۔ میرؔ نے جس طرح زندگی گزاری نہ جانے کتنی چیزوں سے محروم رہے ان سب کا ازالہ کہیں اور ممکن نہیں تھا اس لیے انھوں نے اپنے غموں کو شاعری میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "میر کی سادہ بیانی بسا اوقات تلخ اور ترش کو کیموفلاج کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔"۸۸

سلیم اختر نے میرؔ کی شخصیت کو کیٹس کے مماثل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک

ایسا شاعر جب اپنے اشعار میں موتی جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے شاید ''میر نے اپنی نفسی کیفیات کو نرم اور سادہ اسلوب سے کیموفلاج کیا ہے یا پھر وہ حالات سے فرار ہو کر اس اسلوب میں پناہ لیتے ہیں۔ سلیم اختر مزید لکھتے ہیں:

> میر کمزور اعصاب رکھنے والے قاری کا شاعر ہے اسی لیے میرؔ کی شاعری عملی انسان، غیر جذباتی مرد اور کامران فرد کے لیے نہیں میرؔ تو آبلہ کی طرح پھوٹ بہنے والے شخص سے گفتگو کرتا ہے اسی لیے میر سے درست لطف اندوزی کے لیے دردمند دل کی ضرورت ہے۔''۸۹؎

سلیم اختر کا مضمون نقدِ میرؔ میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ان سے قبل نفسیاتی نقطۂ نظر کے تحت میرؔ کی شاعری کا مطالعہ صرف شبیہہ الحسن نے کیا۔

ڈاکٹر خالد سہیل

ڈاکٹر خالد سہیل کا مضمون ''میرؔ کا فن اور پاگل پن'' خاصا اہم مضمون ہے یہ مضمون نفسیاتی نقطہ نظر سے کلام میر کے بہت سے ان چھوئے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ خالد سہیل نے میر کی دیوانگی کا دورِ حاضر کے علم نفسیات کی روشنی میں بہت خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ نفسیاتی تنقید کے ساتھ ہی ساتھ شاعر کے پاگل دیوانہ یا مجنون ہونے کا تصوّر ابھرا اور شاعر کی عظمت کا راز اس کی دیوانگی یا نیورانیت (Neurotic) کو قرار دیا گیا یوروپ اور امریکہ میں کئی شاعروں نے اپنی تحلیل نفسی کرائی تاکہ وہ اپنی بڑائی کے راز کو سمجھ سکیں یوں تو اردو شعراء بھی اپنے بارے میں کہتے رہے ہیں کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

یا بہت سے دوسرے شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ شعر گوئی پر ان کی قدرت شعوری نہیں ہے۔ ڈاکٹر خالد سہیل کا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے میڈیکل سائنس کے ذریعہ میرؔ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور اس بات کو جاننے کی کوشش کی ہے کہ کیا میرؔ کی عظمت

اور میر کا فن، ان کی دیوانگی یا ان کے پاگل پن میں پوشیدہ ہے۔ اپنے مضمون کی ابتدا میں ہی خالد سہیل نے سورین کرکیگارد Soren Kier Kegard کا قول نقل کیا ہے کہ:

"شاعر ایک ایسا دکھی انسان ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے داخلی کرب کا اظہار کرتا ہے تو اس کے غم شعر و نغمہ میں ڈھل جاتے ہیں۔"۹۰

میرؔ کو بھی وہ ایک ایسا ہی شاعر قرار دیتے ہیں جس کا داخلی کرب اس کے اشعار میں ڈھل کر ہمارے سامنے ہے۔ مثلاً میرؔ کا یہ شعر ؎

خوش ہیں دیوانگیِ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور میں وہ

میرؔ کا یہ دیوانہ پن یونہی نہیں تھا بلکہ اس کے ذمہ داران کے وہ حالات تھے جس نے ان کی ذات، شخصیت اور طرز زندگی میں شاعری اور دیوانگی کو یکجا کر دیا۔

مختلف مفکرین کے اقوال نقل کرتے ہوئے خالد سہیل سقراط کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری کے لیے مزاج کا موزوں ہونا اور دیوانگی میں مبتلا ہونا ضروری ہے۔ انیسویں صدی کے اطالوی ماہر نفسیات سیزر یرلومبروسا Cesere Lambrosa کا خیال ہے کہ "اعلیٰ تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے انسان مختلف ذہنی امراض کا شکار ہوتے ہیں" روبرٹ برٹن نے Roburt Burtin نے سترہویں صدی میں کہا تھا "All Poets are Mad" (سب شاعر دیوانے ہوتے ہیں)

خالد سہیل کے مطابق کسی بھی شخص کی زندگی میں فن اور پاگل پن کے پراسرار رشتے کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل نکات کو ذہن میں رکھنا چاہئے، اس کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والے۔

۱۔ موروثی اثرات
۲۔ خاندانی حالات
۳۔ نوجوانی کے تضادات
۴۔ اس دور کے معاشرتی انقلابات اور
شخصیت اور طرزِ زندگی کے شعوری اور لاشعوری محرکات۔

میر کی شاعری پر اظہار خیال کرنے سے قبل خالد سہیل ان کے بچپن سے لے کر جوانی، دہلی کے نامساعد حالات کا ذکر کرتے ہیں۔ میر کے بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ، چچا امان اللہ کی موت اور پھر ان کا عشق، اس کے علاوہ دہلی میں رہنے کے دوران بیرونی حملوں خانہ جنگیوں سے دلی کا اجاڑ اور ویران ہو جانا کیا نہیں ہے؟ جس کا سامنا میر نے نہیں کیا۔ آخر میر بھی ایک انسان تھے زندگی کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ ان کی مثنوی ''خواب وخیال میں ان کی دیوانگی کا خوب ذکر ملتا ہے۔

میر کے ان تمام حالات پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد ڈاکٹر خالد سہیل ان کا مرض یہ تشخیص کرتے ہیں کہ میر Psychotic Depression کا شکار تھے۔ ایسا مریض صحت یاب تو ہو جاتا ہے مگر اس کا یہ مرض کبھی اکھڑ سکتا ہے۔

Psychotic Depression کی علامات کا ذکر کرتے ہوئے خالد سہیل نے لکھا ہے کے میر کے یہاں اس بیماری کے آثار پوری زندگی موجود رہے۔ Psychotic Depression کی علامات مندرجہ ذیل ہیں۔

Hallucination میں مریض اپنی دیوانگی کی وجہ سے ایسے ہیولے اور آوازیں دیکھنے اور سننے لگتا ہے جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ میر کو چاند میں گھر کے در و دیوار اور صحن غرض ہر جگہ مختلف قسم کے ہیولے نظر آتے ہیں۔

اس مرض کی دوسری علامت خالد سہیل Thought Disorder بتاتے ہیں اس کے مریض کے خیالات و افکار بے ربط اور بے ترتیب ہو جاتے تھے۔ میر بھی جب اپنی بات مکمل طور سے نہیں کہہ پاتے تھے تو خود کو کوٹھری میں بند کر لیتے تھے۔

بقول خالد سہیل میر بہت سے توہمات کا شکار تھے جسے ہم Delusion کہتے ہیں۔ میر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دشمن انھیں نقصان پہنچائیں گے اسی لیے وہ دوسروں کو گالیاں دیتے اور پتھر مارتے تھے۔ میر اس قدر مایوس ہو جاتے تھے کہ لوگ انھیں کوٹھری میں بند کر دیتے تھے تا کہ وہ کسی کو یا خود کو نقصان نہ پہنچائیں۔

میر کو پاگل پن اور تصوف ورثہ میں ملا تھا چچا کا پاگل پن، والد کا انتقال، بھائی اور ماموں کی بے مروتی اور کسی حسینہ سے ان کا ناکام عشق، ان تمام حالات نے انھیں

Psychotic Depression کا شکار بنا دیا۔ میرؔ علاج کے بعد صحت یاب تو ہو گئے مگر خالد سہیل نے لکھا ہے۔

> ''میرؔ اپنی نگاہ میں تو پوری طرح صحت یاب ہو گئے لیکن ان کی شخصیت اور بقیہ طرزِ زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی بیماری نے ان کی شخصیت کو بری طرح متاثر کیے رکھا جس کی وجہ سے وہ عمر بھر نفسیاتی مسائل کا شکار رہے اور زندگی کے مختلف ادوار میں حالات ناسازگار ہونے کے ردعمل میں Depression کا بھی شکار ہوتے رہے۔''۹۱

میرؔ کے متعلق علی سردار جعفری نے بھی اپنے مضمون میں بہت پہلے اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ میرؔ کی دیوانگی ایک خوبصورت پرچھائیں کی طرح ان کی شاعری پر منڈلاتی رہی۔

مگر ادب میرؔ کے لیے دوا بن گیا شعر کہنے سے انھیں نفسیاتی طور پر بہت فائدہ ہوا، میرؔ جس احساس کمتری کا شکار تھے ان کی شاعری کی مقبولیت نے اسے احساس برتری میں بدل دیا۔

خالد سہیل نے لکھا ہے کہ

> ''ماہرین نفسیات ذہنی بیماروں کے علاج کے لیے Art therapy اپناتے ہیں جس میں دیوانگی کے شکار مریض شعر و نغمہ، رقص اور مصوری میں اپنے نفسیاتی مسائل کا اظہار کرتے ہیں''

میرؔ کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> ''میرؔ نے اپنی صحتیابی کے بعد اپنی بیماری کا حال نظم و نثر میں جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ اردو کے نفسیاتی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے''۹۲

دلّی کے خراب حالات کے سبب میرؔ نے لکھنؤ ہجرت کی مگر وہاں وہ دلی کو نہ بھول سکے اور اپنی ساری عمر وہ دلی کی زبان اور تہذیب و ثقافت کے نوسٹلجیا کا شکار رہے۔

خالد سہیل لکھتے ہیں کہ میرؔ کے ہم عصروں میں سوداؔ بھی تھے مگر وہ ہمیشہ حالات سے

سمجھوتہ کرتے رہے۔ میر ان سب حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مرض پسندی Morbidity کا شکار ہوئے۔ ان کے Abnormal دیوانہ ہونے کا سبب ورثے میں ملی دیوانگی بھی تھی۔ موجودہ دور میں ایسے انسان کو ماہر نفسیات Narcisitic Personality Disorder کا مریض قرار دیتے ہیں۔

خالد سہیل اپنے اس مضمون میں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ میر اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی مایوسی Depression کا شکار رہے، بیٹے، بیٹی اور اہلیہ کی موت نے انھیں اس قدر مایوس کر دیا کہ انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

مختصراً یہ کہ خالد سہیل نہ تو اُردو کے بہت بڑے نقاد ہیں اور نہ ہی انھوں نے میر پر کوئی با قاعدہ کتاب لکھی ہے مگر ان کا یہ مختصر مضمون ہی نقدِ میر میں ایک اہم اضافہ ہے۔ کیوں کہ ایک ماہر نفسیات ہونے کے سبب انھوں نے جس طرح میر کی شاعری کو ان کی نفسیات سے ہم آہنگ کیا ہے وہ نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ لائق ستائش ہے۔

رالف رسل (۲۱ رمئی ۱۹۱۸ء ۔ ۱۵ رستمبر ۲۰۰۸ء)

میر پر ایک اہم تنقیدی کام مغربی دنیا کے قارئین کے لیے پروفیسر رالف رسل اور پروفیسر خورشید الاسلام نے کیا۔ ان کی مشترکہ کاوش "Three Mughal Poets" تین مغل شعراء میر سودا، میر حسن کے نام ۱۹۶۸ء میں انگریزی میں شائع ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے جو اتنی محنت اور لگن کے ساتھ کیا گیا۔ بارہ برس تک دونوں حضرات نے مل کر ان شعراء کا مطالعہ کیا ان کے اشعار کی تشریح اور ترجمہ کا کام کیا اور ان کے کلام پر اظہار خیال کیا۔ کتاب کے دیباچے میں رالف رسل نے لکھا ہے کہ کتاب کے آخری تین ابواب صرف ان کے لکھے ہوئے ہیں اور اگر اس میں کوئی کوتاہی نظر آتی ہے تو اس کے وہ تنہا ذمہ دار ہیں۔

یہ تینوں ابواب میر سے متعلق ہیں۔ جن کے عنوانات ۔ میر کی عاشقانہ شاعری، میر اور عاشقانہ طرزِ زندگی؟ اور میر انسان اور ان کا عہد۔ یہ تینوں ابواب میر کی زندگی کے ان نقوش پر منحصر ہیں جنھیں رالف رسل نے میر کی شاعری میں پایا۔ چونکہ یہ کتاب بنیادی طور پر غیر اردو داں طبقے کے لیے لکھی گئی اس لیے میر پر لکھے جانے والے عام مضامین سے اس کی

نوعیت مختلف ہے۔ رالف رسل نے میرؔ کے مختلف اشعار کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ تا کہ وہ میرؔ کی شاعری کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کی سند فراہم کر سکیں لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے لکھی گئی جو اردو اور اردو تہذیب سے واقفیت نہیں رکھتے اس لیے اس میں زیادہ کوشش اسی کی ملتی ہے کہ پڑھنے والا میرؔ کو Appreciate کر سکے اور سمجھ سکے۔ یوں بھی مغربی تنقید میں اردو کی طرح ''لفاظی'' نہیں ہوتی ہے اس لیے صاف ستھرے انداز میں میرؔ کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ بہت اچھی کوشش ہے۔

رالف رسل نے لکھا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ لکھنا سب سے مشکل کام تھا کیونکہ میر ان تین شاعروں میں افضل ہے اور ہمارے خیال میں دنیا کے عظیم عاشقانہ شاعروں میں ایک ہے۔ ہم نے اپنے قاری کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن یہ کام بڑا مشکل تھا۔

میر کا کلام زیادہ تر غزلوں پر منحصر ہے اور اس کے پیچھے بہت سی روایات اور رسم و رواج کا سلسلہ ہے پہلے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بعد اشعار کا ترجمہ دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

میرؔ کی عاشقانہ شاعری میں رالف رسل نے مثنوی شعلہ عشق، خواب و خیال اور غزلوں کے حوالے سے میرؔ کے عشق کی داستان کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میر کی محبت کی داستان المیہ ہے۔ میر اپنے محبوب کے ساتھ نہیں رہ پائے لہٰذا ان کی شاعری میں ان کے ناکام عشق کی داستانیں بخوبی موجود ہیں۔

اس کتاب کا باب پنجم میرؔ اور عاشق کی طرز زندگی ہے۔ اس باب میں رالف رسل نے عشق مجازی اور عشق حقیقی کا فرق واضح کرتے ہوئے کلام میرؔ سے عشق حقیقی کی خوب مثالیں دی ہیں۔

میر اور ان کا عہد عنوان کے تحت رالف رسل نے ان تمام حالات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جن سے میرؔ گزرے، والد کی موت بھائیوں کی بدسلوکی، ان کا دلی جانا وہاں سے روزینہ مقرر ہونا، دلّی کا اجڑنا، احمد شاہ ابدالی کے حملے اور پھر تنگ آ کر میر کا لکھنؤ ہجرت کرنا۔ وہاں آصف الدولہ سے ان کی ملاقات و اختلافات وغیرہ سب پر رالف رسل نے مفصل روشنی ڈالی ہے تا کہ ان کا قاری ان تمام حالات سے واقف ہو کر میرؔ کو سمجھ سکے۔

اگر ہم رالف رسل کی اس کاوش کو ایک خصوصی کام قرار دیں تو بجا ہے کیونکہ وہ پہلے ایسے نقاد ہیں جنھوں نے میرؔ کی شاعری کو باقاعدہ طور پر نہ صرف انگریزی کے قاری کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کے لیے پڑھنے کا ذریعہ بنا دیا۔

پروفیسر محمد عمر

پروفیسر محمد عمر کی کتاب ''اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میرؔ کا عہد'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی کتاب کا موضوع ہی اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ اس تصنیف میں کلام میر پر ان کے عہد کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا ہے کتاب کے پہلے صفحہ پر عنوان کے بعد کی تحریر خصوصی طور پر قابلِ توجہ ہے۔

> ''یعنی اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی سماج کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور ادبی تاریخ جس میں خصوصی طور پر میر تقی میر دہلوی کی حیات اور شاعری کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔''۹۳

محمد عمر کو ہم باقاعدہ ترقی پسند نقاد تو قرار نہیں دے سکتے مگر ان کی کتاب میں جس طرح سے میرؔ کو ان کے عہد کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش گئی ہے اس کے پیش نظر انھیں اسی عنوان کے ذیل میں رکھ کر دیکھا گیا ہے۔ محمد عمر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی میں تاریخ کے استاد تھے۔ انھوں نے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی زیر نگرانی ''ہندوستان کی اٹھارہویں صدی کی معاشرت'' پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں نثار احمد فاروقی کی فرمائش پر دِلّی کالج میگزین کے میرؔ نمبر کے لیے انھوں نے ایک مضمون لکھا۔ طوالت کے سبب مضمون ''میرؔ نمبر'' میں تو نہیں شامل ہو سکا بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ جس کا عنوان ''اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔ میر کا عہد'' رکھا گیا۔ محمد عمر نے لکھا ہے:

> ''میں نے میر کے کلام اور دوسری تصانیف کی بنیاد پر ایک مقالہ ''اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت میرؔ کا عہد'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے اور اس میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس دور کے سیاسی حوادث، سماجی اور تہذیبی رجحانات کا ایک ایسا

مرقع پیش کردیا جائے جس سے میرؔ کی شخصیت اوران کے ذہن کی
نشونما، نیز ان کے فن کی داخلی فضا کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔''۹۴

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے محمد عمر نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے حصہ اوّل اس دور سے متعلق ہے جو میر نے دہلی میں گزارا تھا یعنی ۱۷۳۹ء سے ۸۲۔۱۷۸۱ء تک۔ اسی دوران نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور حالات کی ناسازگاری نے میرؔ کو ترک وطن پر مجبور کیا اور وہ دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔

حصّہ اوّل اور دوم دونوں کو چار چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل میں سیاسی حالات، اندرونی خلفشار، سکھوں کی خانہ جنگیاں اور اس دور میں میر کے حالات پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ باب دوم میں اقتصادی حالات کے تحت، سپاہ کی تنگ دستی، بے روزگاری، سلاطین اور شاہی خاندان کی حالت، نیز میرؔ کے حالات کو بیان کیا گیا ہے جو اس لیے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں میرؔ کے عہد کے سماجی، مذہبی اور اخلاقی حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی عہد کے رسم و رواج، عورتوں اور مردوں کے لباس، زیورات، سامانِ آرائش و زیبائش، ماکولات و مشروبات، جشن و تہوار و تقریبات، عرس اور میلے، کھیل تماشے، مدرسے، مشاعرے، تصوف، مذہب، عرس اور میلے اور پھر زمانے کی توہم پرستی کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور کلام میرؔ سے اس کے لیے مثالیں دی گئی ہیں۔

دوسرا حصّہ ۱۷۸۱ء سے ۱۸۱۰ء پر مشتمل ہے یہ حصّہ میرؔ کے لکھنؤ میں داخل ہونے کا ہے اور حصّہ اوّل کی طرح اس حصّہ، لکھنؤ میں شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانے کے معاشی، سیاسی، اور سماجی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصّے کا ساتواں اور آٹھواں باب اودھ کے معاشرہ کی زندگی، تہذیب و تمدن و رسم رواج، ہندو مسلم تہوار و تقریبات، کھیل، تفریح اور مذہب و اخلاق کے تنقیدی جائزے کے لیے مخصوص ہے۔ نویں باب میں لکھنؤ میں میرؔ کے آخری دور اور وفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر سب سے اہم نکتہ جس کی طرف محمد عمر ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں وہ یہ کہ

''یہ مقالہ میر کی شخصیت، فن اور ان کے عہد کے پس منظر
کے طور پر لکھا جا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن امید یہی ہے کہ اس سے

بڑی حد تک اس سماج کی تصویر سامنے آجائے گی جس میں میر نے
زندگی گزاری اور جس میں ان کا فن جاوداں بن گیا۔''۹۵

کوئی بھی بڑا شاعر یا مصنف اپنے ماحول اپنی تہذیب اپنے دور کی معاشی صورت حال اور اپنے سماج سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا۔ شاعر ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس سماج میں رہتا ہے اس سے اس کی روح جڑی ہوتی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس کے کلام میں/تخلیقات میں روح عصر پیدا نہیں ہو سکتی۔ محمد عمر لکھتے ہیں:

''میر نے اپنی غزلوں میں جا بجا دل اور دلّی کے مرثیے
کہے ہیں۔ یہاں دل ان کی شخصیت کی داخلی فضا کا استعارہ
(Symbol) ہے اور دلّی گویا اٹھارہویں صدی کے اس تہذیبی
ماحول کی علامت ہے جس نے ہندوستان کے حکمراں مسلمانوں کا
ایک خاص ہند ایرانی مزاج بنایا تھا اور ایک ایسی تہذیب وضع کی تھی
جو اپنی گوناں گوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول و معروف رہی
میر نے دلّی کے سیاسی زوال ہی کا ماتم نہیں کیا اس کی تہذیب، اس
کے باشندے اس کی زبان یہ سب انھیں عزیز تھیں۔''۹۶

محمد عمر نے میر کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی کے کرب کے ساتھ دلّی کے حالات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

میر کے دل اور دلّی کے مرثیے نہ صرف اس دور میں اہم تھے بلکہ آج بھی جب ہم اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے بیٹھتے ہیں تو میر کے اشعار ضرور یاد آتے ہیں کسی عہد کو اس خوبی سے اپنے کلام میں سمو دینا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں تک دل کے مرثیوں کا سوال ہے تو اپنی داخلی کیفیات کو پیش کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ کسی مخصوص دور کے لوگوں کے دلی جذبات و کیفیات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تصویر کشی کرنا۔ اسی لیے آج تک میر کا کلام ہم سب کے دلوں میں زندہ ہے۔ محمد عمر لکھتے ہیں۔:

''یہاں میر کے سماجی ماحول کو سمجھنے کے لیے دہلی کے رسم
ورواج، میلے ٹھیلے، لباس و زیورات، محلات، مدرسوں خانقاہوں

بازاروں، ادبی مجلسوں کا ایک اجمالی بیان کیا جائے گا جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس معاشرے کی ترکیب کن اجزاء سے ہوئی تھی جس میں میرؔ نے آنکھ کھولی اور جہاں ان کے ذہن نے ابتدائی اثرات قبول کیے۔ ان کی شخصیت کا سانچا بنا اور ان کی فکر کو خام مواد حاصل ہوا۔ اس ماحول کا عکس یا تلمیحات ان کے کلام میں بھی بکثرت دستیاب ہوتی ہیں، اس طرح یہ تہذیبی مطالعہ ان کی شاعری اور شخصیت کے مرقع کا Frame کہا جاسکتا ہے۔ ۹۷

اس اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمد عمر اس پورے عہد و ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے کلام میرؔ کی بنیادوں کو ہمارے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ اس عہد کی روایات و اقدار، معاشرہ، کس حد تک کلام میرؔ کا ماخذ ہے محمد عمر نے تفصیل سے ان اسباب کا جائزہ لیا ہے چنانچہ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ”ان کی یہ کتاب میرؔ کی شاعری اور شخصیت کے مرقع کا فریم ہے تو بجا ہے“۔

محمد عمر بھلے ہی اُردو ادب کا مشہور و معروف نام نہ ہو مگر انھوں نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں جس طرح عہد میرؔ کو میرؔ کی شاعری و شخصیت کے حوالے سے زندہ کیا ہے وہ مصنف کا نہ صرف ایک اہم کارنامہ ہے بلکہ انھوں نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ نقدِ میرؔ کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہے۔ اس لیے محمد عمر کی یہ کاوش میرؔ تنقید میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

حامدی کاشمیری (۱۹۳۲ء)

حامدی کاشمیری کی کتاب ”کارگہہ شیشہ گری“ مارچ ۱۹۸۲ میں شائع ہوئی اور میرؔ پر کیا گیا انتخاب (انتخاب غزلیاتِ میرؔ) جنوری مارچ ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا حامدی کاشمیری نے ”انتخاب غزلیات“ میرؔ کے مقدمے میں لکھا ہے:

”اس انتخاب کی رو سے بلاشبہ میرؔ ایک مستند اور قد آور شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں یہ گویا میرؔ کی دریافتِ نو ہے۔ میرؔ کی دریافتِ نو کے بہجت خیز احساس کے تحت میں نے ان کے تخلیقی شعور کی تفہیم و تحسین کے کام کو ہاتھ میں لیا اور ”کارگہہ شیشہ گری“ لکھ دی،

جو کافی پہلے منظر عام پر آ چکی ہے یہ کتاب پیش نظر رکھتے ہوئے
جہاں میں نے عالمی معائر نقد کو پیش نظر رکھا ہے، وہاں میرؔ کے منتخبہ
کلام سے نمود کرنے والے تنقید کے نظام اقدار کی شناخت کرنے کی
سعی کی ہے اور اس سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا ہے اس طرح
سے میرؔ کے مطالعے کا ایک نیا تناظر ہاتھ آ گیا ہے۔"۹۸

کارگہہ شیشہ گری کا عنوان میرؔ کے مشہور و معروف شعر سے مستعار ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کے عنوانات بھی میرؔ کے مختلف اشعار سے اخذ کیے گئے ہیں۔ دریائے سخن، عالم دیگر، اقسام جواہر، ابر تر، پر مشتمل یہ کتاب تنقید میرؔ کے سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے۔ حامدی کاشمیری نے اس کے پہلے باب میں لکھا ہے۔

"پس میں نے میرؔ کی آفاقی حیثیت کے پیش نظر، تنقید
کے عالمی اصولوں سے استفادہ ضرور کیا ہے، لیکن میری توجہ
بنیادی طور پر اس بات پر مرکوز رہی ہے کہ کلام میرؔ کی جداگانہ
اور خود مختارانہ حیثیت کو مدِ نظر رکھا جائے اور اس میں نمود کرنے
والے تنقید کے نظام اقدار کی روشنی میں ان کے تخلیقی ذہن کا
محاکمہ کیا جائے۔"۹۹

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات میں حامدی کاشمیری نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے میرؔ کے کلام اور ان کے تخلیقی عمل کا محاکمہ کیا ہے کارگہہ شیشہ گری کی ابتداء ہی میں حامدی کاشمیری نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ انھوں نے اپنے مطالعہ کی بنیاد میرؔ کی نجی زندگی یا ان کے عہد کے معاشرتی، سیاسی یا تاریخی حالات کو نہیں بنایا۔ یہ ان کے دائرہ کار سے خارج ہے۔ ان کے خیال میں اصل اور بنیادی اہمیت شاعر کے تخیلی وجود کی ہے جو ایک آزاد قوت کے طور پر کام کرتا ہے اس کے نجی یا خاندانی حالات کی حیثیت ثانوی ہے۔ مختلف تنقیدی رویوں کے متعلق ان کی رائے ہے۔

"-------- الغرض مختلف تنقیدی نظریے جن میں
سماجی، نفسیاتی، سوانحی، فلسفیانہ اقداری، ہیئتی اور اسلوبیاتی نظریے

خاص طور سے معروف اور مروج ہیں اپنی حد بندیوں اور کوتاہیوں کی بنا پر صرف ناکافی اور غیر تسلی بخش ہی نہیں بلکہ بعض حالتوں میں غیر ادبی بھی بن کر رہ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری کی تفہیم و تحسین کے ضمن میں دور تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔''۱۰۰؎

تمام تنقیدی رویوں کو غیر تسلی بخش قرار دینے کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کے تمام خیالات کا مفہوم یہ نہیں نکالنا چاہئے کہ وہ موجودہ تمام تنقیدی تصورات کی افادیت کے منکر ہیں۔ ان کے خیال میں یہ تمام تصورات کہیں نہ کہیں ادب کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں مگر تنقید میر کے متعلق اپنائے گئے ان تمام رویوں سے وہ مطمئن نظر نہیں آتے اسی لیے لکھتے ہیں:

''------ میر کی اصلی تخلیقی حیثیت ابھی تک جامعیت کے ساتھ سامنے نہیں آسکی ہے اس کے دو اسباب ہیں اوّل میرؔ کے بارے میں کوئی ایسا تنقیدی معیار قائم نہیں ہوسکا جو جدید، جامع اور تجزیاتی ہو اور جس کا مقصد میرؔ کی شعری لسانیت کے تجزیاتی عمل کے توسط سے ان کے تخیلی تجربات تک رسائی حاصل کرنا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین اہم ضرور ہیں، مگر یہ یا اس نوع کے چند مضامین کائناتِ میرؔ کی وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ دوم، میر کے بارے میں تنقیدیں لکھی گئی ہیں، وہ نظریاتی حد بندیوں اور طریق کار کی داخلی اور شخصی (---؟---) کی پابند ہونے کی بنا پر میرؔ فہمی کا کوئی جامع اور معروضی معیار پیش نہیں کرتیں۔''۱۰۱؎

حامدی کاشمیری اردو کے ایک اہم شاعر، افسانہ نگار اور ناقد ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ میرؔ پر جو تنقیدیں لکھی گئیں وہ ''میرؔ فہمی کا کوئی جامع اور معروضی معیار پیش نہیں کرتیں'' محلِ نظر ہے، میرؔ پر حامدی کاشمیری سے پہلے جو کچھ بھی لکھا گیا اسے یہ کہہ کر کہ ''جامع اور معروضی معیار'' پر پورا نہیں اترتا، یک قلم رد کر دینا تنقیدی بصیرت اور ادبی دیانت داری دونوں کے خلاف ہے۔ ہر عہد اور ہر ناقد کا نقطۂ نظر مختلف ہوسکتا ہے۔ لیکن اسے غیر معیاری قرار دینا مناسب نہیں شاید وہ

اپنے ''اکتشافی تنقید'' کے نقطۂ نظر پر زور دینے کے لیے دوسروں کی رایوں کو غیر معروضی قرار دیتے ہیں۔اسی لیے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''تنقید کا کام جیسا کہ ذکر ہوا شعری لسانیات کے وسیلے سے تخیلی دنیا کی سایہ گو فضاؤں میں ساعقہ پوش وقوعات کی شناخت کرنا ہے، اور قاری کو ان کی ندرت، معنویت اور جمالیاتی تاثیر کا احساس دلانا ہے۔یعنی تنقید کو ایک اکتشافی کردار انجام دینا ہے۔۔۔۔۔میرؔ کے زیر نظر مطالعے کے ضمن میں، میں نے تنقید کے اس رول کی کلی حیثیت کی ضرورت اور اس کی افادیت اور معنویت کو پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے محسوس کیا ہے اور اسے بھر پور انداز سے روا رکھنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔چنانچہ میں نے میرؔ کی شاعری میں پنہاں تخیلی کائنات میں حیاتی اور علامتی پیکروں میں کسمساتے ہوئے نادر الوجود اور حیرت انگیز وقوعات کی شناخت کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر ان کی تخلیقیت کے محرکات کی چھان بین اور ان کے نتائج کی وقعت اور اپنے ذہن کے لیے ان کی معنویت کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔'' ۱۰۲

اس اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اکتشافی تنقید کی جامعیت اور معروضیت پر زور دینا چاہتے ہیں۔حامدی کاشمیری سارا زور اس پر صرف کرتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری کی ایک تخیلی دُنیا ہے اور اس تخیلی دُنیا میں جو حیاتی اور علامتی پیکر ہیں ان کی تلاش کی جانی چاہیے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کے سبب یہ تخیلی پیکر وجود میں آئے۔لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔۔۔وہ (میرؔ) اپنے عہد کا گہرا اور مکاشفانہ شعور رکھتے ہیں اپنے کمرے کی پائیں باغ کی کھڑکی بند رکھنے کے باوجود وہ اپنے عہد کے آشوب کا چشم نگراں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے دانشورانہ ذہن اور گہری تاثیر پذیری کا ثبوت دیتے ہیں تاہم وہ اپنے عہد کے حالات ہی کے اسیر ہو کر

نہیں رہ جاتے۔ وہ معاصرت کی حد بندیوں سے ماوراہو کر ایک کائناتی آگہی پیدا کرتے ہیں۔ اس سے ان کی شاعری میں ان کے عہد میں سانس لیتے ہوئے انسان کے دکھ کا اظہار ہی نہیں ملتا، بلکہ انسانی تاریخی کے تناظر میں وسیع تر انسانی المیے کا ادراک بھی ہوتا ہے اور یہ ادراک زمان و مکان کی پابندیوں کی نفی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کا المیہ ہے جو پیدائش، حیات زوال، مرگ، درد اور تقدیر کی اندھی جبریت کے سامنے نقش فریادی بن جاتا ہے میرؔ کی عظمت کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ زندگی اور کائنات کا ایک علامتی شعور رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت یک سطحی نہیں بلکہ پہلودار اور پیچیدہ ہے۔'' [۱۰۳]

حامدی کاشمیری اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ میرؔ کی شعری شخصیت کے بہت سے پہلوان کی زندگی سے مماثلت ضرور رکھتے ہوں گے مگر وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ اصل میں ان کی شعری شخصیت تمام تر تخیلی دُنیا کی پیدا کردہ ہے اور وہ خارجی دُنیا کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے۔ ان کے خیال میں میرؔ کے لیے داخلی دُنیا ہی سب کچھ تھی خود میرؔ تخلیق کو ایک لاشعوری عمل قرار دیتے ہیں وہ خارجی حد بندیوں کی نفی کرتے داخلی شخصیت سے ''اقسام جواہر'' [۱۰۴] نکالتے ہیں۔

میرؔ کی زبان کے سلسلے میں حامدی کاشمیری نے لکھا ہے کہ میرؔ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اُردو زبان کو روزمرہ کی عامیانہ سطح سے کیسے بلند کریں؟ میرؔ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زبان کو شعری ضروریات کے لیے استعمال کیا۔ ان کی زبان خود کی کی خلق کردہ ہے۔ یہ فارسی سے مستعار نہیں لی گئی۔ بلکہ میرؔ کی روایت، نرمی، لچک، سادگی اور مٹھاس کی وجہ سے ہندوستانیت سے اس کا رشتہ مضبوطی سے جڑا ہوا ہے۔ میرؔ فارسی کے دلدادہ ضرور ہیں مگر اس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ وہ اصلی اور فطری الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کی زبان وقیع ہے، بازاری نہیں ہے۔ ان کے منتخب اشعار میں زبان کی سادگی کے باوجود اس کا تقلیبی کردار نمایاں ہے۔ جس سے معنی

میں تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔

حامدی کاشمیری دو چیزوں پر زور دیتے ہیں، اوّل میرؔ کی پیکر نگاری اور ان کی تخیلی دنیا کے ''نقش و نگار'' یا اقسام جواہر'' جو وہ اپنے سینے کے دفینے سے نکال کر پیش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر ایک ایسے شاعر ہیں جن کی حسّیت (Sensibility) تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور یقیناً یہ میر کی عظمت کی علامت ہے لیکن حامدی کاشمیری کا یہ کہنا کہ میرؔ کی شاعری کا خارجی اثرات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے لیے میرؔ سے منسوب اس کہانی کو پیش کرنا کہ ان کے کمرے کی پائیں باغ کی کھڑکی بند رہتی تھی اس لیے متاثر نہیں کرتی کہ میرؔ کے یہاں شروع سے آخر تک جتنا ان کے احساس اور ان کی ذات کا اثر نمایاں ہے اتنا ہی ان کا عہد، اس زمانے کے سیاسی، تاریخی حالات، سیاسی طوائف الملوکی، معاشی کسمپرسی، اور سماجی وتہذیبی حالات نمایاں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک زاویہ سے میرؔ کا مکمل مطالعہ نہیں ہوسکتا۔ ''میرؔ کے کلام میں ان کا عہد سانس لیتا ہوا نہیں بلکہ چیختا ہوا نظر آتا ہے'' حامدی کاشمیری نے لکھا ہے کہ میر نے اُردو زبان کو روزمرہ کی عامیانہ سطح سے بلند کیا۔ میر کے عہد کی شیریں زبان کو روزمرہ کی عامیانہ سطح کی زبان نہیں قرار دیا جاسکتا۔ میر کے عہد کے دوسرے شعراء سودا، خواجہ میر درد اور یقین ہر ایک کے یہاں زبان کا اعلیٰ شعور موجود ہے۔ دوسری بات روزمرہ کو عامیانہ قرار دینا بھی درست نہیں۔ میر انیس نے لکھا ہے ''روزمرہ شرفا کا ہو اسلاست ہو وہی'' اگر روزمرہ، عامیانہ زبان ہوتی تو میر انیس روزمرہ کی اہمیت کا اظہار نہ کرتے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے میرؔ کی زبان پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا کہ:

''میر نے روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنادیا''۔ ۱۰۵

اس طرح میر کے یہاں وہ جرأت ہے کہ وہ جس طرح کے الفاظ کو خواہ وہ غیر فصیح کیوں نہ ہوں استعمال کرنے میں نہیں جھجکتے۔ اور اُن کے کلام میں استعمال ہو کر وہ فصیح بن جاتے ہیں۔ حامدی کاشمیری کی زبان بیشتر جگہوں پر مغلق اور مبہم ہوگئی ہے جس سے اکثر مفہوم الجھ جاتا ہے۔ اس کے باوجود کارگہہ شیشہ گری میر کو نئے تناظر میں سمجھنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔

جمیل جالبی (۱۹۲۹ء)

ڈاکٹر جمیل جالبی دورِ حاضر میں اُردو کے مستند اور مشہور محقق و نقاد ہیں۔ ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے۔ اُردو کے علاوہ انگریزی اور سندھی میں بھی ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ نقدِ میرؔ کے سلسلے میں بھی جمیل جالبی کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی کتاب ''محمد تقی میرؔ'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی یہ دراصل جمیل جالبی کے ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ''بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی برسی کے موقع پر دیے۔ یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ حصّہ اوّل میرؔ کی زندگی کے حالات سیرت اور شخصیت پر مشتمل ہے۔ اس حصّہ میں میرؔ کی تصانیف اور ان کے دواوین کے زمانہ ترتیب کا بھی تعین کیا گیا ہے۔ دوسرے حصّے میں میر کی شاعری کا جائزہ جدید تنقیدی شعور کے ساتھ لیا گیا ہے ساتھ ہی عالمی شعراء سے موازنہ کرتے ہوئے عالمی ادب میں بھی میرؔ کی شاعری کے مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی نے خود لکھا ہے:

> ''ان لیکچروں میں میں نے ''نئے میرؔ'' کو اپنی نسل اور اپنے دور کے لیے دریافت کیا ہے۔''[۱۰۶]

جمیل جالبی میرؔ کی شاعری کی ایک ایسی اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا تعلق ہم سب کی زندگی سے ہے اور وہ ہے ''تزکیہ غم'' ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کی زندگی غموں اور خوشیوں کی آماجگاہ نہ ہو۔ میر کے کلام کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر نسل کو اپنے احساسات و جذبات کی دُنیا جلوہ گر نظر آتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر نسل اپنی ضرورتوں اور اپنے خیالات کے اعتبار سے کلامِ میر سے نئے نئے معنی اخذ کرتی ہے جس کے نتیجے میں معنی کی بہت سی سطحیں سامنے آتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ کسی بھی شعر کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اگر آج کے قاری کو وہ پست نظر آتا ہے تو آئندہ زمانے کے قاری کو بھی ایسا ہی لگے۔ ممکن ہے وہ اس میں بہت سے نئے مفاہیم و معنی تلاش کرلے۔ میرؔ کی شاعری کی دلآویزی اور انفرادیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> ''میر کا یہی کمال ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی زندگی کی عام سطح پر عام جذبوں سے ملا کر دیکھتے ہیں۔ میرؔ کے

لیے اپنی ذات بہت اہمیت رکھتی ہے لیکن جب وہ اپنی تنہائیوں کو بیان کرتے ہیں تو اسے ذہنی سطح کے بجائے زندگی سے ملا کر اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ میرؔ کی تنہائی ہم سب کی تنہائی بن جاتی ہے۔ ان کے درد و غم سب کے درد و غم بن جاتے ہیں۔ اور ہمارے اندر بھی وہی تخلیقی عمل ہونے لگتا ہے، جس کا میرؔ نے تجزیہ کیا تھا۔ ان کا تخلیقی عمل اور اس کی انفرادیت زندگی کی ایسی عام سطح پر جنم لیتی ہے جہاں شاعر اور عام انسان کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔"۱۰۷

بقول جمیل جالبی میرؔ کی شاعری کا محور عشق ہے اور یہ عشق افلاطونی عشق نہیں ہے بلکہ ایک عام انسان کی محبت ہے، جس میں التجا، پیار، شکوے شکایات، ہجر اور ناکامی سبھی کچھ شامل ہے۔ عاشق میرؔ ہمارے سماج کا ایک فرد ہے جو محبوب کے لیے تڑپتا بھی ہے، ضبط بھی کرتا ہے اور انسانی رشتوں کا لحاظ بھی رکھتا ہے۔ جمیل جالبی نے لکھا ہے:

"میرؔ کے عشق میں انسانی رشتوں کا احساس بہت واضح رہتا ہے میرؔ انسان اور انسانی رشتوں کے شاعر ہیں۔"۱۰۸

آبِ حیات اور مولوی عبدالحق کے قائم کردہ مفروضات نے میرؔ کو قنوطی شاعر قرار دیا، بعد میں ترقی پسندوں نے میرؔ کی شاعری میں رجائی عناصر کی نشاندہی کی۔ جمیل جالبی میرؔ کے غم کو انسانی زندگی کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں میرؔ کی شاعری صرف اُن کے ذاتی غموں کی عکاس نہیں بلکہ اس میں ان کے عہد کا انتشار اور بے چینی بھی شامل ہے۔ میرؔ کے اشعار اپنے اندر ٹریجڈی کا سا اثر رکھتے ہیں۔ اُن کے اشعار پڑھ کر ہم غمزدہ یا اُداس نہیں ہوتے بلکہ ہمیں اپنے غموں کا مداوا ان اشعار میں نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ ایسا الم ہے جس میں نشاط کا سا مزا ہے اور ایسا نشاط ہے جس میں الم کا سا مزا ہے۔ میرؔ اپنے لہجے سے غم و الم کو، غم و الم نہیں رہنے دیتے بلکہ کچھ اور بنا دیتے ہیں جس کا اثر، شکستگی اور پسپائیت کا نہیں بلکہ مثبت ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ میرؔ کے غم میں تلخی،

> بیزاری، زہر بھری یاسیت، صبر، تسلیم و رضا اور جہاں بینی کا احساس ہوتا ہے۔ میرؔ کا غم مثبت اور حیات افروز ہے وہ یاسیت کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری زندگی کے غموں میں ایسا ساتھی ہے جو ہم میں نیا اعتماد بحال کر کے ایک ایسا حوصلہ دیتا ہے کہ ہم زندگی سے پیار کرنے لگتے ہیں۔''۱۰۹

جمیل جالبی کے خیال میں میرؔ کا غم ہمیں اعتماد بخشتا ہے، ہمیں زندگی کے نزدیک لاتا ہے۔ ان کے کلام میں زندگی اپنے ہر رنگ میں نظر آتی ہے۔ جمیل جالبی میرؔ کو قنوطی شاعر قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک میر نے انسانی زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے لہٰذا انھیں صرف غم والم کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ وہ زندگی کی پریشانیوں سے فرار کا درس نہیں دیتے بلکہ زندگی کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا ہمت و حوصلہ سے سامنا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں میرؔ کی نظر میں زندگی میں غم و خوشی اتنی اہمیت نہیں رکھتے ہیں جتنی یہ بات کہ انسان اپنے حوصلے اور جد و جہد سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جس سے کہ وہ دُنیا میں یاد رکھا جائے۔ اس طرح وہ موت کو شکست دے سکتا ہے۔

میرؔ نے ہمیشہ انسانی عظمت کے گیت گائے ان کا انسان خدا بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ایسا خدا جس میں انسانی صفات موجود ہوں میرؔ کا انسان اسی لیے فرشتے سے ارفع ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کا انسان روسو کا ''انسان'' نہیں بلکہ حسن عسکری کا وہ آدمی ہے جس میں مختلف قوتوں اور میلانات کے درمیان ایک توازن موجود ہے۔''۱۱۰

جمیل جالبی نے نہ صرف میرؔ کی شاعری میں انسان کی عظمت، انسانی رشتوں اور اس کی اہم خصوصیات کا، بلکہ ان اہم علامتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ میر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

جمیل جالبی بعض دوسرے ناقدین کی طرح میرؔ کی شاعری میں استعمال ہونے والی دو علامتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں، ایک دل اور دوسرے دلی، وہ ان علامتوں میں

۱۸ویں صدی کا آہنگ دیکھتے ہیں اور اسے اس دور کی روح کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔

سب سے پہلے میرؔ کی شاعری کو ان کے عہد کا ترجمان ترقی پسندوں نے ٹھہرایا بعد میں یہ اثر کافی دور تک پہنچا اور اس کا عکس جمیل جالبی کے یہاں بھی نظر آتا ہے کہ وہ نہ صرف میرؔ کی شاعری کو اس عہد کا ترجمان قرار دیتے ہیں بلکہ اسی لیکچر میں ایک جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میر بھلے ہی انا پرست رہے ہوں چاہے جتنے مغرور بد دماغ رہے ہوں مگر انھوں نے کبھی اپنی ذات کو اجتماعیت سے الگ نہیں کیا۔ بلکہ اس میں پورے معاشرے کو شریک کر کے اپنے تجربے کو بیان کیا ہے۔ ''میر نے ''میں سے ہم'' تک کا سفر ایک طویل تجربے کے ذریعہ طے کیا ہے اور اسی تجربے سے انھوں نے اپنی ذات کو اجتماعیت کا شریک بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں ''ہم'' انسان کا نمائندہ ہے اور جب وہ ہم کا استعمال کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سب کی بات کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی میر اپنے تخلص کا استعمال بھی اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ وہ خود میرؔ نہیں ہیں بلکہ ایک الگ انسان ہیں۔ اسی لیے اکثر مقطعوں میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے محمد تقی میر کو اپنے سے الگ کر کے مخاطب ہو رہے ہیں''۔

میرؔ کی زبان کے متعلق ابتداء سے ہی تذکرہ ہوتا رہا ہے مگر عہد حاضر میں میر کی زبان پر ہمارے جدید ناقدین نے بہت کچھ لکھا۔ جمیل جالبی میرؔ کی زبان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میر کی زبان عام بول چال کی زبان سے اتنی قریب ہے کہ اس سے زیادہ قربت کا تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ قربت بھی ایسی ہے کہ ایک طرف وہ اسے عامیانہ ہونے سے بچائے رکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کی تخلیقی و ذہنی سطح بھی قائم رکھتے ہیں۔ یہ میر کی انفرادیت بھی ہے اور افتخار بھی۔''!!!

میرؔ کی زبان کے بارے میں جمیل جالبی نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں

> ''میرؔ نے عام بول چال کی زبان کو شاعری میں استعمال کر کے ایک ساتھ دو کام کیے پہلا یہ کہ شاعری کا رشتہ براہ راست معاشرے سے جوڑ دیا اور دوسرے یہ کہ عام بول چال کی زبان

تخلیقی شعور کی بھٹی میں پک کر ایسی نکھری کہ اس کی قوت اظہار
دو چند ہوگئی اور اس کا ارتقاء تیز ہوگیا۔ میرؔ نے زبان کے سلسلے میں
ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ اس نے فارسی الفاظ وتراکیب کو اُردو
کے مزاج میں ڈھال دیا۔''۱۱۲

غرض یہ کہ جدید ناقدین میں نقدِ میرؔ کو آگے بڑھانے والوں میں جمیل جالبی کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

قاضی افضال حسین (۱۹۴۹ء)

قاضی افضال حسین کا شمار میرؔ کے اہم ناقدین میں ہوتا ہے ان کا بنیادی کام ''میرؔ کی شعری لسانیات'' ہے یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اس کتاب کے علاوہ انھوں نے غزلیات میرؔ کا انتخاب بھی کیا۔ یہ انتخاب ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ میرؔ کا لسانیاتی تجزیہ بعض دوسرے ناقدین نے بھی کیا ہے لیکن ان تجزیوں کی نوعیت مختلف مضامین کی ہے قاضی افضال حسین نے پہلی بار میرؔ کی شعری لسانیات سے بحث کی، انھوں نے زبان، اسلوب اور بدیع وبیان کے تحت میرؔ کے یہاں پائے جانے والے شعری محاسن کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور میرؔ کے یہاں استعمال ہونے والے الفاظ، محاوروں، استعاروں، اور علامتوں سے میرؔ کے کلام میں معنوی وسعت تلاش کی ہے۔ اس کتاب کے متعلق قاضی افضال حسین نے خود لکھا ہے:

''زیر نظر مقالے میں میرؔ کی حیات، ماحول اور شخصیت وغیرہ
کے بجائے صرف ان کی غزلوں کو تجزیہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔''۱۱۳

یہ نکتہ بہت اہم ہے جس کی نشاندہی قاضی افضال حسین نے کی اور شاید اس سے قبل میرؔ کے یہاں زبان کے لسانیاتی عمل کو اس تفصیل سے نہیں دیکھا گیا۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں شعری لسانیات کے بنیادی مسائل پر تفصیلی اظہار خیال کیا گیا ہے جس میں شعر کی ہیئت اور مواد، تعبیر ودلالتی پہلو، استعاراتی اظہار، شعری پیکر، علامتیں، بحر، قافیہ، ردیف، ودیگر صوتی اثرات سے بحث کی گئی ہے۔

باب دوم بعنوان ''شعرِ میرؔ کے تعبیری و دلالتی پہلو'' میرؔ کی شعری لسانیات سے

متعلق ہے کہ میرؔ کے کلام میں استعمال ہونے والے الفاظ، معنی کی کن کن جہتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

لفظ کس طرح اپنے لغوی معنوں سے منحرف ہوتا ہے۔ باب سوم میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے، تشبیہہ، استعارہ اور علامتوں کا استعمال میرؔ کے یہاں کس طرح ہوا ہے اور اس سے کیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ میرؔ کے اشعار میں پیکر تراشی اور اس سے ابھرنے والے تاثر کا جائزہ بھی اس باب میں لیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں میرؔ سے مخصوص صوتی اوصاف اور میرؔ کے اشعار میں صنعتوں کے استعمال پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔

''میرؔ کی شعری لسانیات اور انتخاب غزلیات میرؔ دونوں میں قاضی افضال نے اس بات کی اکثر وضاحت کردی ہے کہ وہ میرؔ کے کلام کا انتخاب یا ان کی غزلوں کا تجزیہ اس طرح کریں گے کہ جس سے میرؔ کے کلام کے مختلف ابعاد سامنے آسکیں۔

لکھتے ہیں:

> ''اس مختصر سے انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ اسلوب میرؔ کے تمام ابعاد نمایاں ہو جائیں اور میرؔ کے اس مخصوص تخلیقی طریقہ کار سے عام قاری متعارف ہو سکے جس کی بنا پر میرؔ کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔''۱۱۴

قاضی افضال حسین کے خیال میں شاعر اپنی کیفیات، احساسات اور تجربات کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا لیتا ہے لیکن یہ بظاہر سادہ اور بے ضرر نظر آنے والے الفاظ صرف الفاظ نہیں ہوتے بلکہ کبھی یہ شعری پیکر بن کر ابھرتے ہیں کبھی استعارہ اور کبھی اشارے کی شکل اختیار کرتے ہیں نئے مطالب اور مفہوم پیش کرتے ہیں یہی شعر میں صنائع لفظی اور صنائع معنوی بن کر ایک نیا لطف پیدا کرتے ہیں اور شعر میں معنی کی نئی تہیں بناتے ہیں انھوں نے لکھا ہے:

> ''دیگر فنوں کے مقابلے میں یہی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور دوسری طرف یہی اس کا مسئلہ ہے شاعر ان الفاظ کو کیسے استعمال

کرتا ہے کہ مطلوبہ نتائج برآمد ہو اور ان کی دلالت وصفی کے ذریعہ ہی اپنے جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ زبان کو اپنے جذبہ کی نوعیت کے اعتبار سے تراشتا اور انھیں ان مفاہیم کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے جن کے لیے یہ خلق نہیں ہوئے۔۔۔۔۔۔ یا وہ اپنے بے شکل جذبات و احساسات کو الفاظ کی مدد سے حسّی تجربہ میں تبدیل کردیتا ہے۔۔۔۔۔۔ شاعر اپنے اظہار کے معمول کی اس ندرت کو کس طرح برتتا ہے یعنی اوزان، شعر کا مجموعی آہنگ اور خود الفاظ کی ترتیب وہ کیسی رکھتا ہے تاکہ ترسیل کامیاب رہے۔ یہ اس کے مسائل ہیں۔"۱۱۵

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قاضی افضال شعر کے مجموعی آہنگ، الفاظ کی ترتیب اور جذبے کی ترسیل پر زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ الفاظ اور ان کی نشست شعر کے مفہوم کو متعین کرتی ہے۔ قاضی افضال حسین نے بہت تفصیل سے لفظ کے تعبیری اور دلالتی پہلوؤں سے بحث کی ہے جس میں انھوں نے خیال افروزی، لہجہ، اور رمزیت سب کا احاطہ کرلیا ہے۔ ان کے خیال میں میرؔ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے الفاظ کے تخلیقی یا تعبیری استعمال میں پوشیدہ ہے۔ یعنی میرؔ جس بات کو بیان کرتے ہیں وہ کتنی ہی سامنے کی کیوں نہ ہو اس میں وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جو ہمارے سامنے اس شے کو متشکل کردے۔ قاضی افضال حسین نے میرؔ کی غزلوں میں الفاظ کے استعمال کی مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میرؔ کی غزل الفاظ کے تخلیقی استعمال کی اعلیٰ ترین مثالوں میں سے ایک ہے خصوصاً لفظ کی تعبیرات کو بروئے کار لانے اور انھیں اپنے تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنانے کا جو سلیقہ میرؔ کے اشعار میں نمایاں ہے وہ اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں کم دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ میرؔ کی تخلیقی فطانت لفظ کی اس قوت اظہار سے جو یہ تعبیرات اسے عطا کرتی ہیں پورا کام لیتی

ہے وہ ان روایتی علائم کو بھی جن کی شدت کثرت استعمال کے
سبب تقریباً معدوم ہو چکی ہوتی ہے۔ معنویت کی ایسی انوکھی
جہتوں سے آشنا کرتا ہے جس پر اس کے پیش رو شعراء نے کوئی
توجہ نہ دی تھی۔"[۱۱۶]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرؔ الفاظ کے استعمال میں بے حد نڈر شاعر ہیں۔ وہ عام بول چال کے الفاظ ہوں یا دوسری زبانوں کے مانوس و نامانوس الفاظ، انھیں کسی طرح کے لفظ کے استعمال میں کوئی جھجک نہیں ہوتی ان کے سامنے صرف ایک ہی نظریہ رہتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صحیح ڈھنگ سے ان کے قاری تک پہنچ جائے۔

قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

"ان کے اشعار میں بظاہر معمولی الفاظ بھی گہری
معنویت کے حامل ہوتے ہیں اور تجربے کی بعض نئی جہات روشن
کرتے ہیں ــــــــ بعض الفاظ میں تو میرؔ نے معنویت کی اتنی
جہات روشن کردی ہیں کہ وہ الفاظ ان ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔
مثلاً عشق ولہو وغیرہ ــــــــ بعض جگہ میرؔ نے اردو کی شعری
روایت کے نہایت عام الفاظ کو معنی کے نئے ابعاد عطا کیے ہیں اور
انھیں قطعی نئے سیاق وسباق میں پیش کیا ہے۔"[۱۱۷]

قاضی افضال حسین نے مثال میں بہت سے الفاظ دیئے ہیں مثلاً "گل" کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ عام طور پر "گل" (استعارے) کا استعمال محبوب اور اس کے مختلف اعضاء کے لیے استعارہ یا تشبیہ کے طور پر کیا جاتا رہا ہے۔ میرؔ نے اس کو روایتی معنی میں استعمال کرنے کے ساتھ کئی جگہ بالکل نئے معنی میں باندھا ہے۔ مثال میں انھوں نے میرؔ کے ایک مشہور شعر کی تشریح کی ہے:

صبح ہوئی گلزار کے طائر دل کو اپنے ٹٹولیں ہیں
یاد میں اس خود رو گلِ تر کی کیسے کیسے بولیں ہیں

"ظاہر ہے اگر گل کے معنی صرف محبوب کے ہیں تو طائر

> خود گلزار میں موجود ہیں اور گلزار پھولوں سے بھرا ہے پھر آخر وہ کون سا گلِ تر ہے جس کی یاد انھیں پریشان رکھتی ہے؟ میر اس ''گلِ تر'' کا ایک وصف بھی بیان کرتے ہیں یعنی ''خودرو'' گلِ تر کی یہ صفت کہ وہ نظم وترتیب سے لگائے گئے گلزار کا جز نہیں ہے۔ اسے گلزار کے پھولوں سے الگ کرتا ہے اور گلزار کے درمیان طائر کی اس ''خودرو'' گلِ تر کی جستجو دراصل اب روایتی محبوب کی تلاش سے بلند ہوکر نظم وترتیب کے مقابلہ میں آزادی اور نفیٔ پابندی کی علامت میں منقلب ہونے لگتی ہے۔ میر سے قبل ''گل'' کے اس نوع کے علامتی استعمال کی کوئی مثال نہیں ملتی اور بعد کی شعری روایت میں بھی غالبؔ کے استثنا کے ساتھ کسی دوسرے شاعر نے اس لفظ میں معنی کی ایسی تہہ داری نہیں دریافت کی''۔۱۱۸

شعری لسانیات کے خلقی اوصاف میں استبعاد (Paradox) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ غالباً میر کی شاعری میں استبعاد کا ذکر سب سے پہلے قاضی افضال نے کیا ہے۔ ان کے خیال میں:

> ''میر کی غزلوں میں استبعاد کی مختلف شکلیں کثرت سے ملتی ہیں جس کی افضل ترین صورت ان اشعار میں نمایاں ہے جہاں میر اپنے منفرد تجربے کی شدت کی تہذیب کرتے اور اسے متوازن بنانے اور اس کی بے کم وکاست ترسیل کی کامیابی کے لیے تشبیہ یا استعاروں کا استعمال کرتے ہیں۔ میر نے استبعاد کو اس کی ساری سطحوں پر استعمال کیا اور اس کے ذریعہ ترسیل معنی کی وہ کامیاب کوشش کی جس کی مثالیں غالبؔ کے علاوہ اُردو کے کسی دوسرے غزل گو کے یہاں نہیں ملتی۔''۱۱۹

قاضی افضال حسین نے میر کی زبان کے سلسلے میں ایک بہت اہم اشارہ کیا ہے کہ میرؔ زبان میں دوسروں کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی لسانیات کی تخلیق خود کرتے ہیں۔ میر

کے سلسلے میں یہ بہت اہم نکتہ ہے جس کی نشاندہی قاضی افضال حسین نے کی ہے اور شاید اس سے پہلے میرؔ کے یہاں زبان کے لسانیاتی عمل کو اس تفصیل سے نہیں دیکھا گیا۔ قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

"میرؔ نے اپنی غزلوں کے حوالے سے پہلی مرتبہ اس زبان کے امکانات دریافت کیے جو عوام میں ترسیل مُدعا کا مقبول ترین وسیلہ تھی۔ میرؔ کی زبان سچی (Genuine) تخلیقی حسیت اور اس کے منفرد اور انوکھے تجربات کا مکمل احضار ہے اپنے اشعار کے حوالے سے میرؔ نے اُردو غزل کا مزاج اور اس کی وضع متعین کی اور اس غزل کو فارسی کا تتمہ بنانے کے بجائے خود مکتفی وجود عطا کیا یہ اپنے ماضی سے انقطاع نہیں۔ بلکہ ایک طویل اور وسیع روایت کے جوہر کی مدد سے نئی عصری اور زیادہ برمحل (Relevent) روایت کی ابتدا کا عمل تھا، جسے میرؔ نے تحریک دی۔" [۱۲۰]

قاضی افضال حسین کی کتاب میرؔ کی شعری لسانیات کو شمس الرحمٰن فاروقی نے "گذشتہ برسوں میں میرؔ پر بہترین کتاب قرار دیا ہے" لیکن اس کے باوجود ان کا خیال ہے کہ وہ میرؔ تنقید کے Steriotype سے آزاد نہیں ہو سکے۔" [۱۲۱] حالانکہ قاضی افضال حسین نے اس Steriotype کو اپنے مطالعے میں توڑنے کی کوشش کی ہے اور تذکروں سے اب تک چلی آ رہی میرؔ تنقید کو ایک نئے لسانیاتی نظام کے تحت پرکھنے کی کوشش کی ہے وہ میرؔ کی غم انگیزی یا اداسی یا بیزاری سے زیادہ الفاظ، ان کی ترتیب، استعاروں، اور محاوروں پر زور دیتے ہیں اور ان سے معنی آفرینی کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔

قاضی افضال نے لکھا ہے کہ:

"میرؔ کے تخلیقی کمال کا حسن ان استعاروں میں نمایاں ہوتا ہے جہاں وہ اپنے منفرد تجربات کے اظہار کے لیے روایت پر تکیہ کرنے کے بجائے نئے استعارے خلق کرتے ہیں اور اگر

غزل کی روایت سے کوئی استعارہ منتخب بھی کرتے ہیں تو اس میں
معنویت کی توسیع فکر و احساس کے ایک پورے نظام کے باب ہم
پروا کرتی ہے۔"۱۲۲

میر نئے استعارے بھی خلق کرتے ہیں اور روایتی استعاروں کو بھی اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں معنی کا نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح میر زبان کے معاملے میں عام شاعروں سے بہت مختلف ہیں۔ قاضی افضال حسین نے میر کے استعارات اور علامات کی مثالیں دے کر تفصیل سے ان سے بحث کی ہے اور میر کے یہاں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"اپنے منفرد اظہار کے لیے میر نے جو شعری لسانیات خلق کی، تعبیرات کی ہمہ جہتی اس کا بنیادی وصف ہے میر کی غزلوں میں لفظ اپنے لغوی معنی کے علاوہ بھی مختلف تعبیرات سے مزین ہوتا ہے۔ عام گفتگو کی زبان سے اپنی مخصوص لفظیات کا انتخاب کرتے ہوئے میر نے اس میں پوشیدہ معنی کی بعض انوکھی تعبیروں کا انکشاف کیا اور بعض صورتوں میں اپنے تجربے کی نوعیت کے مطابق اسے معنی کی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اس طرح میر کی لفظیات عوام کی زبان سے قریب تر ہونے کے باوجود شعری اظہار کے اعلیٰ ترین مظاہر میں شامل ہو گئی۔"۱۲۳

لسانیاتی مطالعے میں عام طور پر ایک کمی یا کوتاہی کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے سارے مباحث لفظ اور اس کے استعمال کے گرد گھومتے ہیں لیکن قاضی افضال حسین نے لفظ کے ان تہذیبی مناسبات سے بھی بحث کی ہے جو الفاظ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شہر، نگر، بستی، یہ ہم معنی ہوتے ہوئے بھی تہذیبی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میر نے اکثر اپنے اشعار میں ان کی تہذیبی مناسبتوں سے معنی کی نئی جہات پیدا کی ہیں۔ قاضی افضال حسین نے میر کی شعری لسانیات میں اس تہذیبی مطالعے کی طرف اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میر کی تمام تر اہمیت ان کے مخصوص لسانی رویہ کی وجہ سے ہے

یعنی وہ الفاظ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ وہ کثیر المعنی لفظ بن جاتا ہے انھوں نے لکھا ہے:

> ”۔۔۔۔۔لیکن اس حقیقت کا اعادہ ضروری ہے کہ میر نے مسلمات کی اساس پر شعر میں اپنی تخلیقی فطانت کے بعض نہایت کامیاب نمونے پیش کیے ہیں جو انھیں روایات کی موجودگی کے باوجود دوسرے شعراء کی غزلوں میں نہیں ملتے جس کا سبب میر کا وہ مخصوص لسانی رویہ ہے جس میں لفظ معنی بیان کرنے کے بجائے ان پر محیط ہوتا ہے اور اس طرح شعر کو اظہار کے بجائے اخفاء کا فن بناتا ہے۔ مزید یہ کہ دوسرے غزل گو شعرا (مثلاً مومن) کے برخلاف میر کے اشعار میں رمزیت کی تشریح محض تجربے کی بعض محذوف کڑیاں جوڑنے تک محدود نہیں ۔۔۔۔۔ بلکہ معنی کی تکمیل کے اس عمل میں تجربہ میں وسعت کے ساتھ ہی نئے معنی کے امکانات بھی روشن ہوتے ہیں ۔ جو ظاہر ہے شعر میں کثیر المعنویت کی اساس اور اس کی تاثیر کا سبب ہیں۔“[۱۲۴]

اس طرح قاضی افضال حسین نے میر کا مطالعہ ایک نئے انداز سے کیا ہے۔ میر تنقید کے جائزے میں قاضی افضال حسین کے اس لسانی و ہیئتی رویہ کو اسی لیے اہمیت حاصل ہے کہ یہ میر کی تفہیم و تنقید کے لیے نیا تنقیدی زاویہ پیش کرتا ہے۔

قاضی عبدالودود (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۴ء)

قاضی عبدالودود، اُردو کے بے حد اہم محققین میں ہیں ۔ میر پر اُن کے مضامین کا مجموعہ ”میر“ کے ہی نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں اُن کے ۱۴ مضامین شامل ہیں ۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً معیارستان، مختلف رسائل اور میگزین میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصّے میں پانچ مضامین میر کی حالات زندگی، کلیات میر کی اوّلین اشاعت، کچھ میر تقی میر کے بارے میں اور قصیدہ در شکایت نفاقِ یارانِ زماں ہے۔
دوسرے حصے میں چھ مضامین ہیں ۔ ذکر میر تتمہ، تبصرۂ ذکر میر، تتمۂ انتخاب کلام

میر، تصحیح واضافہ، تبصرۂ ذکرِ میر اور نکات الشعراء، تیسرے حصے میں میر تقی میر حیات وشاعری جوکہ خواجہ احمد فاروقی کی کتاب پر تبصرہ ہے اس کے علاوہ میر ملحقات اور ضمیمۂ میر شامل ہیں۔ اس فہرست سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قاضی عبدالودود کے تمام مضامین بنیادی طور پر تحقیقی ہیں۔ قاضی عبدالودود اُردو تحقیق ہی کے مردِ میدان تھے۔ ان تمام مضامین میں خواہ وہ ذکر میر سے متعلق ہوں یا انتخاب کلام میر سے یا بعض کتابوں میں تبصرے سب کی نوعیت تحقیقی ہے۔ انھوں نے ان تبصروں میں بہت سختی سے تحقیقی کوتاہیوں اور غلطیوں کی گرفت کی ہے۔ لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ چار سو صفحات سے زائد اس مجموعۂ مضامین میں میر کی شاعری، ان کے کلام کے محاسن یا ان کے کلام پر کوئی تنقیدی اشارہ نہیں ملتا۔ وہ ذکر میر کے واقعات، تاریخ، اور سنین کے بارے میں صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب پر بھی خاصہ طویل تبصرہ ہے۔ اس میں ان کی زیادہ تر بحث کتابوں کے حوالوں اور تاریخی واقعات سے ہے۔ حالانکہ خواجہ احمد فاروقی نے میر کی شاعری اور ان کے فن سے بھی بحث کی ہے لیکن اس کے سلسلے میں نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ کوئی تعریفی جملہ۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے کو حقائق کی بازیافت تک محدود کرلیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاضی عبدالودود کا ذکر میر کے اہم ناقدین میں کیا جاسکتا ہے کہ نہیں اس بات میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ وہ بے حد معتبر محقق ہیں۔ لیکن یہاں پر محقق سمجھ کر انھیں نظر انداز کردینا مناسب نہیں ہے۔ میر اور عہد میر کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کا کام بہت عظیم اور اہم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی شاعر کے عہد اور اس کے واقعات اور حالات کو صحیح طریقے سے جانے بغیر جو تنقید کی جائے گی اس میں غلطی کا امکان رہے گا لہٰذا قاضی عبدالودو نے میر کے حالات ان کے خاندان اور اس عہد کے پس منظر کے سلسلے میں جن حقائق کی بازیافت کی ان سے میر تنقید میں یقیناً اضافہ ہوا، اس طرح وہ مطالعۂ میر کی ایک اہم کڑی ہیں۔

گوپی چند نارنگ (۱۹۳۱ء)

گوپی چند نارنگ دورِ حاضر میں ہماری زبان کے مقتدر ادیب، دانشور اور نقاد ہیں۔ وہ تیس سے زیادہ کتابوں کے مرتب و مصنف ہیں۔ ان کا شمار اسلوبیاتی تنقید اور اب مابعد

جدید تنقید کے بنیاد گزاروں میں کیا جاتا ہے۔ان کی کتاب ''اسلوبیاتِ میرؔ''،نقدِ میر کے سلسلے میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے دراصل یہ وہ لیکچر ہے جو انھوں نے ۱۹۸۴ء میں انجمن ترقی اُردو کراچی پاکستان میں بابائے اُردو یادگار لیکچر کے تحت دیا۔ یہی لیکچر بعد میں کتابی شکل میں ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

اسلوبیات میرؔ میں گوپی چند نارنگ نے پہلی بار میرؔ کی شاعری کی بعض ایسی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے جو میرؔ کے لسانی اور اسلوبیاتی مطالعے میں معاون ہو سکتی ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔

> ''میرؔ اُردو کے پہلے بڑے شاعر ہیں جن کے یہاں اُردو کی جتنی شانیں،شاخیں،جتنے ذیلی اسالیب اور جتنی لسانی جہات ملتی ہیں اتنی بعد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔'' ۱۲۵

میرؔ اپنے اشعار میں بارہا اس طرف کرتے ہیں کہ ان کی شاعری،شاعری نہیں ہے، باتیں ہیں۔ان کا انداز گفتگو کا انداز ہے۔(باتیں ہماری یاد رہیں باتیں پھر ایسی نہ سنیئے گا) میرؔ کا یہ دعوئ غلط نہیں ہے ان کے اشعار پڑھتے وقت یہی محسوس ہوتا ہے کہ میرؔ شعر نہیں کہتے باتیں کرتے ہیں۔گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے:

> ''میرؔ اُردو غزل میں کہنے اور سننے کی Oral روایت کے آخری امین ہیں۔۔۔۔۔۔میرؔ کے اشعار میں باتوں کا انداز پایا جاتا ہے''۔ ۱۲۶

یہ دعوئ چاہے میرؔ کریں،یا گوپی چند نارنگ یہ کہیں کہ میرؔ کے یہاں باتوں کا انداز پایا جاتا ہے،اپنے آپ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔غالب کے خطوط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا،گفتگو کے انداز میں خط لکھے لیکن غالبؔ اپنی شاعری میں وہ طرز پیدا نہ کر سکے جب کہ میرؔ اُن سے قبل اپنی شاعری میں باتوں کا انداز اختیار کر چکے تھے۔میرؔ کے اشعار میں روزمرہ گفتگو کے الفاظ مثلاً میاں،ارے،صاحب،رے،میر اور میر صاحب،تم اور میر جی جیسے الفاظ کا استعمال ہوا۔غور کریں تو شاعری میں ایسے الفاظ کا استعمال یقیناً مشکل امر ہے جسے میرؔ نے ممکن کر دکھایا ہے اور ایسے فطری انداز میں کہ احساس ہی نہیں

ہوتا کہ یہ بول چال کے الفاظ ہیں اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ میرؔ کو اپنی جڑوں سے گہرا لگاؤ ہے وہ اُن سے وابستہ ہر شے سے بے پناہ اُنس رکھتے ہیں خواہ وہ زبان کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔ شعر کہتے وقت وہ خصوصی طور سے ایسی زبان کا استعمال کرتے ہیں جسے خالص ہندوستانی زبان کہتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے؛

"زبان کے معاملے میں دھرتی سے ان کا رشتہ کہیں نہیں ٹوٹتا"۔ ۱۲۷

شاید اسی لیے میرؔ ہمیں اپنے سب سے زیادہ نزدیک لگتے ہیں، ان کی زبان خواص کے علاوہ عام آدمی کو بھی شیریں لگتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میر کے بعد آنے والے شعراء یا عہد جدید کے شاعر کہیں نہ کہیں میر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ نثر میں تو غالبؔ بھی میر کا انداز اپنا لیتے ہیں مگر شاعری میں وہ میر کی پیروی نہیں کر سکے، بہت ممکن ہے غالبؔ میر کی شاعری سے متاثر ہوئے ہوں۔ بقول گوپی چند نارنگ میر کی زبان سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کو اختیار کرنا بہت مشکل امر ہے۔ سہل ممتنع ایک عام اصطلاح ہے جسے آسانی سے سمجھ میں آجانے والی شاعری کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن لسانی اور اسلوبیاتی لحاظ سے اُس کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اس کی وضاحت بڑے واضح انداز میں کی ہے۔

> "میر کے اشعار میں۔۔۔۔۔۔۔ بڑے پیمانے پر زبان کی عام ساخت یعنی جملے کی ساخت برقرار رہتی ہے یہی ان کی قدرتِ کلام کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔۔۔۔۔۔۔ بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ بول چال کی زبان میں زبان کی محض اوپری ساخت کام کرتی ہے۔ اس میں لفظ محض لفظوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور صرف وہی معنی ادا کرتے ہیں جو ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان کا یہ بنیادی فرق کہ بول چال کی زبان صرف اپنی اوپری ساخت کے ذریعہ کام کرتی ہے دُور رَس نتائج کا حامل ہے۔ ۱۲۸

میرؔ کی زبان سادہ ضرور ہے مگر یہ زبان صرف اپنی اوپری ساخت کے ذریعہ کام

نہیں کرتی بلکہ اس میں کئی کئی داخلی ساختیں کام کرتی ہیں۔ میرؔ کے یہاں ربط و تضاد، تشبیہ، استعارہ، اشارہ، کنایہ، رمز، مجاز، علامت، پیکر، تجنیس تضاد، جیسی مناسبتوں کے ذریعہ زبان کی شعری تقلیب ہوتی ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ ''میرؔ کے یہاں عام زبان تقلیب کے عمل سے گزر کر معنیاتی نظام کو روشن کرتی ہے'' یعنی میرؔ کے یہاں الفاظ محض اپنے اوپری معنی نہیں دیتے بلکہ ہر لفظ اپنے اندر ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہے اسی لیے ان کی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔

گوپی چند نارنگ نے میرؔ کو ''پوری اُردو'' کا پورا شاعر قرار دیا ہے۔ انھوں نے میرؔ کی زبان کے ایک اور خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے یہاں ہندی رس بھی موجود ہے۔ میرؔ کا لڑکپن آگرہ میں گزرا لہٰذا ان کی زبان پر آگرے کی برج کی بھی چھاپ ہے مثلاً میرؔ کے یہاں کبھو، کسو، کیجیو، لیجو، ٹک، نپٹ، پون، نگر، برہ، بچن، سانجھ، سجن، مائی جیسے الفاظ برج بھاشا کی یاد دلاتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری میں طویل مصوتوں یا خفیف مصوتوں کو کھینچ کر طویل بنانے کا رجحان بھی برج بھاشا کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ دلّی کی کھڑی بولی کی لسانی خصوصیات بھی کلامِ میرؔ کا اہم حصّہ ہیں۔ پوری اُردو کی وضاحت کرتے ہوئے نارنگ نے لکھا ہے:

> ''پوری اُردو سے مراد صرف ایک سطح نہیں بلکہ اس کے تمام لسانی روپ اور پرتیں، یعنی صرفی اور نحوی، صوتیاتی، اسلوبیاتی نیز عروضی ان تمام رخوں کو جیسا کہ میرؔ نے کھنگالا ہے اور زبان کے آئندہ امکانات کی جو بشارت دی ہے اس اعتبار سے پوری اُردو زبان کے پورے شاعر کہلانے کا شرف میرؔ تقی میرؔ ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔'' ۱۲۹

گوپی چند نارنگ نے اپنی بات کو مدلل انداز میں کہنے کے لیے رشید احمد صدیقی کا قول بھی نقل کیا ہے:

> ''رشید احمد صدیقی نے صحیح کہا ہے: میرؔ کی اُردو دوسرے شعراء کی اُردو سے اس اعتبار سے علاحدہ ہے اور اہم ہے کہ

> دوسرے شعرا اکثر و بیشتر، عربی فارسی اور دوسری زبان کے الفاظ، تراکیب، بندش، محاورہ، روزمرہ یا انواع واقسام کے علوم وفنون یا نعروں کے سہارے چلتے ہیں میر صرف اُردو اور اپنے مخصوص لب و لہجہ سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے ممتاز شعرا کی جو مخصوص زبان ہوتی ہے۔ اس میں اتنی اُردوئیت یا ''اُردو پن'' نہیں ہوتا جتنا میر کے یہاں ہے۔'' ۱۳۰

گوپی چند نارنگ ایک اہم سوال کرتے ہیں؟ کہ آخر کیا سبب ہے کہ میرؔ کی زبان آج بھی ہمیں اس عہد کے بجائے اپنے زمانے کی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ میرؔ کی شاعری کی سادگی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے؟ میرؔ کی زبان کے ''سدابہار'' ہونے کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کی زبان کے سدابہار ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ اس زبان کا جو سیدھا سچا رشتہ بولیوں سے ہے وہ آج بھی توانا اور بامعنی ہے اور اس کی گونج آج بھی پورے برصغیر میں موجود ہے کیونکہ یہ بولیاں چاروں طرف زندہ ہیں۔ یہ بولیاں آج بھی میر کی زبان کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہیں تو یہ رشتہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی تازہ اور نیا ہوتا رہتا ہے۔'' ۱۳۱

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تقریباً ڈھائی سو سال گزرنے کے بعد بھی میرؔ کی زبان اسی طرح تازہ اور سدابہار ہے۔ گوپی چند نارنگ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ میرؔ کی زبان کے زندہ رہنے کا بڑا سبب برصغیر کی بولیوں سے اس کا قریبی و نزدیک ہونا ہے۔

نقدِ میرؔ میں گوپی چند نارنگ کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے لسانی اور اسلوبیاتی تجزیے کے ذریعہ میرؔ کو ایک نئے تنقیدی انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس کتاب میں بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان کے مابین فرق اور روزمرہ و محاورہ و استعارے کا میرؔ کی شاعری میں استعمال، زبان کی خارجی اور داخلی ساخت کے امتیازات سے جس طرح بحث کی گئی ہے وہ گوپی چند نارنگ کی میرؔ شناسی کا ثبوت ہے۔

محبؔ عارفی

مُحب عارفی میرؔ کے ان ناقدین میں ہیں جن کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ، شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی شعرِ شور انگیز میں محبؔ عارفی کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ حالانکہ مُحب عارفی کی کتاب ''میر تقی میر اور آج کا ذوق شعری'' دیکھنے کے بعد محبؔ عارفی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں بعض باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ مُحب عارفی نے اپنی کتاب کی بنیاد دو چیزوں پر رکھی ہے۔ اوّل میرؔ کے کلام کی تفسیر وتعبیر دوسرے غالبؔ اور میرؔ کے مرتبے کا تقابل، شمس الرحمٰن فاروقی کا خاکہ بہت وسیع ہے جب کہ مُحب عارفی کی دُنیا محدود۔

مُحب عارفی کی کتاب ''میر تقی میر اور آج کا ذوق شعری'' اگست ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی اور شاید یہ پہلی کتاب ہے جسے Reader oriented criticism (قاری اساس تنقید) کی مثال کہا جا سکتا ہے۔ مُحب عارفی نے پوری کتاب میں کہیں اس اصطلاح کا نام نہیں لیا ہے لیکن ذوقِ شعری میں ایک عام قاری اور ایک خاص قاری کے ردِ عمل کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا ہے جو ''قاری اساس تنقید'' کی شرطِ اوّل ہے محبؔ عارفی نے ابتدا میں ذوقِ شعری کی ہیئت ترکیبی اور اس کی تعمیر سے گفتگو کی ہے جس میں انھوں نے ایک بااہلیت قاری اور ایک عام قاری میں کیا فرق ہے اور خود اُن کے نزدیک ذوقِ شعری کی تعمیر کیونکر ہوئی ہے اور اختلافِ ذوق کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ اسے تفصیل سے لکھا ہے ذوقِ شعری کی تعریف میں مُحب عارفی کافی بھٹکے بھی ہیں کبھی وہ اسے بحیثیت مجموعی کیف اندوز بتاتے ہیں کبھی اس کا کام یہ بتاتے ہیں کہ:

> ''خالص شعریت کتنی جاندار ہے اسے محسوس کرنا، بنیادی طور پر، جمالی جبلت کی شعری شاخ کا کام ہے جو ذوقِ شعری کی روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن وہ ذوقِ شعری کے دوسرے اجزائے ترکیبی ہیں جو جاندار شعر کی مجموعی قدر و قیمت کی تشخیص کرتے ہیں۔'' [۱۳۲]

''کبھی وہ اسے احساساتی بلغیت کا پرتو بتاتے ہیں'' ان تمام مباحث کے بعد انھوں نے رسالہ نقوش لاہور کے میر تقی میرؔ نمبر حصہ دوئم سے مولانا عبدالباری آسی، عبدالحق

،مجنوں گورکھپوری، سید عبداللہ، نثار احمد فاروقی، صفدر آہ، فراق اور دوسرے بہت سے ناقدین کے اقتباسات دے کر میر کے بارے میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

"میری مراد یہ نہیں کہ باہم مربوط فلسفیانہ خیالات کا کوئی نظام میرؔ نے پیش کیا وہ اس قبیل کے فلسفی شاعر نہیں تھے اس قبیل کا کوئی فلسفی شاعر اُردو میں اقبال کے سوا پیدا ہی نہیں ہوا۔ میری مراد یہ ہے کہ میرؔ اعلیٰ درجہ کے مفکر شاعر تھے اور ان کی تخلیقی شخصیت پر بڑی طاقتور تحقیقی جبلت کا غلبہ تھا۔"[۱۳۳]

اس کے بعد انھوں نے کلام میر سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جو اُن کی نگاہ میں اعلیٰ درجہ کے فکری اشعار یا مفکرانہ احساس رکھنے والے شعر تھے اور تقریباً ۳۰۰ صفحات میں ۴۲۸ اشعار کی تشریح کی ہے اس تشریح میں وہ جگہ جگہ پر غالبؔ کے اشعار کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی کرتے گئے ہیں۔ اشعار کی تشریحات اسی نہج کی ہیں جس طرح کی دوسری تشریحات ملتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے کلاسیکی شعریات کو بنیاد بنانے کے بجائے ذوقِ شعری یعنی تاثر، احساس، انسانی جبلت، طرزِ ادا کو بنیاد بنایا ہے۔ اشعار کی تفسیر میں وہ بھی کھینچ تان میں اتنا پھیل جاتے ہیں کہ موجودہ سیاست تک آ جاتے ہیں اور میرؔ کی فخر پسندی میں انھیں "اکبری حکمت عملی" دکھائی دینے لگتی ہے۔ نہ جانے کہاں سے وہ متحدہ ہندوستانی قومیت کا مسئلہ لے آتے ہیں۔ جس میں نہ وہ اکبر کو معاف کرتے ہیں اور نہ پروفیسر احتشام حسین کو۔ شاید یہ اُن کے پاکستانی مزاج کا اثر ہے۔ آخری حصّے میں انھوں نے میر کا مرتبہ متعین کرنے کے لیے میر اور غالبؔ کا موازنہ کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"قدرِ اوّل کے وہ اشعار جو مجھے میر کی غزلوں میں ملے من حیث المجموع مجھے ہر اعتبار سے زیادہ دقیع و دلکش محسوس ہوئے، قدرِ اوّل کے ان اشعار کے مقابلے میں جو میں غالبؔ کی اُردو غزلوں میں پا سکا روایتی غزل گوئی کے فن میں میر تقی میر مرزا غالبؔ سے بہت برتر یعنی اُردو کے عظیم ترین شاعر ہیں۔"[۱۳۴]

مُحب عارفی نے جس انداز میں کلام میر پر اظہارِ خیال کیا ہے وہ ان کی تنقید کو ذوقی،

تاثراتی، اورتشریحی تنقید کے قریب لے آتا ہے۔ اس کتاب سے نقدِ میر میں بہت کچھ اضافہ تو نہیں ہوتا مگر قاری اساس تنقید کی جھلک ان کے یہاں ضرور ملتی ہے کہ ہر 'بااہلیت قاری' اپنے ذوقِ شعری کی بنیاد پر متن سے معنی اخذ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

شمس الرحمن فاروقی (۱۹۳۵ء)

بیسویں صدی کی آخری نصف صدی بالخصوص آخری دو دہائیاں نقدِ میرؔ کے سلسلے میں بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ میرؔ پر جتنا وقیع کام اس زمانہ میں ہوا اتنا کسی عہد میں نہیں ہوا اس عرصہ میں مختلف نہج سے میر کا مطالعہ کیا گیا۔ کبھی مغربی تنقیدی اصولوں کے تحت اور کبھی مشرقی شعریات کی روشنی میں میرؔ کی شاعرانہ اہمیت پر اظہار خیال کیا گیا اور کبھی مشرقی اور مغربی شعریات دونوں کی روشنی میں میرؔ کی عظمت کا جائزہ لیا گیا۔

گذشتہ صفحات میں اس عہد کے بیشتر ناقدین میرؔ کی تحریروں کا تجزیہ کیا جاچکا ہے۔ نقدِ میرؔ کے سلسلے میں اس زمانے میں جو سب سے اہم کام سامنے آیا وہ شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''شعر شور انگیز'' ہے۔

''شعرشورانگیز'' میں شمس الرحمٰن فاروقی کلام میرؔ میں ایسے معانی و مفاہیم کی تلاش میں کوشاں نظر آتے ہیں جن پر کسی کی نظر آج تک نہیں گئی۔ وہ کلامِ میرؔ میں نئی معنویتوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی میرؔ کے ایک ایک شعر کی تشریح مختلف انداز میں کرتے ہیں، وہ کلاسیکی شعریات کو بروئے کار لاتے ہیں ساتھ ہی مغربی تنقید کی مدد سے بھی کلام میر کا محاکمہ کرتے ہیں۔ انھوں نے ''شعرِ شور انگیز'' میں منشائے مصنّف سے انکار کیا ہے اور متن شعر کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بنیادی سوال یہ نہیں ہے کہ مصنّف کا عندیہ کیا ہے؟
> بنیادی سوال یہ ہے کہ متن کیا کہتا ہے؟ لہٰذا معنی میں کثیریت Pluralism کے اصول سے متن پر ضرب نہیں پڑتی ۔ متن کو مصنّف کا منشا نہیں بلکہ عمل سمجھنا چاہیے۔''[۱۳۵]

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ شعر میں بنیادی اہمیت منشاء مصنف کی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی عندیۂ مصنف کو اہمیت نہیں دیتے۔ان کا خیال ہے کہ معنی کی کثرت سے عندیۂ مصنف پر حرف نہیں آتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں معنی، لفظ کے تابع نہیں۔ شاعر لفظوں کو ترتیب دے کرنحوی تراکیب اور تشبیہہ واستعارہ وغیرہ کے ذریعہ ان میں حسن پیدا کرتا ہے۔علی سردار جعفری بھی شعرِ شور انگیز کے اندازِ نقد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا مطالعہ سماجی اور سیاسی پس منظر کے ساتھ ہے۔...

شمس الرحمٰن فاروقی کا زور زبان کے حسن اور بلاغت پر ہے۔

شعر کی فنی خوبیوں پر ہے۔''۱۳۶

''شعرِ شور انگیز'' میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اگر ایک طرف الفاظ کی معنوی تہہ داری پر زور دیا ہے تو دوسری طرف انھوں نے کلاسیکی شعریات کی بازیافت بھی کی۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شعر شور انگیز اور تفہیم غالب جیسی اپنی اہم تشریحات میں انھوں نے زبان کی صوتی، صرفی ونحوی خوبیوں کے ساتھ ہی استعارے، صنائع و بدائع اور عروض وآہنگ سب سے استفادہ کیا ہے اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعر شور انگیز میں مشرق اور مغرب، قدیم اور جدید، روایتی اور غیر روایتی تنقید کا انوکھا امتزاج ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کلاسیکی شعریات اور مغربی تنقید کے اصول ونظریات دونوں صورتوں میں اعتدال کے قائل ہیں۔

''شعر شور انگیز'' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل نو ابواب پر مشتمل ہے۔جس میں خدائے سخن میر کہ غالب، غالب کی میری، میر کی زبان روزمرہ یا استعارہ (دو ابواب) انسانی تعلقات کی شاعری، چوں خمیر آمد بدست نانبا، دریائے اعظم، بحر میر، اور شعر شور انگیز کے عنوانات سے ہی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے میر کے مطالعے کو ایک نئی فکری جہت دینے کی کوشش کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو مغربی ادبیات کے ساتھ مشرقی ادبیات پر بھی دسترس حاصل ہے۔ مشرقی شعریات خاص طور پر عربی وفارسی اصول نقد سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ادب کے رجحانات میں ان پر New criticism (نئی تنقید) کا سب سے زیادہ اثر نظر آتا ہے۔ تنقید میر کے سلسلے میں شعر شور انگیز کے ۹ ابواب مطالعہ میر کے ۹ نقطۂ نظر کی

اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں کے ذریعہ میر کی اہمیت کی بنیادی وجوہات/ خصوصیات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر کیوں اہم ہیں، غالب اور میر میں خدائے سخن کون ہے؟ خدائے سخن قرار دینا صرف کسی خطاب کا جواز نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت پوری ایک شعری بوطیقا ہے جس کے ذریعہ ہم نہ صرف غالبؔ و میر کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ دوسرے کلاسیکی شعراء کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔ خدائے سخن میرؔ کہ غالب کو کوئی موازنہ یا تقابلی مطالعہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس لیے کہ شمس الرحمٰن فاروقی اس مضمون میں دونوں شاعروں کی اہمیت اور عظمت کے قائل ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ میرؔ و غالبؔ کی شعریات تقریباً ایک ہی ہے جب کہ بظاہر دونوں شاعر الگ الگ معلوم ہوتے ہیں البتہ دونوں کے شعری طریق کار میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے:

> ''غالبؔ کا تخیل آسمانی اور باریک تھا میرؔ کا تخیل زمینی اور بے لگام۔ غالب نے اپنی شاعری کے لیے اس طرح کی زبان وضع کی جسے ادبی زبان کہا جاسکتا ہے میر نے روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنادیا۔۔۔۔۔غالب نے میر کی زبان اور اسلوب کو کبھی اختیار نہ کیا جس طرح کی ''اشرافیہ'' اور ''ادبی'' زبان کے وہ خالق تھے۔ وہ میر کی سی زبان کو قبول ہی نہ کر سکتی تھی''۔ ۱۳۷

یہاں شمس الرحمٰن فاروقی نے میر کا بنیادی امتیاز میر کی زبان کو قرار دیا ہے۔ غالبؔ کی زبان اپنے عہد کی نمائندہ زبان ہے جب کہ میر اپنے عہد کی عام زبان یعنی گلی کوچوں میں بولی جانے والی زبان کو اظہار وسیلہ بناتے ہیں۔ میر ایک ایسے شاعر ہیں جن سے ان کے عہد اور ان کے بعد آنے والوں نے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ غالبؔ بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''۔۔۔۔۔ایسا نہیں ہے کہ غالبؔ نے میرؔ سے استفادہ نہیں کیا لیکن یہ استفادہ اسلوب کی سطح پر نہیں بلکہ مضمون کی سطح پر تھا۔۔۔۔۔غالب نے جہاں جہاں میر سے مضمون یا کسی بات کا

کوئی پہلو مستعار لیا ہے تو ہمیشہ اس میں نئی بات پیدا کی ہے یا پھر
مزید معنویت داخل کی ہے۔ انھوں نے شعر پر شعر لکھنے کی بجائے
چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ اور اکثر اوقات ان کا چراغ میر سے
روشن تر نکلا ہے۔" ۱۳۸

فاروقی کے خیال میں مناسبت، معنی آفرینی، شورش اور شورانگیزی کی خوبیاں دونوں شعراء کے یہاں موجود ہیں مگر زبان کی سطح پر دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔

"غالب کے یہاں روزمرہ سے دوری کا ذکر مجھے میر کی
اس خصوصیت کی طرف لاتا ہے جسے میں ان کے عظیم ترین
کارناموں میں شمار کرتا ہوں یعنی یہ کہ میر نے روزمرہ کی زبان کو
شاعری کی زبان بنا دیا۔ یہ کام ان کے علاوہ کسی سے نہ ہوا اور اس
کی وجہیں متعین کرنا آسان نہیں"۔۔۔۔۔۔۔۔

میر نے زبان میں وہ قوتیں داخل کیں جو تصوراتی اور
جذباتی تعریفات کا احاطہ کرسکیں، لیکن زبان کی جڑیں پھر بھی
روزمرّہ ہی میں پیوست رہیں۔ انھوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا،
اور اس طرح کہ آج تک اس کا بدل نہ ہوسکا۔۔۔۔۔ اس وقت
کی مروج شعری زبان سے انحراف اور روزمرہ کو شاعری بنانے کا
عمل جو میر نے سرانجام دیا، وہ غالب کے کارنامے سے کم وقیع
نہ تھا۔ غالب کے زمانے میں کم سے کم اتنا تو تھا کہ زبان کے
بہت سے نمونے موجود تھے۔ لہٰذا غالب کو ردوقبول اور غوروخوض
کے مواقع تو مہیا تھے میر کے سامنے تو ایک ہی نمونہ تھا، یعنی اس
وقت کی شعری زبان ۔۔۔۔۔ اس لیے میر کو اپنا راستہ خود بنانا
پڑا، ان کے سامنے کوئی نمونے نہ تھے۔ اس وجہ سے میر کا لسانی
کارنامہ غالب کے کارنامے سے کم تر نہیں بلکہ کچھ برتر ہی معلوم
ہوتا ہے"۔ ۱۳۹

اس طرح شمس الرحمٰن فاروقی نے دونوں شعراء کی اہمیت کو باقی رکھا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ

"زبان کے تنوع، تجربۂ حیات کی کثرت اور شخصیت کی ہمہ گیری میں میر کا مرتبہ غالب سے اعلیٰ ہے۔ خالص تعقل اور تجرید اور نازک خیالی میں غالب کا درجہ میر سے بلند ہے۔۔۔۔ایک صفت کیفیت کی میر کے یہاں ایسی ہے، جو غالب کے یہاں بہت کم ہے میر کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ معنی آفرینی کے ساتھ کیفیت پیدا کر لیتے ہیں"۔ ۱۴۰

یہاں پر شمس الرحمٰن فاروقی نے میر کی تین خصوصیات کا مزید ذکر کیا ہے۔ زبان کا تنوع، تجربہ حیات کی کثرت اور شخصیت کی ہمہ گیری۔ آخر میں معنی آفرینی کے ساتھ کیفیت کا اضافہ کیا گیا اس طرح خدائے سخن میر کہ غالب، میں وہ میر کی ایسی پانچ خوبیاں بتاتے ہیں جو غالب کے یہاں کم یاب ہیں۔ فاروقی غالب کی عظمت اور زبان کی اعلیٰ اقدار کے قائل ہیں لیکن ان پانچ نکات کے لیے جن کا اوپر ذکر کیا گیا وہ غالب کے مقابلے میں میر کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں پر مسئلہ خدائے سخن قرار دینے کا نہیں ہے اور نہ شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ مقصد ہوسکتا ہے۔ ان کا نصب العین دراصل دو عظیم شاعروں کی ان بنیادی خوبیوں کو دریافت کرنا تھا جن کے تحت صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان کی اہمیت اسی طرح سے باقی ہے بلکہ اس میں کچھ مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

میر اور غالب کے ابواب میں ان عظیم شعراء کی زبان کے فرق پر تفصیلی اظہار رائے کے بعد بھی شمس الرحمٰن فاروقی نے میر کے لسانی عمل پر دو مفصل ابواب تحریر کئے ہیں۔ ان ابواب میں "میر کی زبان روزمرہ یا استعارہ" کے عنوان سے زبان میر سے بحث کی گئی ہے جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ فاروقی کے نزدیک میر کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے روزمرہ کو شاعری کی زبان بنا دیا ہے۔" ان ابواب میں فاروقی اسی نکتہ کو وضاحتی انداز میں تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔ میر روزمرہ کے شاعر عام معنی میں نہیں ہیں بلکہ انھوں نے روزمرہ کی زبان پر مبنی شاعری لکھی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کئی طرح کے لسانی اور

شاعرانہ وسائل استعمال کیے ان شاعرانہ وسائل میں شمس الرحمٰن فاروقی، استعارہ، کنایہ، قول محال، رعایت لفظی، کو شامل کرتے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ

> ''میرؔ کے یہاں مناسبت کا التزام اس کثرت سے ہے کہ وہ غالبؔ اور میر انیسؔ کے ساتھ اردو میں رعایتوں کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ میرؔ کی رعایتیں مختلف صنائع لفظی و معنوی کا احاطہ کرتی ہیں۔ مناسبت کی کثرت نے میرؔ کی زبان کو بے انتہا چونچال، پُر لطف کثیر الاظہار تازہ کار اور تہہ دار بنا دیا ہے۔ میرؔ کے کسی معاصر کو یہ امتیاز نصیب نہیں۔'' ۱۴۱

شمس الرحمٰن فاروقی نے میرؔ کی ایک اور اہم خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرؔ نے فارسی کے نادر الفاظ اور فقرے کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ عربی کے غریب الاستعمال الفاظ اور تراکیب بھی انھوں نے خوب برتے ہیں۔ مگر میرؔ کے یہاں عربی و فارسی اس طرح کھپ گئی ہے کہ اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ میرؔ نے عربی، فارسی کے ساتھ پراکرت کے الفاظ کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ فارسی اور پراکرت الفاظ کا آپس میں انضمام میرؔ کا خاصہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اپنے معاصروں اور پیش رووں کے برخلاف، میرؔ نے زبان کے ساتھ آزادیاں بہت کثرت سے روا رکھی ہیں۔
> میرؔ کسی لفظ سے گھبراتے نہیں اور موقع پڑنے پر وہ دور دراز کے لفظ یا نامانوس لفظ (یعنی شاعری کی زبان کے لیے نامانوس لفظ) بالکل عوامی لفظ بے خوفی سے استعمال کر لیتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال کے معاملے میں میرؔ ہمارے سب سے زیادہ Adventurous یعنی مہم جو شاعر ہیں۔'' ۱۴۲

میرؔ کی شاعری کے مطالعے سے بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ میرؔ نے نامانوس الفاظ کو بغیر سوچے سمجھے استعمال کیا ہے کیونکہ میرؔ کے زیادہ تر کلام میں پراکرت الفاظ کا استعمال دوسرے شعراء کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے میرؔ کا کلام سادہ اور گھریلو معلوم ہوتا ہے

حالانکہ میر نئے الفاظ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں روزمرہ کا اثر اور رنگ باقی رہتا ہے۔ مگر شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے۔

> ’’ایسا بھی نہیں ہے کہ میر کے یہ اجتہادات، جو روزمرّہ کو شعری جامہ پہنانے کی کوشش کا ایک پہلو ہیں محض لاپروائی، بے فکری کی وجہ سے وقوع میں آئے ہوں۔ ان الفاظ کا دروبست ان کا معنی خیز ہونا، زبان میں کھپ اور گھل مل کر کلام کا نامیاتی حصہ بن جانا۔ یہ باتیں صاف کہہ رہی ہیں کہ شاعر نے الفاظ کو بے تکلف جو استعمال کیا ہے تو ایک تخلیقی منصوبے کے تحت کیا ہے۔‘‘ ۱۴۳

یعنی میر نے اپنا راستہ الگ نکالنے کے لیے اور اپنے انداز کو ایک خاص رنگ دینے کے لیے یہ تخلیقی منصوبہ بنایا کہ پراکرت اور عربی و فارسی الفاظ کو شاعرانہ وسائل کے ساتھ اس طرح باہم مربوط کردیا ہے کہ روزمرہ کی زبان شاعرانہ زبان میں تبدیل ہوگئی اور یہی میر کا عظیم کارنامہ ہے۔

میر اپنی زبان کو روزمرہ سے قریب لانے کے لیے لفظوں کی جمع الگ طریقے سے بناتے ہیں۔ مثلاً ہماریاں، شب کی زاریاں، نگاہیاں، جماہیاں وغیرہ۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے الفاظ، مثلاً تو کیا کیا، کیا کچھ، سبھی، یہاں، ہی، بھی، یہ، وہ، کچھ، وغیرہ کا استعمال بھی انھیں روزمرہ کے نزدیک لے آتا ہے۔ غرض یہ کہ میر نے شاعری کی زبان میں کمال کردکھایا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے مزید لکھا ہے:

> ’’غالب کی زبان میر سے زیادہ بے مثال Unique ہے لیکن محدود معنی میں۔ یعنی غالب نے پراکرت پر فارسی کو حاوی کردیا لیکن دونوں کو آپس میں ضم بھی کردیا۔ یہ کارنامہ کسی سے بھی انجام نہ پایا۔۔۔۔۔۔
>
> لیکن زبان کے پورے سرمایے کا جس قدر خلاقانہ اور بھرپور استعمال میر نے کیا، غالب اس کے اہل نہ تھے صرف اس ایک بات کی بناپر میر کا مرتبہ غالب سے برتر ٹھہرتا ہے۔ میر پوری زبان کے بادشاہ

ہیں، غالب اس کے صرف ایک حصّے کے حکمراں ہیں۔''۱۴۴

شمس الرحمٰن فاروقی جہاں میر کی بادشاہت کا اعلان کرتے ہیں وہیں ایک غیر جانب دار نقاد ہونے کے سبب وہ میر کی خامی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ الفاظ کے وسیع خزانے کو تمام تر استعمال کرڈالنے کے جوش میں میرؔ کبھی کبھی ادھ کچرے استعمالات بھی کر ڈالتے ہیں۔ جس سے ان کے یہاں بھونڈا پن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میرؔ کی اہمیت مسلّم ہے۔

اس سے قبل میرؔ کے جن چار مضامین کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ میرؔ و غالبؔ اور میرؔ کی زبان پر مشتمل تھے۔ جلد اوّل میں شامل پانچویں مضمون کا عنوان ''انسانی تعلقات کی شاعری'' ہے اس مضمون میں فاروقی نے میرؔ کو انسانی رشتوں کے تعلق سے بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میر کے عاشق کردار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''میر کے عاشق کی انفرادیت دراصل یہ ہے کہ وہ روایتی عاشق کی تمام صفات رکھتا ہے، لیکن ہم اس سے ایک انسان کی طرح ملتے ہیں۔ کسی لفظی رسومیات Verbal Convention کے طور پر نہیں۔ یہ انسان ہمیں اپنی دنیا کا باشندہ معلوم ہتا ہے''۔ ۱۴۵

دراصل فاروقی کے نزدیک میر کا عاشق ایک ایسا انسان ہے جس کی رسومیاتی حیثیت مسلّم ضرور ہے مگر ہم اسے محض ایک انسان کی سطح پر دیکھتے ہیں۔ میرؔ کی یہی خوبی ان کے اسلوب سے تجریدیت کم کردیتی ہے۔ میر کے پورے کلام میں ایک ایسے انسان سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ جس کا سابقہ دنیا کی تمام پریشانیوں سے پڑا ہے۔ اس نے جھوٹ، سچ، دکھ سکھ، مسرت اور غم ہر ایک کا سامنا کیا ہے۔ سب کچھ برداشت کیا ہے مگر ہار نہیں مانی ہے۔ اسے عروج و زوال موت و زندگی، ہجر و وصال کسی چیز پر حیرت نہیں ہوتی۔ میرؔ کو جن لوگوں نے قنوطی قرار دیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ ان ناقدین نے میر کے ساتھ انصاف نہیں کیا بلکہ انھوں نے میرؔ کی شخصیت اور ان کے کلام کی عظمت کو محدود کردیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''میر پر یاس پرستی یا سراسر محرومی اور دل شکستگی کا حکم لگانے والے میرؔ کے ساتھ انصاف نہیں کرتے، بلکہ ان کی شخصیت اور

کلام کی عظمت کو محدود کر دیتے ہیں۔ جس شخص کے یہاں ہر چیز اپنی پوری قوت اور اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ موجود ہو اس کو کسی ایک طرف بند کر دینا خود اس کے ساتھ ہی نہیں پوری شاعری کے ساتھ زیادتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کا عاشق اور اس کی پوری شخصیت بھی ان کی زبان ہی کی طرح بے تکلف، چونچال، طباع، پیچیدہ اور متنوع ہے"۱۳۶؎

فاروقی میرؔ کے لیے قائم کردہ ان تمام مفروضات کو رد کرتے ہیں جنھوں نے میرؔ کو یاس و ناامیدی کا شاعر قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ تفصیل سے اس نکتہ پر باب نو میں اظہار خیال کرتے ہیں مگر ان کا یہ اقتباس اس بات کو بڑی وضاحت سے پیش کرتا ہے کہ میرؔ کی شخصیت میں ہمہ گیری ہے۔ وہ ہر چیز سے جڑے ہیں۔ میرؔ کے یہاں تنوع، بے تکلفی اور پیچیدگی سبھی کچھ موجود ہے۔ میرؔ نے عاشق کو انسان بنا کر پیش کیا ہے۔ فاروقی نے میرؔ کے 'عاشق اور معشوق' کو ان کے کلام کی طرح پیچیدہ قرار دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ "انسانی رشتوں کے تعلق سے میر ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انسانی رشتوں کا یہ اظہار ان کی جنسی شاعری میں بھی ہوا ہے۔ فاروقی نے 'چوں خمیر آمد بدست نانبا' کے عنوان سے میرؔ کی جنسی شاعری پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

فاروقی میرؔ کے جنسی اشعار کا تذکرہ میرؔ کے امرد پرستانہ اشعار کے بغیر مکمل نہیں سمجھتے اس لیے وہ عندلیب شادانی کے مضمون "میر صاحب کا ایک خاص رنگ" کا بھی ذکر کرتے ہیں بلکہ فاروقی کے نزدیک میرؔ کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جنسی مضامین کو پیش کرتے وقت رعایت لفظی، ابہام اور استعارے سے کام لیتے ہیں اور حتی الامکان براہِ راست اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ دریائے اعظم عنوان کے تحت لکھے گئے باب میں فاروقی نے لکھا ہے کہ میرؔ کے نزدیک عشق کا اور وسیع استعارہ "دریا" ہے۔ اور وہ بھی ایک مخصوص قسم کا دریا۔

اس باب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اس موقف پر سخت تنقید کی ہے جس کے تحت یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ میر سراپا یاس و حرماں ہیں۔ ان کی شخصیت منفعل اور شکست خوردہ ہے اور اسی لیے ان کے یہاں لہجہ کا دھیما پن، نرمی، آواز کی پستی اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ ہمارے ناقدین نے یہ اثر وکٹوریائی تنقید سے حاصل کیا کہ شاعری دراصل شاعر کے داخلی تجربات کو پیش کرنے کا نام ہے۔ ''شاعر پر جو کچھ گزرتی ہے اس کے اظہار کا فن شاعری ہے'' کیونکہ میرؔ کی زندگی غم واندوہ کا شکار رہی، اسی لیے ہم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ان کی شاعری بھی یاس وحرماں کا مرقع ہوگی۔ خواہ وہ عبدالحق ہوں یا ان کے بعد آنے والے دوسرے نقاد۔ آل احمد سرور نے البتہ ضرور میرؔ کے ''لہجے کی خوش آہنگی اور شیرینی کا ذکر کیا ہے'' مگر وہ پھر بھی میرؔ کے لہجے کی نرمی پر اصرار کرتے ہیں۔ فراقؔ نے بھی میرؔ کے یہاں لہجے کی نرمی کو ہی اہمیت دی مگر مجنوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں۔

> ''میرؔ کے کلام میں جو آہنگ ہمیں ملتا ہے وہ اس کلام کے معنی سے الگ نہیں لیکن جو معنی اس کلام میں ملتے ہیں۔ وہ اس آہنگ سے بھی الگ نہیں جو میرؔ کے کلام میں ہے۔ لہٰذا اگر میرؔ کا آہنگ دھیما، انفعالی اور نرم رو نہیں ہے (اور ہر گز نہیں ہے) تو ان کے کلام میں جو معنی ہیں ان کو بھی ہم دھیما، انفعالی اور نرم رو نہیں کہہ سکتے یہ بات خود مجنوں صاحب کے قول سے ثابت ہے کہ میرؔ کو جو لوگ ''شکست خوردہ اور یاس پرست'' سمجھتے ہیں وہ دھوکے میں ہیں۔'' ۱۴۷

شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں میرؔ کا زمانہ بڑی حد تک زبانی Oral روایت کا تھا۔ اس لیے میرؔ کا کلام شور انگیز ہے۔ کیونکہ اس دور میں چھاپے خانے کا رواج نہ تھا، خود میرؔ کا کلیات ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ اسی لیے میرؔ کے اشعار میں شعر کو آواز بلند پڑھنے اور دوسروں کی زبان سے اس کے سننے کا التذاذ کرنا ہوتا۔ اسی لئے شعر کا زبانی پڑھا جانا، اور خود میرؔ کا بار بار یہ کہنا کہ ان کا کلام پر شور ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ میرؔ کا کلام ٹھہرے ہوئے اور نرم آہنگ کا نہیں ہے روانی بھی میرؔ کے اشعار کی اہم خصوصیت ہے۔

مختصراً یہ کہ شعرِ شور انگیز جلد اول کا مطالعہ ہمیں ایک نئے میرؔ سے روشناس کراتا ہے۔ یہ میرؔ وہ میرؔ نہیں جس سے ہم مروج کتابوں کے ذریعہ آشنا ہیں یعنی میرؔ کی شاعری کے

بارے میں جو تصوّرات رائج ہیں۔ وہ ان تصوّرات سے بالکل متغائر اور مختلف ہیں جو اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔ سب سے بنیادی فرق یہ ہے کہ میرؔ کی شاعری میں جو شخصیت نظر آتی ہے وہ ضروری نہیں اس تاریخی شخص کی ہو جس کا نام محمد تقی میرؔ تھا۔ میرؔ کے متعلق جو Stereotype رائج تھے کہ میرؔ بہت شکست خوردہ تھے اسی لیے ان کی شاعری غم و الم میں ڈوبی ہوئی ہے یا میرؔ بہت بد دماغ تھے۔ وکٹوریائی تنقید کے زیر اثر پیدا ہوئے ان تمام مفروضات سے شعرِ شور انگیز میں اجتناب کیا گیا ہے۔ خود شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ ''شعرِ شور انگیز جلد اوّل کے مطالعے نے اس مقبول مگر سراسر غلط مفروضے کو منہدم کرنے میں کچھ مدد دی ہوگی''۔

شعرِ شور انگیز کی جلد دوم ۱۹۹۱ میں شائع ہوئی یہ جلد ردیف 'ب' سے ردیف 'م' تک کے انتخابی اشعار اور ان کے مفصل تجزیے پر مبنی ہے۔ جلد اوّل کے مبسوط دیباچہ کا مرکز و محور میرؔ کا کلام تھا۔ جلد دوم میں ''معنی کے معنی'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سے مربوط مسئلہ ''منشاء مصنف'' کا ہے یہ ایک اہم سوال ہے کہ مقصودِ مصنف کا تعین کیسے کیا جائے؟ کیا کسی فن پارے میں صرف ایک ہی معنوی جہت ہوئی ہے یا متعدد جہات ہوئی ہیں؟ کیا فن پارے میں ایسا مفہوم بھی ہوسکتا ہے جس کی خود مصنف کو خبر نہ ہو۔ کیا معنی پر اجارہ مصنف کا ہے یا مصنف صرف الفاظ پیش کر دیتا ہے اور معنی اس میں قاری کا ذہن اور ذوق ڈالتے ہیں۔

بقول نثار احمد فاروقی:

> ''یہ اور ایسے بہت سے بنیادی اور فروعی سوالات مشرقی و مغربی روشنی میں فاروقی نے حل کیے ہیں۔ ان کے بعض نتائج سے اختلاف ممکن ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ مباحث پوری وضاحت اور سنجیدگی کے ساتھ فاروقی نے پہلی بار اُردو میں پیش کئے ہیں۔ ان سے برسوں تک استفادہ کیا جائے گا۔ ۱۴۸''

خود شمس الرحمٰن فاروقی جلد دوم کی تمہید میں اپنے اس مقصد پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اس جلد کے نسبتاً مختصر دیباچے میں ایک اہم اصولی

بحث کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بحث یہ ہے کہ کیا کسی متن کے معنی
اس متن کے بنانے والے کے تابع ہوتے ہیں؟ کیا منشائے
مصنف کو متن کے معنی میں کوئی اہمیت حاصل ہے؟ کیا یہ ضروری
ہے کہ کسی متن کے جو معنی بیان کیے ہیں۔ ان کے بارے میں ہم
یہ ثابت کرسکیں (یا اگر ثابت نہ کرسکیں تو قیاس کرسکیں) کہ یہی
معنی مرادِ مصنف تھے؟" ۱۳۹؎

پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے "شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری" سے بحث کرتے ہوئے تفہیم میرؔ کے سلسلے میں ایک اہم نکتہ کی نشاندہی کی ہے شمس الرحمٰن فاروقی کے نقطۂ نظر کے بارے میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ وہ جدیدیت، نئی تنقید اور اُردو کی کلاسیکی شعری روایات کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرتے ہیں لیکن مطالعۂ میرؔ کے سلسلے میں پروفیسر عقیل صدیقی نے ان کے اپروچ (Approach) میں ایک خاص تبدیلی محسوس کی جس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔یہی کلاسیکیت انھیں کلاسیکی شعراء کے مطالعے کی
طرف لے گئی اس باب میں وہ میر کے ہمنوا ہوئے اور انھوں نے میر
کی رفاقت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا وہ میرؔ کی عظمت کے سدا سے قائل
تھے اور اسالیب شعر کی درجہ بندی میں سوداؔ کے طرز خاص کے
مدمقابل میرؔ کو بھی طرز کا موجد قرار دے چکے ہیں۔۔۔۔میر کے
مطالعے میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی ہے وہ نظری (Theoretical)
زیادہ ہے عملی کم۔ انھوں نے اپنے سابقہ رویہ کو اس حد تک ضرور
بدل لیا ہے کہ اب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ادب ایک سماجی تعمیر
(Social Construct) ہے۔ کلاسیکی شعریات کا اپنا امتیاز ہے
اپنے اصول ہیں جن کی رہنمائی میں کلاسیکی شاعروں نے تخلیقی سفر
جاری رکھا کلاسیکی شعریات کی علاحدہ ممتاز حیثیت تسلیم کرنے کے
یہ معنی ہیں کہ اب فاروقی "عہد جدیدیت" کے غیر تاریخی رجحان کو
خیر باد کہہ رہے ہیں اور Social Conditionning کے حق

میں اپنی رائے دے رہے ہیں''۔ ۱۵۰؎

اس طرح پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے میر کے حوالے سے تنقید میں جو نیا طریقہ کار آیا اس پر صرف اظہارِ خیال ہی نہیں کیا بلکہ نئی تنقید سے Social conditioning تک جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی نشاندہی بھی کی۔

شعرِ شور انگیز کی تیسری اور چوتھی جلد میں کلاسیکی غزل کی شعریات پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے جو شمس الرحمٰن فاروقی نے انجام دیا اس لیے کہ حالی کے بعد ترقی پسند تحریک کے تحت جو شعریات رائج ہوئی اس میں ہیئت اور اسلوب کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی جتنا زور مواد و موضوع پر دیا گیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کلاسیکی غزل کی شعریات کا ایک معیار مقرر کیا اور اس پر میر کی شاعری کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی جو یقیناً میر شناسی یا نقدِ میر میں ایک نئی کوشش ہے۔

نقدِ میر کا جائزہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ تقریباً تمام تنقیدی نظریات سے میر کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ تاریخی، سماجی، جمالیاتی، نفسیاتی غرض ہر اندازِ نقد سے کلام میر سے نئے نئے معنی اخذ کیے گئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعرِ شور انگیز لکھ کر نقدِ میر کو نئی فکر دی۔ شعرِ شور انگیز کے مقدمات تفہیم میر کے سلسلے میں سنگِ میل ثابت ہوئے۔ تقریباً تمام ناقدین نے ان مقدمات کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ مگر ادب میں کبھی کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہوتا لہٰذا جہاں ان مقدمات کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا وہیں ایک نئی بحث کا آغاز بھی ہوا کہ آخر ان مقدمات کی تشریحات میر میں کیا اہمیت ہے؟ یا ان مقدمات کے بغیر بھی میر کو سمجھا جا سکتا ہے۔

پروفیسر انیس اشفاق کا مضمون ''میر و غالب کی تعبیریں اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مقدمات'' اسی سلسلے کی کڑی ہے اور کچھ ایسے ہی نکات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

انیس اشفاق ان مقدمات کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے، ان کے خیال میں ان مقدمات میں قدیم و جدید شعریات کا ایسا زبردست سنگم ہے جو ہماری شاعری کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے مگر جہاں تک کلام میر کا سوال ہے یہ مقدمات میر کے کلام کی تشریح میں سنگِ میل کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کے خیال میں فاروقی نے جس وقت غالب کے اشعار کی تشریح شروع کی وہ زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ اس وقت انھوں نے کسی شعریات سے کام نہیں لیا۔

غالبؔ کی تشریحات ۱۹۶۸ء سے شب خون میں شائع ہونا شروع ہوئیں اور تقریباً بیس سال تک شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۸۹ء میں انھیں ''تفہیم غالبؔ'' کے عنوان سے دیباچے کے ساتھ پیش کیا گیا۔ تفہیم غالبؔ کے بعد شعرِ شور انگیز ۱۹۹۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ انیس اشفاق یہ سوال کرتے ہیں کہ تفہیم غالبؔ کے شائع ہونے سے قبل غالب پر فاروقی کے مضامین ایک طویل عرصہ تک شائع ہوتے رہے اور جب ساری تشریحات کو ایک ساتھ کتابی شکل میں پیش کیا گیا تب اس پر دیباچہ لکھا گیا اس کا مطلب تو یہی ہے کہ پہلے سے غالب کی تفہیم کے لیے کسی قسم کے اصول متعین نہیں کیے گئے، تفہیم غالبؔ کے بعد ''شعر شور انگیز'' اپنے مقدمات کے ساتھ منظر عام پر آئی، ایسے میں بقول انیس اشفاق یہی کہا جاسکتا ہے کہ ''تفہیم غالبؔ کا دیباچہ ''شعرِ شور انگیز'' کا زائیدہ ہے''۔ ''شعر شور انگیز'' کے مقدمات انیس اشفاق کے خیال میں انفرادی طور پر تو بے حد اہم ہیں مگر کلام میرؔ کی تشریح وتفسیر میں ان کی اتنی اہمیت نہیں۔ اگر یہ مقدمات نہیں بھی لکھے گئے ہوتے تب بھی فاروقی نے تشریح میرؔ کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس سے پہلے ناقدین کی ہی طرز پر ہے۔ انیس اشفاق نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

> ''مقدمات قائم کرنے کے باوجود فاروقی میرؔ کے شعروں کو مقدمات کی مدد سے نہیں بلکہ اسی طریق کار سے سمجھ رہے ہیں جو مقدمات کے بغیر غالبؔ کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ فاروقی کے مقدمات اپنی آزادانہ حیثیت میں اہم مباحث کا مجموعہ ہیں۔ اس مفروضے کو منہدم کرنے کی کوشش میں کہ غالبؔ کی طرح میرؔ لائق فہم شاعر نہیں ہیں۔ فاروقی نے نئی بصیرتوں سے کام لے کر پیچیدہ ادبی نظریوں کو حل کر لینے کا ہنر دکھایا ہے اور قدیم و جدید نقطہ ہائے نظر کی یکجائی کے ذریعہ اس شعریات کو مرتب کیا ہے جو شاعری کے بہت سے مسئلوں کی وضاحت میں معاون ہوسکتی ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن اپنے ہدف تک آتے آتے یہ مقدمات برطرف ہوجاتے ہیں، شرحوں کا جائزہ اس کی نفی کرتا ہے اور میرؔ کی تعبیر کے مطالعے میں ہم سوچنے لگتے ہیں کہ

> میر کے مفاہیم کو سمجھانے کے لیے ان مقدمات کی کیا ضرورت تھی، انھیں تو فاروقی اِن کے بغیر بھی سمجھا سکتے تھے جیسے انھوں نے غالبؔ کو سمجھایا ہے''۔[۱۵]

مندرجہ بالا اقتباس اس نکتہ کی طرف واضح طور سے اشارہ کر رہا ہے کہ فاروقی نے کلام میرؔ کو سمجھنے کے لیے اپنے تحریر کردہ مقدمات سے مدد نہیں لی ہے اور فاروقی میر کے اشعار کی تفہیم ان مقدمات کے بغیر بھی کر سکتے تھے۔ ان مباحث نے شعرِ شور انگیز کے مقدمات پر ایک سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔ یہ بات طویل بحث کا موضوع ہو سکتی ہے کہ آیا؟ ان مقدمات کے بغیر بھی ہم میرؔ کو سمجھ سکتے ہیں؟ حالانکہ انیس اشفاق کی رائے اور اُن کے دلائل خاصے اہم ہیں لیکن اس کے باوجود بھی میر پر لکھے گئے مقدمات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

حـــــــواشـــــــی:

۱۔ صفدر آہ۔ فلسفۂ میرؔ پیش لفظ۔ صفدر آہ صفحہ۔ ۷۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۲۔ صفدر آہ۔ فلسفۂ میرؔ۔ صفحہ۔ ۳۵۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۳۔ صفدر آہ۔ فلسفۂ میرؔ۔ صفحہ۔ ۱۷۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۴۔ صفدر آہ۔ فلسفۂ میرؔ۔ صفحہ۔ ۱۴۴۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۵۔ صفدر آہ۔ فلسفۂ میرؔ۔ صفحہ۔ ۱۵۱۔ جولائی ۱۹۳۶ء

۶۔ صفدر آہ۔ میرؔ اور میریات۔ پیش لفظ۔ صفحہ ۷۔ جنوری ۱۹۷۲ء اجمل پریس بلڈنگ رحمت اللہ روڈ بمبئی

۷۔ صفدر آہ۔ میرؔ اور میریات۔ صفحہ ۲۲۴۔ جنوری ۱۹۷۲ء اجمل پریس بلڈنگ رحمت اللہ روڈ بمبئی

۸۔ صفدر آہ۔ میر اور میریات۔ صفحہ ۳۶۔ جنوری ۱۹۷۲ء اجمل پریس بلڈنگ رحمت اللہ روڈ بمبئی

۹۔ کلیم الدین احمد۔ اُردو شاعری پر ایک نظر۔ پرانی شاعری حصہ اوّل ص۔ ۱۳۰۔ بک امپوریم، سبزی منڈی پٹنہ ۱۹۸۵ء

۱۰۔ کلیم الدین احمد۔ اُردو شاعری پر ایک نظر۔ پرانی شاعری حصہ اوّل ص۔ ۱۳۰۔ بک امپوریم، سبزی منڈی پٹنہ ۱۹۸۵ء

۱۱۔ نثار احمد فاروقی۔ دلی کالج میگزین میرؔ نمبر، ص ۱۲۔ ۱۹۶۲ء کوہِ نور پریس لال کنواں دلی۔

۱۲۔ ڈاکٹر خورشید احمد نقدِ میرؔ کے سو سال۔ متن و معنی صفحہ ۶۳۔ رائل پرنٹرس، دودھ پور علی گڑھ۔ ۲۰۰۱ء

۱۳۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ مزامیر۔ مقدمہ جلد اوّل صفحہ۔ ۶۔ ۱۹۴۷۔ کتابی دنیا لمیٹیڈ دہلی۔

۱۴۔ جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی۔ مزامیر۔ مقدمہ جلد اوّل صفحہ ۶۔ ۱۹۴۷۔ کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی۔

۱۵۔ جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی مقدمہ مزامیرؔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۵ کتابی دنیا لمیٹڈ۔ ۱۹۴۷ء

۱۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نقدِ میر صفحہ ۳۶۳۔ آئینہ ادب لاہور ۱۹۵۸ء

۱۷۔ جعفر علی خاں اثرؔ۔ مقدمہ مزامیر۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۲۔ ۳۱ کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی ۱۹۴۷ء

۱۸۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میر حیات اور شاعری۔ صفحہ ۴۸۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ جولائی ۱۹۵۴ء

۱۹۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ پیش لفظ۔ نشاط پریس ٹانڈہ۔ فیض آباد۔ یوپی۔ ۱۹۸۳ء

۲۰۔ بحوالہ خواجہ احمد فاروقی۔ میرؔ حیات اور شاعری صفحہ ۱۸۴۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۱۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میرؔ حیات اور شاعری صفحہ ۲۲۹۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۲۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میرؔ حیات اور شاعری صفحہ ۲۳۷۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۳۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میرؔ حیات اور شاعری صفحہ ۳۲۶۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۴۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میرؔ حیات اور شاعری صفحہ ۳۴۲۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۵۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میرؔ حیات اور شاعری صفحہ ۲۳۰۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۶۔ خواجہ احمد فاروقی۔ میرؔ حیات اور شاعری صفحہ ۳۹۶۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۷۔ سید عبداللہ، نقدِ میر صفحہ ۳۶۳۔ آئینہ ادب لاہور ۱۹۵۸ء

۲۸۔ نثار احمد فاروقی۔ تلاشِ میرؔ صفحہ ۶۱۔ ثمر آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۹۴ء

۲۹۔ قاضی عبدالودود میرؔ صفحہ ۲۵۴۔ پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج، پٹنہ۔ ۱۹۹۵ء

۳۰۔ قاضی عبدالودود۔ میرؔ ضمیمہ۔ صفحہ۔ ۳۸۵۔ پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج، پٹنہ۔ ۱۹۹۵ء

۳۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ میں اور میر۔ نقدِ میرؔ صفحہ ۳۶۴ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۳۲۔ ابوالکلام قاسمی۔ میر تنقید اور تنقیدی رویے۔ صفحہ ۹۳۔ ماخوذ۔ از غالب نامہ میر تقی میر۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۳۳۔ سید عبداللہ نقدِ میر۔ صفحہ ۲۹۳۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۳۴۔ ڈاکٹر خورشید احمد۔ نقدِ میرؔ کے سو سال۔ متن و معنی۔ صفحہ ۶۳۔ ۶۲۔ رائل پرنٹرس دودھ پور۔ علی گڑھ۔ ۲۰۰۱ء

۳۵۔ سید عبداللہ۔ نقدِ میرؔ صفحہ ۵۶۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۳۶۔ سید عبداللہ۔ نقدِ میرؔ صفحہ ۱۳۵۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۳۷۔ سید عبداللہ۔ نقدِ میرؔ صفحہ ۲۱۰۔ ۲۰۹۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۳۸۔ سید عبداللہ۔ نقدِ میرؔ صفحہ ۱۹۳۔ ۱۹۲۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۳۹۔ سید عبداللہ۔ نقدِ میرؔ صفحہ ۲۰۱۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۴۰۔ سید عبداللہ۔ نقدِ میرؔ صفحہ ۲۰۳۔ ۲۰۲۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۴۱۔ قاضی افضال حسین میر کی شعری لسانیات۔ پیش لفظ۔ نشاط پریس ٹانڈہ۔ فیض آباد یوپی۔ ۱۹۸۳ء

۴۲۔ قاضی افضال حسین میر کی شعری لسانیات۔ صفحہ ۱۲۸۔۱۲۷۔ نشاط پریس ٹانڈہ، فیض آباد یوپی۔ ۱۹۸۳ء

۴۳۔ سید عبداللہ۔ نقدِ میر صفحہ ۲۰۳۔۲۰۲۔ آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۴۴۔ گوپی چند نارنگ۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات صفحہ۔ ۱۰۳۔ فوٹو آفسیٹ پریس پرنٹرز دہلی۔

۴۵۔ نثار احمد فاروقی۔ میر تقی میر۔ صفحہ۔ ۱۷۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی پہلا ایڈیشن۔ جنوری، مارچ، ۱۹۸۵ء

۴۶۔ نثار احمد فاروقی۔ تلاشِ میر۔ حرف آغاز۔ خلیق انجم۔ صفحہ۔ ۹۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۴۷۔ نثار احمد فاروقی دتی کالج میگزین۔ صفحہ ۹۔ کوہ نور پریس لال کنواں دتی۔ ۱۹۶۲ء

۴۸۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۲۷۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۴۹۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۵۵۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۰۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۵۸۔۵۹۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۱۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۶۰۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۲۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۲۸۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۳۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۳۰۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۴۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۳۲۔۳۰۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۵۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۳۳۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۶۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۳۲۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۷۔ نثار احمد فاروقی تلاشِ میر۔ صفحہ۔ ۵۸۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ ۱۹۹۴ء

۵۸۔ نثار احمد فاروقی میر تقی میر۔ صفحہ۔ ۳۳۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء

۵۹۔ نثار احمد فاروقی میر تقی میر۔ صفحہ۔ ۸۶۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء

۶۰۔ شافع قدوائی۔ تفہیم میر اور حسن عسکری۔ غالب نامہ۔ صفحہ۔ ۱۵۹۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۶۱۔ محمد حسن عسکری۔ میر جی۔ جھلکیاں۔ صفحہ۔ ۵۱۔۷۔۱۹۴۷ء

۶۲۔ ابوالکلام قاسمی غالب نامہ میر تقی میر نمبر صفحہ۔ ۹۶۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۶۳۔ حسن عسکری۔ میر جی۔ جھلکیاں۔ صفحہ۔ ۵۶۔۷۔۱۹۴۷ء

۶۴۔ حسن عسکری۔ رسالہ ساقی۔ میر نمبر۔ صفحہ ۱۶۔ جون ۱۹۴۵ء

۶۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ شعر شور انگیز۔ جلد اول۔ ص۔ ۱۶۔ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان ۱۹۹۰ء

۶۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ شعر شور انگیز۔ جلد اول ص۔ ۲۷۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۹۰ء

۶۷۔ حسن عسکری میر اور نئی غزل (۲) صفحہ۔ ۹۔۱۷۔ افکار میر۔ ۱۹۶۷ء

۶۸۔ ناصر کاظمی۔دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف۔بحوالہ انتخاب میرؔ۔مرتب باصر کاظمی۔صفحہ۔۳۷۔۳۶۔۱۹۸۹ء
۶۹۔ ناصر کاظمی۔دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف۔بحوالہ انتخاب میرؔ۔مرتب باصر کاظمی۔صفحہ۔۳۰۔۲۹۔۱۹۸۹ء
۷۰۔ ناصر کاظمی۔دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف۔بحوالہ انتخاب میرؔ۔مرتب باصر کاظمی۔صفحہ۔۳۹۔۳۸۔۱۹۸۹ء
۷۱۔ شیخ صلاح الدین ناصر کاظمی ایک دھیان میں۔بحوالہ انتخاب میرؔ میر باصر کاظمی تعارف صفحہ۔۹۔۱۹۸۹ء
۷۲۔ ناصر کاظمی۔میرؔ ہمارے عہد میں۔صفحہ۔۲۲۹۔۲۲۸۔
۷۳۔ ناصر کاظمی بنائے تازہ رسالہ سویرا نمبر ۱۹۔۲۱۔۲۶۵۔۲۶۴۔
۷۴۔ ناصر کاظمی۔میرؔ ہمارے عہد میں ماخوذ از میر تقی میرؔ عالمی سمنار کینیڈا۔صفحہ۔۳۰۔۲۲۹۔مارچ ۲۰۰۰ء
۷۵۔ ناصر کاظمی۔میرؔ ہمارے عہد میں۔بحوالہ از میر تقی میرؔ عالمی سمنار کینیڈا۔صفحہ۔۲۳۵۔مارچ ۲۰۰۰ء
۷۶۔ ناصر کاظمی۔میرؔ ہمارے عہد میں ماخوذ از میر تقی میرؔ عالمی سمنار کینیڈا۔صفحہ۔۲۲۷۔مارچ ۲۰۰۰ء
۷۷۔ فراق گورکھپوری۔میرؔ کی عالمگیر مقبولیت۔صفحہ۔۱۵۹۔ماخوذ از افکار میرؔ۔ایم حبیب خاں۔لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج۔دہلی دسمبر ۱۹۶۷ء
۷۸۔ فراق گورکھپوری۔میرؔ کی عالمگیر مقبولیت۔صفحہ۔۱۶۰۔ماخوذ از افکار میرؔ۔ایم حبیب خاں۔لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج۔دہلی دسمبر ۱۹۶۷ء
۷۹۔ فراق گورکھپوری۔میرؔ کی عالمگیر مقبولیت۔صفحہ۔۱۶۶۔ماخوذ از افکار میرؔ۔ایم حبیب خاں۔لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج۔دہلی دسمبر ۱۹۶۷ء
۸۰۔ ابوالکلام قاسمی میرؔ تنقید اور تنقیدی رویے۔ ماخوذ از غالب نامہ میرؔ نمبر۔صفحہ۔۹۴۔غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی۔ جولائی ۲۰۰۰ء
۸۱۔ فراق گورکھپوری۔میرؔ کی عالمگیر مقبولیت۔صفحہ ۱۶۸۔ماخوذ از افکار میرؔ۔ایم حبیب خاں۔لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج۔دہلی دسمبر ۱۹۶۷ء
۸۲۔ فراق گورکھپوری ”میرؔ کی شاعری کے کچھ پہلو“ ماخوذ از نقوش میر نمبر۔صفحہ ۲۸۸۔۲۸۶۔۲۸۲۔۲۸۱۔ادارہ فروغ اردو لاہور۔نومبر ۱۹۸۰ء
۸۳۔ شبیہہ الحسن نونہروی۔میرؔ کے نہاں خانے۔صفحہ ۱۶۹۔ماخوذ از تنقید و تحلیل۔ادارہ فروغ اردو لکھنؤ مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔۱۹۵۸ء
۸۴۔ شبیہہ الحسن نونہروی۔میرؔ کے نہاں خانے۔صفحہ۔۱۷۵۔ماخوذ از تنقید و تحلیل۔ادارہ فروغ اردو لکھنؤ مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔۱۹۵۸ء
۸۵۔ شبیہہ الحسن نونہروی۔میرؔ کے نہاں خانے۔صفحہ۔۱۷۱۔ماخوذ از تنقید و تحلیل۔ادارہ فروغ اردو لکھنؤ مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔۱۹۵۸ء

۸۶۔ سلیم اختر، ''میر تقی میرؔ'' دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب۔ صفحہ ۱۶۷۔ ماخوذ از غالب نامہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ۔دہلی۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۸۷۔ سلیم اختر، ''میر تقی میرؔ'' دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب۔ صفحہ ۱۷۰۔۱۶۹۔ ماخوذ از غالب نامہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ۔دہلی۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۸۸۔ سلیم اختر، ''میر تقی میرؔ'' دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب۔ صفحہ ۱۷۰۔ ماخوذ از غالب نامہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ۔ دہلی۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۸۹۔ سلیم اختر، ''میر تقی میرؔ'' دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب۔ صفحہ ۱۷۵۔ ماخوذ از غالب نامہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ۔دہلی۔ جولائی ۲۰۰۰ء

۹۰۔ خالد سہیل، میرؔ کا فن اور پاگل پن، صفحہ۔ ۳۵۔ ماخوذ از میر تقی میرؔ عالمی سمنار۔ مرتب اطہر رضوی ٹورنٹو، کینیڈا۔ مارچ۔ ۲۰۰۰ء ایلائنڈ ٹریڈرس نئی دہلی۔

۹۱۔ خالد سہیل، میرؔ کا فن اور پاگل پن، صفحہ۔ ۴۵۔ ماخوذ از میر تقی میرؔ عالمی سمنار۔ مرتب اطہر رضوی ٹورنٹو، کینیڈا۔ مارچ۔ ۲۰۰۰ء ایلائنڈ ٹریڈرس نئی دہلی۔

۹۲۔ خالد سہیل، میرؔ کا فن اور پاگل پن، صفحہ۔ ۴۵۔ ماخوذ از میر تقی میرؔ عالمی سمنار۔ مرتب اطہر رضوی ٹورنٹو، کینیڈا۔ مارچ۔ ۲۰۰۰ء ایلائنڈ ٹریڈرس نئی دہلی۔

۹۳۔ محمد عمر۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، میرؔ کا عہد، صفحہ اوّل۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۳ء

۹۴۔ محمد عمر۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، میرؔ کا عہد، صفحہ۔ ۴۸۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۳ء

۹۵۔ محمد عمر۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، میرؔ کا عہد، صفحہ۔ ۴۸۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۳ء

۹۶۔ محمد عمر۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، میرؔ کا عہد، صفحہ۔ ۱۸۷۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۳ء

۹۷۔ محمد عمر۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، میرؔ کا عہد، صفحہ۔ ۱۸۸۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۳ء

۹۸۔ حامدی کاشمیری۔ انتخاب غزلیات میرؔ صفحہ۔ ۱۶۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۹۹۔ حامدی کاشمیری۔ کارگہہ شیشہ گری۔ میر تقی میرؔ کا مطالعہ۔ صفحہ۔ ۱۹۔ جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی ۱۹۸۲ء

۱۰۰۔ حامدی کاشمیری۔ کارگہہ شیشہ گری۔ میر تقی میرؔ کا مطالعہ۔ صفحہ۔ ۱۸۔ جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی ۱۹۸۲ء

۱۰۱۔ حامدی کاشمیری۔ انتخاب غزلیات میرؔ صفحہ۔ ۱۳۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۱۰۲۔ حامدی کاشمیری۔ کارگہہ شیشہ گری۔ میر تقی میرؔ کا مطالعہ۔ صفحہ۔ ۲۳۔ جے کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی ۱۹۸۲ء

۱۰۳۔ حامدی کاشمیری۔ انتخاب غزلیات میرؔ صفحہ۔ ۱۱۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۱۰۴۔ کنج کاوی جو کی سینے نے غم ہجراں کی۔ اس دفینے سے اقسام جواہر نکلا

۱۰۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ شعر شور انگیز۔ جلد اوّل۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ۱۹۹۹ء

۱۰۶۔ جمیل جالبی، محمد تقی میرؔ، صفحہ۔۱۷۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۱۹۸۳ء

۱۰۷۔ جمیل جالبی، محمد تقی میرؔ، صفحہ۔۹۳۔۹۲۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۱۹۸۳ء

۱۰۸۔ جمیل جالبی، محمد تقی میرؔ، صفحہ۔۱۰۳۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۱۹۸۳ء

۱۰۹۔ جمیل جالبی، محمد تقی میرؔ، صفحہ۔۱۰۵۔۱۰۴۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۱۹۸۳ء

۱۱۰۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ محمد تقی میرؔ صفحہ۔۱۰۹۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔۱۹۸۳ء

۱۱۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ محمد تقی میرؔ صفحہ۔۹۳۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔۱۹۸۳ء

۱۱۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ محمد تقی میرؔ صفحہ۔۱۲۶۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔۱۹۸۳ء

۱۱۳۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ پیش لفظ۔ صفحہ۔۱۔۲۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۱۴۔ قاضی افضال حسین۔ انتخاب غزلیات میرؔ۔ ص۔۱۱۔ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۴ء

۱۱۵۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ صفحہ۔۵۷۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۱۶۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ صفحہ۔۶۲۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۱۷۔ قاضی افضال حسین۔ انتخاب غزلیات میرؔ۔ ص۔۱۱۔ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۴ء

۱۱۸۔ قاضی افضال حسین۔ انتخاب غزلیات میرؔ۔ ص۔۱۲۔ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۴ء

۱۱۹۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ صفحہ۔۹۰۔۸۵۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۲۰۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ صفحہ۔۱۳۰۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۲۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ شعر شور انگیز۔ جلد اوّل۔ صفحہ۔۶۲۔ ترقی اردو بیورو، دہلی ۱۹۹۰ء

۱۲۲۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ صفحہ۔۱۳۹۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۲۳۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ صفحہ۔۲۳۲۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۲۴۔ قاضی افضال حسین۔ میرؔ کی شعری لسانیات۔ صفحہ۔۱۱۷۔ نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد یوپی ۱۹۸۳ء

۱۲۵۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میرؔ۔ صفحہ۔۱۲۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۲۶۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میرؔ۔ صفحہ۔۲۲۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۲۷۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میرؔ۔ صفحہ۔۲۶۔۲۵۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۲۸۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میرؔ۔ صفحہ۔۳۹۔۳۸۔۳۷۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۲۹۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میرؔ۔ صفحہ۔۶۰۔۵۹۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۳۰۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میرؔ۔ صفحہ۔۶۷۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۳۱۔ رشید احمد صدیقی۔ دلّی کالج میگزین میرؔ نمبر خطوط۔ صفحہ۔۲۳۔ مرتبہ نثار احمد فاروقی کوہِ نور پریس دلی ۱۹۶۲ء

۱۳۲۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میرؔ۔ صفحہ۔۴۷۔۳۷۔ ناز آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۳۲۔ مجیب عارفی۔میر تقی میر اور آج کا ذوقِ شعری۔صفحہ۔۱۵۔نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی۔۱۹۸۹ء

۱۳۳۔ مجیب عارفی۔میر تقی میر اور آج کا ذوقِ شعری۔صفحہ۔۴۲۔نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی۔۱۹۸۹ء

۱۳۴۔ مجیب عارفی۔میر تقی میر اور آج کا ذوقِ شعری۔صفحہ۔۳۵۸۔نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی۔۱۹۸۹ء

۱۳۵۔ فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد دوم۔صفحہ۔۳۹۵۔ترقی اردو بیورو،دہلی ۱۹۹۲ء

۱۳۶۔ علی سردار جعفری،ہم دونوں میر کے عاشق ہیں۔صفحہ۔۸۱مشمولہ رسالہ کتاب نما نومبر۱۹۹۴ء

۱۳۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۳۵۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۳۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۳۹۔۳۶۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۳۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۶۱۔۵۹۔۵۵۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۴۲۔۴۱۔ترقومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۶۵۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۷۷۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۷۸۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۱۰۲۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۱۱۲۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۱۱۳۔۱۱۴۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر شور انگیز۔جلد اوّل۔صفحہ۔۲۰۹۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۰ء

۱۴۸۔ کتاب نما۔شمس الرحمٰن فاروقی،فاروقی شخصیت اور ادبی خدمات۔صفحہ۔۹۷۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۱۹۹۴

۱۴۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی،تمہید شعر شور انگیز۔جلد دوم۔صفحہ۔۲۹۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ۱۹۹۱ء

۱۵۰۔ پروفیسر عقیل احمد صدیقی،تعبیر و تنقید،مشمولہ علم شرح تعبیر اور تدریسِ متن مرتبہ پروفیسر نعیم احمد صفحہ۔
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

۱۵۱۔ پروفیسر انیس اشفاق۔میر و غالب کی تعبیریں اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مقدمات رسالہ آئندہ
کراچی۔ مدیر محمود واجد جلد۱۲ شمارہ ۳۸۔اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء صفحہ۔۱۹

باب پنجم

میرؔ پر مختلف رسائل کے خاص نمبر، مضامین کے مجموعے، اور متفرق مضامین

خاص نمبر

۱۔ نیرنگ (ماہنامہ) میر تقی میرؔ نمبر جولائی ۱۹۲۸ء
۲۔ ساقی (ماہنامہ) میر تقی میرؔ نمبر ستمبر ۱۹۵۸ء
۳۔ دلی کالج میگزین، میر تقی میرؔ نمبر نومبر ۱۹۶۲ء
۴۔ نقوش، شمارہ ۱۲۵، میر تقی میرؔ نمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء
۵۔ نقوش، شمارہ ۱۲۶، میر تقی میرؔ نمبر نومبر ۱۹۸۰ء
۶۔ نقوش شمارہ ۱۳۱، میر تقی میرؔ نمبر اگست ۱۹۸۳ء
۷۔ آجکل، شمارہ ۸، میر تقی میرؔ نمبر مارچ ۱۹۸۴ء
۸۔ غالب نامہ، شمارہ ۲، میر تقی میرؔ جولائی ۲۰۰۰ء

مضامین کے مجموعے

۱۔ حدیثِ میر نومبر ۱۹۶۷ء
۲۔ افکارِ میرؔ دسمبر ۱۹۶۷ء
۳۔ میر تقی میرؔ عالمی سیمینار (کینیڈا) مارچ ۲۰۰۰ء
۴۔ میر تقی میر تنقیدی و تحقیقی جائزے۔ سال اشاعت ۲۰۰۰ء

کلیات

۱۔ مقدمہ کلیات میرؔ، عبدالباری آسی اکتوبر ۱۹۴۰ء
۲۔ مقدمہ کلیات میرؔ، ظلِ عباس عباسی ۱۹۶۸ء
۳۔ مقدمہ کلیات میرؔ، سید احتشام حسین ۱۹۷۲ء
۴۔ مقدمہ دیوان میرؔ، ڈاکٹر اکبر حیدری ۱۹۷۳ء
۵۔ فرہنگ کلیات میر، فرید احمد برکاتی ۱۹۸۸ء

☆ متفرق مضامین

نقدِ میرؔ کے سلسلے کی ایک اہم کڑی اُردو رسائل کے وہ خاص نمبر ہیں جو وقتاً فوقتاً میرؔ کی شخصیت اور فن کے بارے میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان خاص نمبروں کا سلسلہ ۱۹۲۸ء میں ماہنامہ نیرنگ کے میرؔ نمبر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان کے عرصہ میں میر پر مضامین تو ضرور شائع ہوئے ہوں گے لیکن کوئی خاص نمبر نہیں شائع ہوا۔ اس زمانے کے تاریخی اور سماجی حالات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ زمانہ آزادی کی جدوجہد اور شدید سیاسی وسماجی کشمکش کا زمانہ تھا۔ شاید اسی لیے اس زمانے میں مطالعۂ میرؔ کی طرف کم توجہ دی گئی۔ ۱۹۵۸ء میں ساقیؔ کا میرؔ نمبر شائع ہوا اور اس کے بعد میر شناسی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہاں بھی اگر دیکھا جائے تو میر کی بازیافت کے پس پردہ اس زمانے کے سیاسی وسماجی حالات نظر آئیں گے۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں قتل وغارت گری، ہجرت وانتقالِ آبادی نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی اور اس کے ساتھ جو سماجی اور تہذیبی مسائل پیدا ہو گئے تھے انھوں نے ہر دل کو ایک عزا خانہ بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ میرؔ کے لہجہ کے احیاء اور میر کو ازسرِ نو سمجھنے کا زمانہ تھا۔ ۱۹۶۲ء میں دلی کالج میگزین کا تاریخی میر نمبر شائع ہوا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ''نقوش'' لاہور نے ستمبر ۱۹۸۰ء، اکتوبر ۱۹۸۰ اور اگست ۱۹۸۳ میں ضخیم ترین ''میر نمبر'' شائع کیے جو تین حصوں پر مشتمل تھے۔ ۱۹۸۴ء میں ''آجکل'' دہلی ۱۹۹۹ء میں ''غالب نامہ'' دلی کا میر نمبر اور ۲۰۰۱ء میں غالب نامہ کے اسی نمبر کو ''میر تقی میرؔ تنقیدی اور تحقیقی جائزے'' کے نام سے ایوانِ غالب دہلی نے دوبارہ شائع کیا۔ ان خاص نمبروں کے علاوہ اس دوران مختلف رسائل میں میر پر مضامین شائع ہوئے۔

ان خاص نمبروں کی تنقیدی اہمیت کا جائزہ لینے سے پہلے اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ ان نمبروں میں جو مضامین شائع ہوئے ان میں سے بیشتر مضامین بعد میں ناقدین کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں شامل ہیں اور میر کے اہم ناقدین یا میر پر شائع ہونے والی اہم کتابوں کے سلسلے میں وہ مضامین زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ یہاں پر صرف اس

بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان اہم مضامین پر گفتگو کی جائے جو نقدِ میرؔ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ہوسکتا ہے کہ گفتگو کے دوران ان مضامین کے حوالے بھی آ جائیں جن کا ذکر پچھلے ابواب میں آ چکا ہے لیکن خاص نمبروں پر گفتگو کے سلسلے میں یہ تکرار ناگزیر ہوگی۔

میر پر ابتدائی تنقیدی نقوش کے سلسلے میں نیرنگ کے میرؔ نمبر کا حوالہ تفصیل سے دوسرے باب میں آ چکا ہے لہٰذا یہاں اس پر گفتگو کو نظر انداز کر دیا گیا۔

ساقی (حسن عسکری)

رسالہ ساقی کا میرؔ نمبر ستمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ دراصل یہ محمد حسن عسکری (۱۹۷۸ء۔۱۹۲۰ء) کا منتخب کردہ انتخاب کلام میرؔ ہے جس میں ان کے پیش لفظ کے علاوہ ایک مختصر سا مضمون ''میرؔ کی فنی شخصیت'' اور میرؔ کی شاعری کا انتخاب دیا گیا ہے۔

حسن عسکری نے لکھا ہے کہ:

> ''تخلیقی عمل میں تین چیزوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔
> ایک تو ادیب کی ذاتی شخصیت، دوسرے معاشرے کی اجتماعی
> شخصیت، تیسرے زبان کی شخصیت یہ تینوں شخصیتیں میرؔ کے
> یہاں ایک ہوگئی ہیں''۔ [۱]

حسن عسکری لکھتے ہیں کہ انھوں نے میرؔ کا انتخاب سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر نہیں کیا ہے کہ میرؔ کا کلام آہ ہے یا پھر پست و بلند کا مسئلہ۔ انھوں نے تو یہ انتخاب اپنی ذاتی پسند کی بنیاد پر کیا ہے۔

لکھتے ہیں:

> ''کلیات میرؔ کی جگہ کوئی انتخاب نہیں لے سکتا۔ البتہ کسی
> انتخاب کا جواز یہ ہوسکتا ہے کہ انتخاب کرنے والے کے نزدیک
> شاعر نے اپنے جذبات اور اپنے اسالیب بیان کی تہذیب جن
> طریقوں سے اور جن سمتوں میں کی ہے انھیں واضح کر دیا جائے
> چنانچہ میں اس انتخاب میں میرؔ کے بہترین اشعار کا مجموعہ پیش

نہیں کرر ہا ہوں، گو اس میں وہ اشعار بھی شامل ہیں، جو میرے
خیال میں ان کے بہترین اشعار ہیں''۔ ۲؎

حسن عسکری اس بات کا بھی دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کا انتخاب بہترین انتخاب ہے یا پھر ان کے ذریعہ کیا گیا یہ انتخاب دوسروں کو بھی پسند آئے گا ان کا خیال ہے کہ میر جیسے عظیم شاعر سے ہر دور اور ہر فرد اپنے اپنے حساب سے اُلجھتا ہے مگر انھوں نے اپنے انتخاب میں ہر طرح کے اشعار کو جگہ دی ہے۔

''..........میں نے ایک طرف تو ایسے شعر لیے
ہیں جن میں جذبات کی پختگی بھی ہے اور بیان کی بھی، دوسری
طرف ایسے شعر رکھے ہیں جن میں طرزِ بیان میں بھی ایک آنچ
کی کسر رہ گئی ہے پھر کچھ ایسے اشعار ان دونوں کے درمیان
آتے ہیں۔ انھیں ہٹا کر آپ ان کی جگہ اسی قسم کے دوسرے
اشعار رکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ان تین طرح کے شعروں کے
سلسلہ میں ایک دوسرے سے ملا کر آپ یہ دیکھ سکیں گے کہ میر
کس طرف جارہے ہیں''۔ ۳؎

حسن عسکری کے انتخاب میر کا مطالعہ ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ صرف ایسے ہی اشعار نہیں منتخب کرتے جو میرؔ کے بہترین اشعار ہیں بلکہ ہر طرح کے اشعار کے انتخاب سے میرؔ کے مرتبہ کا تعین کرتے ہیں اور ان کا یہ طریقۂ کار قابلِ تحسین ہے کیونکہ کسی بھی شاعر کا کلام صرف بلند مرتبہ اشعار کا خزینہ نہیں ہوسکتا۔ بلند و پست تو سب کے یہاں موجود ہوں گے۔ لہٰذا میر کا کلام بھی ان سے کیسے اچھوتا رہ سکتا تھا۔ ''ساقی'' کا یہ انتخاب حسن عسکری کی تنقیدی بصیرت کا نمائندہ ہونے کے ساتھ نقدِ میرؔ کے سلسلے کی اہم کڑی بھی ہے۔

دلی کالج میگزین کا میرؔ نمبر

دلی کالج میگزین کا ''میرؔ نمبر'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر نثار احمد فاروقی ہیں۔ میگزین چار حصوں میں منقسم ہے۔ باب اوّل میں میر کی حیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس

حصے میں سوانحی نوعیت کے نو مضامین شامل ہیں جن میں میرؔ کی زندگی پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ میرؔ کے حالات زندگی — قاضی عبدالودود
۲۔ حیاتِ میر — کلب علی خاں فائق
۳۔ میر کا سفر لکھنؤ — ڈاکٹر عبدالحق
۴۔ سراج الدین علی خاں آرزو — ڈاکٹر منوہر سہائے انور
۵۔ سید سعادت علی — ڈاکٹر منوہر سہائے
۶۔ تجلی دہلوی — ڈاکٹر مختارالدین احمد
۷۔ میر کلو عرش — ایم حبیب خاں
۸۔ تلامذۂ میر — فاضل زیدی
۹۔ میرؔ کا مدفن — نادم سیتاپوری

باب دوم کا عنوان ''میر کا فن'' ہے یہ حصہ ''الف، ''ب''، ''ج'' اور ''د'' میں منقسم ہے اس حصے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

(الف) عمومی مطالعہ

۱۔ میرؔ کے مطالعے کی اہمیت — پروفیسر آل احمد سرور
۲۔ میر کا آرٹ — نثار احمد فاروقی
۳۔ کیا میرؔ قنوطی تھے؟ — ڈاکٹر سلامت اللہ خاں
۴۔ میرؔ کی شاعری — حامداللہ افسر
۵۔ میرؔ کی ہجویہ شاعری — اظہر راہی
۶۔ میرؔ کے قصیدے — ابومحمد سحر
۷۔ میر کی متصوفانہ شاعری — میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

(ب) مثنویاتِ میرؔ

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں — ڈاکٹر گیان چند جین
میر اپنی مثنوی کے آئینہ میں — سید محمد

میرؔ اور معاملاتِ عشق	کلب علی خاں فائق
مثنوی دریائے عشق	نثار احمد فاروقی

(ج) میرؔ کی فارسی

میرؔ کا سبک فارسی	ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی
میرؔ بحیثیت فارسی شاعر	محمود حسن قیصر امروہوی
میرؔ کا فارسی کلام	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

(د) لسانیاتی مطالعہ

زبانِ میرؔ کی خصوصیات	ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواڑی
عہدِ میرؔ کی زبان	وحید الدین سلیم

بابِ سوم میں تصانیف میرؔ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصّے میں کلیات میرؔ، نکات الشعراء پر تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں مختلف شعراء نے میرؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ آخر میں ضمیمہ شامل ہے۔

میگزین کا باب دوم نقدِ میرؔ کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے اس باب میں میرؔ کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے بعض اہم ناقدین کے مضامین اس حصے میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے مضامین میں کلام میرؔ کے خصوصی نکات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں پروفیسر آل احمد سرور، نثار احمد فاروقی کے مضامین پر باب چہارم میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس حصے میں ان ناقدین کے علاوہ، ڈاکٹر سلامت اللہ خاں، وحید الدین سلیم اور بھولا ناتھ تیواڑی کے مقالات، تنقید میرؔ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سلامت اللہ خاں کے مضمون کا عنوان ہی استفہامیہ ہے انھوں نے پہلے ایک سوال قائم کیا اور اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس مفروضہ کو ختم کرنے کی کوشش کی کہ میرؔ قنوطی تھے۔ لکھتے ہیں۔

> ''........میرؔ کے بارے میں جب یہ کہا جائے کہ وہ زندگی
> یا انسان کے امکانات سے مایوس ہیں تو یہ ایک ایسی بات ہے جو کم از

کم میری سمجھ میں نہیں آتی۔ وقتی غم یا کسی منفرد باطنی تجربہ سے میرؔ
کے فلسفۂ زندگی کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا تعین اس سمت سے
ہوتا ہے جس کی طرف میرؔ کی شاعری اشارہ کرتی ہے اور جس سمت
میرؔ کی شاعری اشارہ کرتی ہے اور وہ روشن اور تابناک ہے"۔ ۴

سلامت اللہ لکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں یہ تصور عام ہے کہ شاعر کو اس کے کلام کی بنیاد پر قنوطی یا رجائی سمجھ لیا جاتا ہے۔ جب کہ یہ ضروری نہیں کہ کسی کی ظاہری خصوصیت ہی اس کی زندگی کی اصلیت ہو اس کے برعکس بھی اس کی زندگی ہوسکتی ہے اس سلسلے میں وہ سوئفٹ اور شیلے کی مثال دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "قنوطی شاعر وہ ہے جس کی ذہنیت زندگی کے ہر معاملہ میں شکست خوردہ ہو" میرؔ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میرؔ کا غم ذاتی اور آفاقی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی وسعت نظر قائم رہی وہ زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنے پورے فنی کمال کے ساتھ اس غم میں حوصلہ مندی کی بات کی۔

اس میگزین میں شامل ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواڑی کا مضمون "زبان میرؔ کی خصوصیات" ایک دلچسپ مضمون ہے۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواڑی نے لکھا ہے کہ "میرؔ کی زبان کی گرامر تقریباً وہی ہے جس پر آج کی اُردو، ہندی زبانوں کا دارومدار ہے اس لیے میرؔ اُردو اور ہندی دونوں کے شاعر ہیں اور میرؔ کی زبان کی گرامر کا تعلق تاریخی اعتبار سے سنسکرت، پالی، پراکرت، اور اُپ بھرنش سے ہے۔ اس بات کو مزید تفصیل سے انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔میرؔ کی زبان قواعد کے لحاظ سے
ہندی یا اُردو کے عام قاعدوں سے آزاد نہیں، ان کی زبان میں
اسم، حالت فعل، حرفِ جار، تذکیر و تانیث کے قاعدے یا واحد اور
جمع بنانے کے اصول اسی طرح سابقے اور لاحقے، ضمائر، صفت،
مصدر کے مادے، امدادی افعال، الفاظ کے مادے، اسمائے
اصوات، اسمائے جامد وغیرہ کے اصول اور طریقہ ہائے استعمال
تقریباً وہی ہوگا جو آجکل اردو یا ہندی میں رائج ہیں"۔ ۵

بھولا ناتھ تیواڑی نے اپنے مضمون میں اس نکتہ کو بارہا نمایاں کیا ہے کہ میرؔ کی زبان اتنے

برس گزرنے کے بعد بھی اپنے اندران خصوصیات کو سمیٹے ہوئے ہے جو آجکل کی اُردو/ ہندی زبان کی خصوصیات ہیں۔ان کے خیال میں میر کی عظمت کا خاص سبب ان کی زبان ہے۔

وحید الدین سلیم کا مضمون ''عہدِ میر کی زبان'' نقدِ میر کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔اس مضمون میں ایک اہم بات جس کی طرف وحید الدین سلیم نے غالباً سب سے پہلے اشارہ کیا وہ یہ ہے کہ ہر شاعر یا مصنّف کی زبان اس کے پیدائشی گاؤں یا شہر سے ضرور اثر لیتی ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے شیکسپیر کی مثال دی کہ اس کی زبان پر واردک شائر کا اثر ہے۔ یہ ایک ضلع ہے جس کے ایک قصبے میں شیکسپئر پیدا ہوا تھا۔وحید الدین سلیم نے لکھا ہے کہ میر تقی میر کی پیدائش آگرہ میں ہوئی ہے اس لیے ان کی زبان پر آگرہ کا اثر ضرور ہوگا۔لہٰذا اگر آگرہ کی خاص زبان کی فرہنگ تیار کی جائے تو اس دعوے کا ثبوت ملنے کا امکان ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی مثالیں بھی دی ہیں۔ حالانکہ خود میر اپنی زبان کو'' دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان کہتے ہیں'' وحید الدین سلیم کا خیال ہے کہ میر نے محاوروں کے استعمال کے سلسلے میں اس بات کی قطعی پرواہ نہیں کی کہ وہ کسی زبان کے لفظ کو کس طرح لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے مسجد کو مسیت ، دستخط کو دسخط اور شتاب کو شتابی ،نزدیک کو نزیک لکھا۔

وحید الدین سلیم نے میر کے دور کی زبان کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے پہلے اور دوسرے دور میں ہندی الفاظ کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔اور تیسرے دور میں ان ہندی الفاظ کی جگہ فارسی الفاظ نے لے لی ہے۔ تیسرے دور میں سانجھ کی جگہ شام، تجن کی جگہ محبوب، باس کی جگہ خوشبو جیسے الفاظ آ گئے ہیں۔اس کے علاوہ بعض ایسے الفاظ بھی اس دور میں رائج تھے جو مذکر بولے جاتے تھے۔مثلاً سیر، جراحت، جان، خلش ،مزار، نشتر وغیرہ جیسے الفاظ بھی میر کے دور میں بولے جاتے تھے۔موصوف کی جمع مؤنث مبتدا کی جمع مؤنث صفت لاتی تھی۔ مثلاً باتیں نہیں بھلیاں تمھاری، ادائیں پیاریاں ہیں، منزلیں کڑیاں ہیں، نیندیں ہماریاں ہیں جیسی مثالیں کلام میر میں جگہ جگہ موجود ہیں۔

وحید الدین سلیم کا یہ مضمون نقدِ میر کے سلسلے میں خاص اہمیت اس لیے رکھتا ہے کہ میر کی زبان پر انھوں نے تفصیل اور باریک بینی سے اظہار خیال کیا ہے۔

رسالہ نقوش میرؔ نمبر

رسالہ نقوش کے میرؔ نمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء، نومبر ۱۹۸۰ء اور اگست ۱۹۸۳ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے حالانکہ یہ تینوں نمبر گراں قدر ہیں لیکن تنقیدی نقطۂ نظر سے نومبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والا شمارہ ۱۲۶ نقدِ میر کے سلسلے میں خاصا اہم ہے اس شمارے میں کل ۳۷ مضامین شامل ہیں طوالت کے سبب مضامین کی فہرست سے انحراف کیا گیا ہے۔

رسالہ کا حصہ اوّل میرؔ کے انتخابات میر پر لکھے گئے دیباجوں پر مشتمل ہے دوسرے حصے میں میرؔ کی شخصیت اور حالات زندگی پر تفصیلی اظہار کیا گیا ہے۔ شمارے کا تیسرا حصہ میر کی شاعری پر لکھے گئے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین میرؔ پر لکھنے والے اہم ناقدین کے تحریر کردہ ہیں جن پر مقالے کے مختلف حصوں میں تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے۔ اس لئے تکرار کے خوف سے انھیں یہاں نظر انداز کیا گیا ہے۔ ایسے اہم مضامین جن کا ذکر مقالے میں نہیں ہوسکا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔	میر اپنے تاریخی پس منظر میں	حسن واصف عثمانی
۲۔	میرؔ تقی میرؔ اور خارجی حالات	ڈاکٹر سید محی الدین زور
۳۔	میرؔ جی	مرزا محمود بیگ
۴۔	میرؔ کی کہانی میر کی زبانی	مسعود حسن رضوی ادیب
۵۔	میرؔ کے بعد	مالک رام
۶۔	میرؔ تقی میر	امرناتھ جھا
۷۔	مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں	شبیہ الحسن نونہروی
۸۔	میرؔ کا کلام	یگانہ چنگیزی
۹۔	میرؔ کے قصیدے	ابومحمد سحر
۱۰۔	میرؔ کی عشقیہ مثنویاں	ڈاکٹر گیان چند جین
۱۱۔	میرؔ کے قصیدے	ابومحمد سحر
۱۲۔	میرؔ کی عشقیہ مثنویاں	ڈاکٹر گیان چند جین
۱۳۔	میرؔ کی ہجویہ شاعری	اظہر راہی

۱۴۔	میرؔ کا مرثیۂ دلی	میرزا ادیب
۱۵۔	میرؔ کی فارسی شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۱۶۔	میرؔ کا سبک فارسی	ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی
۱۷۔	میرؔ کا فارسی کلام	اختر علی تلہری

ابتدائی تین اہم مضامین میں عہد میرؔ کے تاریخی حالات، ان کی زندگی کے واقعات وحالات اور میرؔ کی شاعری پر ان واقعات وحالات کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے

حسن واصف عثمانی نے میرؔ کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:

> ''۔۔۔۔۔میر کی شاعری بہت بڑی ہے، کیونکہ اس کی بنیاد بڑی مضبوط ہے۔ یہ ایک فرد کی جسمانی اور ذہنی نامرادیوں کی کہانی ہے اور اس میں یونانی ٹریجڈی کا لطف ہے۔۔۔۔۔
> ۔۔۔۔۔انھوں نے اپنی شاعری میں اپنی اس شخصیت کو سمودیا تھا جو ہر انسان میں ہے یہ وہ شخصیت ہے جو ہار ماننا نہیں جانتی اور الم ناک لہجے میں اپنی انفرادیت کے زندہ رہنے کا اعلان کرتی ہے۔یہی ان کی سدابہار عظمت کا راز ہے۔'' ۶

حسن واصف میرؔ کی عظمت کا راز ان کی اس انفرادیت کو قرار دیتے ہیں جو زندگی میں ہر تکلیف ومصیبت کا سامنا کرنے کے باوجود زندہ ہے اور ایک فرد کی کہانی ہونے کے باوجود ہم سب کی کہانی بن جاتی ہے۔

مسعود حسن رضوی کا مضمون ''میرؔ کی کہانی میرؔ کی زبانی'' خاصا دلچسپ مضمون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے میرؔ کے اشعار کو یکجا کر کے مختلف عنوانات کے تحت درج کر دیا ہے۔مثلاً میرؔ کی سیادت، مذہبی معتقدات، جوانی، بڑھاپا، افتادِ مزاج، المناک زندگی وغیرہ۔

ڈاکٹر امرناتھ جھا کا مضمون ''میر تقی میرؔ'' ۱۹۴۷ء میں ''مزامیر'' میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر جھا نے لکھا ہے کہ میرؔ اس زمانے کا شاعر ہے جب اردو زبان کی تعمیر ہو رہی تھی حالانکہ بعد میں اس میں فارسی وعربی کے الفاظ کثرت سے شامل ہو گئے مگر میرؔ کی اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی زبان کو ہی اپنی شاعری کی زبان بنایا۔ لکھتے ہیں۔

''میرؔ مجموعی حیثیت سے اردو کے ابتدائی رجحان وفطانت
کا مؤید رہا اور یہ فراموش نہیں کیا کہ اردو ہندوستان کی زبان
ہے۔۔۔۔۔اس کے کلام میں بکثرت ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اس
وقت ہندو مسلمان یکساں طور پر استعمال کرتے تھے۔'' ۷

ڈاکٹر امرناتھ جھا ''صداقت'' کو میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات قرار دیتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ میرؔ کی راست گفتاری بڑے سے بڑے غم کی تلافی کر دیتی ہے کلیات میرؔ کے مطالعے سے انھیں ایک ایسے شخص سے ملاقات کا احساس ہوتا ہے جو ایک انوکھے اور دلکش کردار کا مالک ہے اور غمگین ہونے کے باوجود زندگی اور اس کے دیگر محرکات سے دلچسپی رکھتا ہے۔

شبیہ الحسن نونہروی کا مضمون ''مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں'' سماجی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔شبیہ الحسن نے لکھا ہے کہ

''میرؔ نے اسی زندگی سے سب کچھ سیکھا، یہی زندگی
انھیں ناکامیوں کے باوجود عزیز تھی اور زندگی کی محرومیوں کے
لئے ان کا نقطۂ نظر مثبت تھا۔ ناکامیوں سے کام لینا اور سعی پر
بھروسہ کرنا ان کے یہاں ایک مطلق قدر ہے''۔ ۸

وہ مزید لکھتے ہیں:

انھیں (میرؔ کو) دہلی کی پریشان حالی میں اپنی ذاتی
مفلسی اور پریشانی کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک وسیع پس منظر مل
گیا اور یہیں سے انھیں اس کا موقع ملا کہ وہ اپنے ذاتی مسائل کو
سماج اور ماحول سے ہم آہنگ کر سکیں بعد میں مفلسی کے علاوہ بھی
ایسے مسائل پیدا ہوتے رہے جن کی وجہ سے میرؔ کی ذات کا سماج
سے رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ان رشتوں کو مضبوط بنانا ہی بحیثیت فن
کار میرؔ کا اہم کارنامہ ہے۔'' ۹

بقول شبیہ الحسن عشق، فقر اور جدائی میرؔ کی زندگی کے تین اہم مرحلے ہیں آگرہ فقر کی علامت ہے دہلی عشق کی اور لکھنؤ جدائی کی علامت ہے۔یہ تینوں شہر میرؔ کی داستان حیات

کے ان تینوں عنوانات کی مخصوص نمائندگی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> ''میرؔ کے احوال دل کے لئے دلی کے حالات نے پس منظر کا کام کردیا۔ میرؔ نے اپنے دل کی تباہی کا حال جس طرح بیان کیا ہے اس طرح دہلی اور اس کے خاص حالات سے الگ ہوکر بیان کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میرؔ کے نزدیک دل کے لئے محبوب ترین استعارہ گھر یا شہر کا ہے اور وہ دل کے لٹنے کا حال اسی طرح بیان کرتے ہیں جس طرح گھر یا شہر میں آگ لگنے، لوٹ پڑنے اور خوں ریزی و تباہی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ میرؔ کا یہی شعور ان کے دل کو شخصی ہونے کے بجائے آفاقی اور کائناتی اہمیت کا حامل بناتا ہے۔'' [۱۰]

یاس یگانہ چنگیزی نے اپنے مضمون میں کلیات میرؔ کی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ البتہ میرؔ کی عشقیہ مثنویاں ڈاکٹر گیان چند جین کا اہم مضمون ہے جس میں انھوں نے میرؔ کو شمالی ہند کا پہلا بڑا مثنوی نگار قرار دیا ہے۔

> ''میرؔ نے مثنوی نگاری میں ایک طرح نو ڈالی۔ وہ شمالی ہند کے پہلے بڑے مثنوی نگار ہیں۔ یوں تو انھوں نے کل ملا کر ۳۷ مثنویاں لکھیں، لیکن ادبی حیثیت سے عشقیہ مثنویاں زیادہ جاذب توجہ ہیں۔'' [۱۱]

گیان چند جین نے میرؔ کی ادبی مثنویوں کی تعداد نو لکھی ہے جن میں جوان و عروس، معاملات عشق، جوشِ عشق، خواب و خیال، دریائے عشق، اعجازِ عشق، شعلۂ شوق (شعلۂ عشق) مور نامہ وغیرہ شامل ہیں۔

ان مضامین کے علاوہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی، اختر علی تلہری کے مضامین بھی میرؔ کی فارسی شاعری کی مختلف خصوصیات کا احاطہ کرتے ہیں۔

آجکل

زیر بحث ''آج کل'' کا میر نمبر مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ یہ نمبر سیمینار میں پڑھے گئے

ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹ سے ۲۱ مارچ تک دہلی میں منعقد کیا گیا تھا اور اس میں ہندوستان و پاکستان کے ممتاز دانشوروں اور ناقدین نے میرؔ کی شاعری اور شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ سیمینار کا افتتاح اس وقت کے نائب صدر جناب محمد ہدایت اللہ صاحب نے کیا۔ ہدایت اللہ صاحب کے خطبہ کو بھی اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے اس سیمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر گوپی چند نارنگ ہیں۔

اس نمبر میں کل ۱۷ مضامین شائع ہوئے ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔	میرؔ تقی میرؔ	محمد ہدایت اللہ
۲۔	میر اور غالب	مالک رام
۳۔	میر میری نظر میں	آل احمد سرور
۴۔	میرؔ تقی میر۔ جدید ہندوستان کا قومی شاعر	جمیل جالبی
۵۔	میرؔ کی پنچ تنتر	انتظار حسین
۶۔	شہر میر	خواجہ احمد فاروقی
۷۔	اسلوبیات میرؔ کے چند مباحث	گوپی چند نارنگ
۸۔	غالب اور میر مطالعے کے چند پہلو	شمس الرحمٰن فاروقی
۹۔	میر اور جدید ذہن	وارث علوی
۱۰۔	میرؔ کلچر	ظ۔ انصاری
۱۱۔	میرؔ کا تصور انسان	عبدالمغنی
۱۲۔	میرؔ کی شاعری کا اسم اعظم	محمود ہاشمی
۱۳۔	میرؔ کی شخصیت کا نثری اظہار	نیر مسعود
۱۴۔	میر کی شاعری کا سرریلسٹک پہلو	حامدی کاشمیری
۱۵۔	میرؔ کے لہجے کے صوتی میلانات	مغنی تبسم
۱۶۔	میرؔ اور لکھنؤ	کاظم علی خان
۱۷۔	میر اور بندش الفاظ	حنیف کیفی

خواجہ احمد فاروقی آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ، جمیل جالبی، حامد کاشمیری کی تصانیف پر باب چہارم میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ بقیہ مضامین میں محمد ہدایت اللہ کا

مضمون شخصی ہے۔انھوں نے اپنے مقالے میں میرؔ کی شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ مالک رام نے میر و غالب کا موازنہ کیا ہے البتہ ''میرؔ کی بیچ تنتر'' انتظار حسین کا ایک دلچسپ مضمون ہے جس میں انھوں نے میرؔ کی شاعری میں مختلف جانوروں کے ذکر کو اہمیت دی ہے۔ یہ مضمون نقدِ میرؔ میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

میر پر لکھا گیا وارث علوی کا مضمون ''میرؔ اور جدید ذہن'' خاصا اہم مضمون ہے۔اس مضمون میں وارث علوی نے اپنے ذاتی تاثرات کے بیان کے ساتھ میرؔ کی زبان کا عوام کے نزدیک ہونا، میرؔ کے کلام میں دورِ حاضر کی عکاسی اور Logos کی صفت کو کلام میر کی اہم خصوصیت قرار دیا ہے۔

وارث علوی اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ابتداء میں انھیں ''میرؔ کی بھاکا'' سمجھ میں نہیں آتی تھی کیونکہ ان کی زبان جامع مسجد کی سیڑھیوں والی زبان تھی جس کے معنی لغت میں نہیں ملتے۔وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت کوئی گوپی چند نارنگ نہیں تھا جو ہمیں کہتا کہ زبان کا لب و لہجہ پہچانو،لفظوں کے آہنگ پر نظر رکھو،شاعر کی آواز سنو،میرؔ کے اشعار بلند آہنگ نہیں تھے جو کانوں کو متاثر کرتے یا میرؔ مشکل اشعار کہتے تو سمجھ میں آتے۔لیکن آہستہ آہستہ اس بات کا احساس ہوا کہ میرؔ تو ایسا عظیم شاعر ہے جس کی شاعری میں اس کا عہد سانس لیتا نظر آتا ہے۔

> ''.........سچ مانیے میر کے چھوٹے موٹے شعر پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے، گویا انگوٹھے میں حاضرات دیکھ رہے ہیں۔ میرِ دیوار کے سایہ تلے بیٹھے ہیں، میر کوچۂ یار سے لائے گئے ہیں۔میر پھر کوچۂ یار کی طرف جاتے دکھائی دے رہے ہیں،میر کے سیدھے سادے الفاظ میں کیسی حاضراتی طاقت ہے رات بھر شمع سر کو دھنتی رہی۔ شعر پڑھتے ہی ذہن کے اُفق پر پُراسرار ازلی رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس اندھیرے میں شمع کا سلگنا سرخ چہرہ آسیب زدہ عورت کی مانند سر دُھنتا دکھائی دیتا ہے۔شعر کے الفاظ منتر کے لفظ بن گئے ہیں ان کا جاپ کیجیے اور آپ خود کو طلسمات کے مرکز میں پاتے ہیں۔یہاں لفظ اوّلین

معجزہ ہے ہوجا، اور ہوگئی، یہی Logos ہے اور میرؔ کے یہاں
الفاظ Logos کا تخلیقی اعجاز رکھتے ہیں۔" ۱۲

یعنی وارث علوی کے نزدیک میرؔ کی شاعری کی اہم خوبی اپنے حالات وعہد کی عکاسی ہے۔ وارث علوی کا خیال ہے کہ میرؔ نے اپنے اشعار میں الفاظ کا انتخاب اس خوبی سے کیا ہے کہ ان کے عہد کے تمام طلسمات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ وارث علوی اسے Logos کی صفت کا نام دیتے ہیں۔

رسالہ "آجکل" کے اس میرؔ نمبر میں عبدالمغنی کا مضمون "میرؔ کا تصورانسان" بھی شامل ہے ان کا ایک مضمون "میرؔ ایک مطالعہ" کے عنوان سے رسالہ ایوان اُردو (مئی ۲۰۰۱) میں شائع ہوا۔ عبدالمغنی لکھتے ہیں۔

"میرؔ کے تصورِ انسان میں دو نکتے بہت اہم ہیں ایک
عظمتِ آدم کا احساس، اور دوسرے انسان دوستی کا جذبہ ور یہ
دونوں مل کر کلامِ میرؔ میں بلند نگاہی، دل نوازی اور جاں سوزی پیدا
کرتے ہیں۔" ۱۳

میرؔ ہمیشہ انسانی عظمت کے گیت گاتے رہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں بارہا اس طرف اشارہ کیا کہ "فلک کی برسوں کی گردش انسان کو خاک کے پردے سے باہر لاتی ہے۔ ان کے یہاں انسان دوستی کا رویہ بھی اپنی پوری شدت سے موجود ہے اور اسی سبب سے میرؔ اپنی زندگی کی ہزارہا مصیبتوں کو برداشت کر سکے۔

اس رسالے میں شامل محمود ہاشمی کے مضمون "میرؔ کی شاعری کا اسمِ اعظم" میں کلامِ میرؔ میں بارہا استعمال ہونے والے لفظ "دل" کی نشاندہی کی گئی ہے۔ محمود ہاشمی کے خیال میں میرؔ کی شاعری میں استعمال ہونے والا کلیدی لفظ "دل" ہے۔ لکھتے ہیں۔

"دل کے لفظ سے میرؔ، یقیناً کوئی ایسا مفہوم اخذ کرتے
ہیں۔ جسے ہم ان کے شعوری اور لاشعوری محرکات کی بنیاد کہہ سکتے
ہیں یا دوسرے لفظوں میں، میرؔ کے نزدیک دل ایک وجدانی قوت
ہے میرؔ کی جمالیات کا محور اور مرکز ہے۔ علاوہ ازیں، میرؔ، دل کو

جوشِ حیات کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں۔'' ۱۴

اس میں دو رائے نہیں کہ میرؔ کی شاعری میں لفظ ''دل'' خصوصی اہمیت رکھتا ہے یہ دل ہی ہے جس پر زندگی میں پیش آنے والے ہر واقعے کا اثر پڑتا ہے اب چاہے وہ خود میر کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھنے والے واقعات ہوں یا ان کے عہد کے دل دہلا دینے والے حادثات، میر دل کو جوشِ حیات کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں اور اس لفظ کا استعمال ایک لاشعوری علامت کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اور اس لاشعوری علامت کو وہ ہر طرح کی تباہی و بربادی سے بچانا چاہتے ہیں۔

محمودؔ ہاشمی نے لکھا ہے کہ جدید دور میں جس طرح علامتوں سے کام لیا گیا ہے میر اپنی لاشعوری علامت سازی کے سبب جدید ذہن کے بہت نزدیک ہیں۔ دل ان کے یہاں ایک ایسی علامت ہی تو ہے۔ تخلیقی اظہار کی ایک لاشعوری علامت۔

> ''جدید ذہن کے علامت سازی کے میلان کی طرح میرؔ
> کو اپنے تخلیقی اظہار کی لاشعوری علامت کے تحفظ کا احساس اتنا
> شدید ہے کہ وہ بار بار اس 'علامت' کے مجرد مفہوم اور اس کی تباہی،
> اضطراب اور ویرانی کا ذکر کرتے ہیں۔'' ۱۵

میرؔ کی شاعری کی بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمود ہاشمی انھیں بیسویں صدی کا شاعر قرار دیتے ہیں۔

حامدی کاشمیری نے اپنے مضمون ''میر کی شاعری کا سرریلسٹک پہلو'' میں کلامِ میر کا ایک نئے انداز سے مطالعہ کیا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ ''سرریلزم کے مطابق شاعر کا شعور خارجی محرکات کا دست نگر ہونے کے بجائے داخلی مہیجات پر مکمل انحصار کرتا ہے۔ میرؔ کی شاعری لاشعوری واقعات سے عبارت ہے اور واضح طور پر ان کے سریلسٹک رویے کی توثیق کرتی ہے۔

مغنی تبسم کا مضمون ''میرؔ کے لہجے کے صوتی میلانات'' میر کے لہجے کی بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مغنی تبسم نے میر کی شاعری میں استعمال ہونے والے مصمتوں، مصوتوں، فقروں، تنظیموں، سرُ لہروں کے استعمال پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

میرؔ کی شاعری کے المیہ حصے میں گرتے ہوئے سروں Fallingpitch کی نشان

دہی کرتے ہوئے مغنی تبسم لکھتے ہیں کہ میرؔ کے اس طرح کے اشعار میں مصوتوں کو طول دے کر مابعد کے مصمتوں کو نرم اور سبک بنا دینے کا عمل سرگوشی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے مثال میں وہ اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔

عبدالمغنی نے اپنے مضمون میں جس انداز سے مصوتوں، مصمتوں، فقروں، سروں، الفاظ کی نشست، ان کے انداز بیان پر اظہار خیال کیا ہے اس میں ہیئتی تنقید کی جھلک ملتی ہے۔ان کا مضمون نقدِ میرؔ کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

''میر اور بندش الفاظ'' حنیف کیفی کا خاصا اہم مضمون ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ الفاظ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں مگر الفاظ سے زیادہ اہمیت اس کے برمحل و باسلیقہ استعمال کی ہے۔الفاظ کا باسلیقہ استعمال قوت اظہار کو توانائی اور اعجاز بخشتا ہے۔اگر الفاظ کا استعمال سلیقے سے نہیں کیا جائے گا تو وہ بے کار اور بے اثر ہو جائیں گے اس کے برعکس معمولی الفاظ کا استعمال بھی اگر موقع و محل کے اعتبار سے سلیقے کے ساتھ کیا جائے تو بات کارگر اور مؤثر ہوتی ہے۔شاعری میں یہ کام بندشِ الفاظ سے لیا جاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔دیکھا جائے تو بندشِ الفاظ کا دائرہ کار خاصی وسعت کا حامل ہے اور الفاظ کے استعمال کی تمام ممکنہ صورتوں پر محیط ہے۔ بندشِ الفاظ کا عمل الفاظ کے انتخاب سے شروع ہوتا ہے اور اپنے دائرے میں حسنِ ترتیب، خوش آہنگی، اثر انگیزی، ترکیب سازی، معنی آفرینی، پہلوداری جیسی خارجی و داخلی خصوصیاتِ کلام کو سمیٹ لیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔
>
> میرؔ کی شاعری میں بندش الفاظ کی یہ تمام صورتیں جلوہ گر نظر آتی ہیں، انھیں اتنی مہارت اور چابکدستی سے بروئے کار لایا گیا ہے کہ ان میں بلا کی برجستگی و بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے اور وہ شعری التزام کی مرہون منت ہوتے ہوئے بھی کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتیں۔'' [۱۶]

حنیف کیفی اپنے پورے مضمون میں میرؔ کے کلام سے بندش الفاظ کی خوبصورت

مثالیں بھی دیتے ہیں اور اثر لکھنوی کے اقوال بھی اپنے دعوے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ مضمون اپنی اس خوبی کے سبب خاصا اہم ہے۔

غالبؔ نامہ کا میرؔ نمبر جولائی ۲۰۰۰ء

غالبؔ نامہ کا میر نمبر جولائی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں تقریباً ۲۷ مضامین شامل ہیں جن میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی اور طاہر تونسوی کے مضامین خاصے اہم ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''میر کی شخصیت ان کے کلام میں'' بعض اہم نکات کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقیؔ نے لکھا ہے کہ ہمارے یہاں یہ خیال عام ہے کہ شاعری ہماری زندگی کی عکاس ہوتی ہے/شاعری اظہار ذات کا نام ہے یا شاعری داخلی شے ہے۔ اس تنقیدی تصور کے سبب شعراء کو مختلف تنقیدی دبستان سے وابستہ کردیا گیا مثال میں انھوں نے آتش وناسخ کا حوالہ دیا ہے۔ فاروقی لکھتے ہیں کہ یہ سراسر بے انصافی ہے کہ کسی کو اس کی ظاہری خصوصیات کی بناء پر کسی بھی اسکول سے وابستہ کردیا جائے۔ ان کے خیال میں میر کے ساتھ یہی بے انصافی روا رکھی گئی۔ نقدِ میر کے سلسلے میں تین اہم ناقدین نے میر کی شخصیت کو ان کے کلام میں اس طرح پیش کیا کہ آگے چل کر یہی تصور تنقیدِ میر کی کلید بن گیا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے میرؔ کو غم واندوہ کا شاعر قرار دیا تو مجنوںؔ گورکھپوری نے انقلابی شاعر قرار دینے کے باوجود دردوالم کا شاعر ٹھہرایا جب کہ عندلیب شادانی نے ان کے کلام میں امرد پرستی پر مبنی اشعار کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں امرد پرست ہی قرار دے دیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر میرؔ غمؔ و اندوہ کے شاعر تھے تو ان کی ہجویہ اور ظریفانہ شاعری کو کس خانے میں رکھا جائے گا۔ ان کے مطابق عبدالحق اور مجنوںؔ گورکھپوری اس حقیقت کو ذرا مشکل سے تسلیم کرتے ہیں کہ میر کی ہجویہ شاعری فطری ہے۔ یہاں تک کہ شخصیت کے معنی میں بھی دونوں کے یہاں فرق ہے۔ مولوی صاحب کی نظر میں ''شخصیت'' نام ہے افتاد و مزاج کا۔ اور مجنوں صاحب کی نگاہ میں

شخصیت نام ہے سماجی، سیاسی اور سوانحی حالات کے مجموعے کا۔

عبدالحق کے مطابق میرؔ کی زندگی ان کی شاعری کو منعکس کرتی ہے اور مجنوں صاحب کے مطابق میرؔ کی شاعری ان کی زندگی کو منعکس کرتی ہے۔ جب کہ بقول شمس الرحمٰن فاروقی عندلیب شادانی کو شخصیت کی نفسیاتی یا تاریخی توجیہات سے کوئی غرض نہیں۔ وہ شعر میں سیدھے سیدھے آپ بیتی کا تقاضا کرتے ہیں۔'' شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ یہ تینوں حضرات حالی و آزاد کے بعد نقد میر کا لب لباب کہے جاسکتے ہیں۔ اپنی اس رائے کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی ایک اہم سوال قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کی خوبی اگر اس بات میں ہے کہ اس میں وہی باتیں لکھی گئی ہیں جو شاعر نے خود بھوگی یا محسوس کی ہیں تو پھر شعر کے بارے میں معنی، استعارہ، علامت یہ سب اور اس طرح کے دیگر تصورات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ پھر تو ہر وہ شعر جس میں کوئی تاریخی بات کہی گئی ہے بڑا شعر نہیں تو اچھا شعر ضرور ٹھہرے گا، اس بنا پر کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل سچی ہے چاہے اس میں کچھ معنویت نہ ہو۔ شعر کی خوبی اس بات میں نہیں کہ وہ سچ پر مبنی ہو۔ شعر کی خوبی اس بات میں ہے وہ معنویت کا حامل ہو۔'' ؎۱

''شمس الرحمٰن فاروقی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے یہاں یہ تنقیدی تصور رائج ہے کہ اچھا شعر وہی ہے جس میں شاعر کا اپنا ذاتی تجربہ شامل ہو۔'' میرؔ کے بارے میں لکھتے وقت کسی ناقد نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میرؔ کی شخصیت ان کے کلام میں پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرؔ کی شاعری ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کی ضرور عکاسی کرتی ہے۔ مثلاً میر کا بچپن جس طرح گذرا اس کے بعد اگر ان کی شاعری میں اس دور کا کوئی اشارہ ملتا ہے یا پھر میر کا عشق، اس دور کے سیاسی و سماجی حالات ان چند پہلوؤں کے علاوہ میرؔ کی پوری زندگی کا احاطہ ان کی شاعری کے ذریعہ کرنا ناممکن ہے۔ البتہ ایک انسان میں عموماً جو خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً خودداری، غرور، رشک، عاجزی، معشوق سے لڑائی

جھگڑا، بیزاری یہ ساری انسانی خوبیاں ان کے یہاں ضرور ملتی ہیں۔

خود شمس الرحمٰن فاروقی نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ ''وہ ہر شخص کے ڈھب کا آدمی ہے'' تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری صرف ان کی پوری شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔

> ''شعرا صاحبان، اور خاص کر کلاسیکی شعراء اپنی برائی بھی لکھ ڈالیں تو اسے بھی نامعتبر سمجھنا چاہئے، بشرطیکہ ان کی بات کا الگ سے کوئی ثبوت نہ ہو۔ ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ غزل کی دنیا مضمون کی دنیا ہے؟ آپ بیتی اور اقبال جرم کی نہیں''۔ ۱۸

شمس الرحمٰن فاروقی اپنی بات کہنے کے بعد مصحفی اور میرؔ کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔ جن کا موضوع جنس ہے وہ لکھتے ہیں کہ اگر شاعر اپنے کلام میں اس موضوع پر شعر کہتا ہے جیسے کہ میرؔ کے دیوان پنجم کا شعر جس وقت کہ ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی۔ تو کیا ہم میر کو اس عمر میں پست مذاق سمجھ لیں۔ بلکہ میرؔ کے یہاں جنس، امرد پرستی، ہنسی ٹھٹھول کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ہر مضمون کے ادا کرنے پر قادر تھے۔

اس مضمون کے آخر میں فاروقی میرؔ کے دو اشعار مثال میں دیتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جب میں نے یہ اشعار پڑھے تو دل سے بے ساختہ تحسین واستعجاب کے کلمے کہے۔ مگر ان دونوں اشعار کی تعریف کرنے کے بعد وہ ایک عجیب بات پر اپنا مضمون ختم کرتے ہیں کہ ان دونوں اشعار میں جو الفاظ بارِ خاطر اور یارِ شاطر استعمال ہوئے ہیں، وہ میر نے گلستاں سے لیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''کچھ عرصہ بعد میں نے ''گلستاں'' میں یہ فقرہ دیکھا کہ ''درخدمت مرداں یار شاطر باشم نہ بار خاطر'' تو معلوم ہوا کہ دیوان چہارم کے شعر کی روشنی میں میر کی شخصیت کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ سعدی کی ''گلستاں'' انھوں نے غور سے پڑھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاعری میں شخصیت کی تلاش بس اسی طرح کی باتوں تک محدود رہنی چاہئے۔'' ۱۹

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس اقتباس میں دو باتیں کہی ہیں اوّل تو میر کا ''یار شاطر اور بار خاطر'' کا سعدی کی گلستاں سے لینا اور دوسری بات کہ شاعری میں شخصیت کی تلاش بس اسی طرح کی باتوں تک محدود رہنی چاہیے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے اس اقتباس میں جس لفظ ''یار شاطر'' کا سعدی کی گلستاں سے ماخوذ ہونا بتایا گیا ہے۔ وہ لفظ اردو زبان یا خود میر کے لیے نیا نہیں ہے۔ یہ لفظ برسوں سے ہمارے یہاں استعمال ہوتا آیا ہے۔ چاہے وہ شطرنج کے سلسلے میں ہو یا کسی شخص کی ذہانت یا چالاکی کی داد دینے کے لیے ایسے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ کہنا کہ یہ لفظ سعدی کی گلستاں سے میر نے لیا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔

اور دوسری بات یہ کہ شاعری میں شخصیت کی تلاش اگر اس طرح کی باتوں تک محدود ہو کر رہ گئی تو ہمارے شعراء کی ان بقیہ صلاحیتوں کا کیا ہوگا۔ جنھوں نے انھیں عظیم شاعر کا مرتبہ دلایا۔ بہر حال شمس الرحمٰن فاروقی کی اس تنقیدی رائے کو سمجھنا مشکل ہے ایک طرف تو شمس الرحمٰن فاروقی یہ لکھتے ہیں کہ کسی بھی شاعر کے کلام میں اس کی شخصیت کی تلاش اس کے ساتھ ناانصافی ہے اور دوسری طرف وہ خود ایک ایسے لفظ کے لیے جو ہماری زبان میں موجود ہے میر کو ''گلستاں'' کا خوشہ چین قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاعری میں شخصیت کی تلاش اسی طرح کی باتوں تک محدود رہنی چاہیے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ خود میر کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں؟

شمیم حنفی کا مضمون ''میر اور غالب اگر چہ موضوع کے اعتبار سے تقابلی معلوم ہوتا ہے مگر شمیم حنفی نے اپنے اس مضمون میں میر کا ذکر غالب کے پیش رو کی حیثیت سے کیا ہے۔ ان کے خیال میں

> ''اُردو کی شعری روایت میں واحد شخصیت میر کی ہے جو
> غالب کے لیے ایک مثال، ایک ماڈل (Model) ایک آدرش کی
> حیثیت رکھتے ہیں۔۲۰

شمیم حنفی میر کو غالب کے لیے ایک مثال مانتے ہیں جس کے سامنے ہونے کے سبب غالب اپنی عظمت کا اظہار کر سکے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

"مجھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔زیادہ سروکار اس مسئلے سے ہے
کہ میرؔ اور غالبؔ کی شاعری کے رنگ اور آہنگ میں نمایاں فرق
کے باوجود وہ عناصر کون سے ہیں جو ایک کو دوسرے سے قریب
کرتے ہیں" [۲۱]

شمیم حنفی نے لکھا ہے کہ دونوں زندگی کی طرف دوستانہ رویہ رکھنے کے باوجود اپنا ایک اختصاص رکھتے تھے۔ اور روشِ عام سے گریزاں تھے۔ میرؔ نے جہاں یہ کہا کہ انھیں "گفتگو خواص" سے ہے یا غالبؔ نے کہا کہ آ گہی سماعت کے جال چاہے جتنے بچھالے ان کے مدعا کا گرفت میں آنا ممکن نہیں، دونوں کی تہہ دار شخصیت اور پیچیدہ تخلیقی تجربے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شمیم حنفی نے دونوں شعراء کے ذہنی مراتب میں یگانگت اور بیرونی سطح پر مماثلت پر بھی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔

"وقت کے دو الگ الگ منطقوں سے متعلق ہونے اور
ایک دوسرے سے خاصا مختلف تہذیبی اور سوانحی پس منظر رکھنے
کے باوجود میر اور غالبؔ کے ذہنی مراتب میں یگانگت کے کئی پہلو
نکلتے ہیں۔ میر اپنے کسی بھی ہم عصر کو برابری کا درجہ دینے پر آمادہ
نہیں تھے۔ قریب قریب یہی حال غالبؔ کا بھی تھا۔ جو میر جیسی
قلندرانہ بے نیازی اور استغنا تو نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے
معاصرین کی حیثیت اور اپنا منصب اچھی طرح پہچانتے تھے۔
شاعری کے اختصاصی رول اور تخلیقی تجربے کی انفرادیت کا ایسا
ادراک اور منظم معاشروں میں رہتے ہوئے بھی ذہنی تنہائی کا اتنا
گہرا اور کھرا احساس اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے شاعروں
میں اور کسی کے یہاں نہیں ملتا۔ [۲۲]

بیرونی سطح پر دونوں شعراء کے درمیان مماثلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔دونوں نے اُردو اور فارسی کو ذریعہ اظہار

بنایا۔ دونوں ہی ایک اجڑتی ہوئی بستی کے ہولناک تماشے سے دوچار ہوئے۔ دربدری کا تجربہ دونوں کے حصے میں آیا۔ لیکن اس سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ میر اور غالب دونوں اپنے اپنے عہد کو عبور کرتے ہیں اور ہمارے عہد کی حسیت میں اپنے قدم اس طرح جماتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ دونوں صرف پیش رو نہیں رہ جاتے ہم عصر بھی بن جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے شعری منظرنامے پر دونوں کا اقتدار مسلم ہے ایسا لگتا ہے کہ میر اور غالب کے توسط سے ہم اپنے آپ کو دریافت کر رہے ہیں اور ان کے انتشار آگیں زمانوں میں ہم اپنے عہد کا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔'' ۲۳

شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''میر اور غالب میں یہ امتیاز مشترک ہے کہ ہمارے اپنے زمانے کی حسیت اور ہمارے تجربوں کی کائنات پر دونوں کا سایہ ایک جیسا طویل اور گہرا ہے۔ دونوں ہمارے لیے یکساں طور پر بامعنی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ دونوں کے شعور کی یکجائی سے ایک مسلسل بڑھتے پھیلتے ہوئے دائرے کی تکمیل ہوئی ہے۔ اس دائرے نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ میر کے انتقال کو (۱۸۱۰ء) دو صدیاں پوری ہونے کو ہیں۔ غالب کی پیدائش کو دو سو سال گذر چکے ہیں۔ مگر ہمارا اپنا شعور بھی ابھی ان کے دائرے سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہے۔'' ۲۴

ہمارے ناقدین میں شمیم حنفی نے غالباً پہلی بار میرؔ اور غالبؔ کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں کی طرف اتنی تفصیل سے اشارہ کیا ہے ورنہ عام طور پر ناقدین ان دونوں شعراء کے درمیان موازنہ کرتے وقت دونوں کی شاعری کے نمایاں فرق کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً میر کو جذبات کا شاعر کہا گیا اور غالبؔ کو فکر و خیال کا۔ یا غالب اپنی

شاعری میں روایت میں اضافہ کرتے ہیں اور پرانے الفاظ اور پرانی بات کو نئے انداز سے کہتے ہیں وغیرہ۔ مگر شمیم حنفی ان مماثلتوں کی وضاحت کرتے ہیں جو ان دونوں شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ مضمون خاصا اہم ہے۔

غالب نامہ کے میر نمبر میں شامل ابو الکلام قاسمی کا مضمون ''میرؔ تنقید اور تنقیدی رویے'' نقدِ میر کے مختلف رویوں کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ اپنے اس اہم مضمون میں ابوالکلام قاسمی نے تذکروں سے شروع ہوئی تنقید میرؔ سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی کی شعرِ شور انگیز تک۔ ان تمام تنقیدی رویوں پر اظہار خیال کیا ہے جو نقدِ میر کے سلسلے میں خاصے اہم رہے ہیں (ابو الکلام قاسمی کے مضمون کے حوالے اس مقالے میں کئی جگہ آ چکے ہیں لہٰذا یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔)

پاکستان کے مشہور محقق و ناقد ڈاکٹر طاہر تونسوی نے میرؔ کا مطالعہ ایک تاثراتی نقاد کی شکل میں کیا ہے اور نکات الشعراء کے پیشِ نظر انھوں نے میرؔ کو تاثراتی دبستانِ تنقید کا تخلیق کار قرار دیا ہے وہ بنیادی طور پر میرؔ کو شاعر ہی مانتے ہیں نکات الشعراء ان کا ایک اضافی کارنامہ ہے جو ان کی تنقیدی بصیرت اور شعری اصناف کے فنی تقاضوں پر دسترس کا ایک اظہار ہے انھوں نے لکھا کہ:

> ''۔۔۔۔۔۔ وہ (میرؔ) خود اپنے کلام کے ناقد تھے اور عصری شعور پر ان کی گہری نظر تھی۔ سماجیات کے ضمن میں ان کے اپنے تجربات و مشاہدات تھے۔ معاشرتی صورت حال کے وہ خود عینی شاہد تھے اور پھر ان پر جو بیت رہی تھی اس کے وہ خود ہی گواہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تخلیق اور تنقید دونوں سطح پر جو انکشاف کیا اس میں ان کی ذہنی، تخلیقی اور تنقیدی اپج بھی شامل تھے۔'' ۲۵

طاہر تونسوی میرؔ کی شاعری کے بارے میں مضمون نہیں لکھ رہے تھے۔ ان کا موضوع نکات الشعراء کی روشنی میں میرؔ کی تنقیدی آراء تھی لیکن مندرجہ بالا اقتباس میرِ تنقید کے سلسلے میں ایک اہم اشارہ ہے اور طاہر تونسوی نے پہلی بار اس کو نشان زد کیا ہے۔ میرؔ خود

اپنے کلام کے ناقد تھے اور تمام حالات پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ورنہ اس سے پہلے پست وبلند کے قصے نے ہمیشہ یہی تاثر پیدا کیا کہ میر نے جو کچھ لکھا ہے اس پر بغیر تنقیدی نگاہ ڈالے سب جمع کر دیا۔

''میر تقی میرؔ تنقیدی و تحقیقی جائزے'' میرؔ پر لکھے گئے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کو غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے شائع کیا۔ اس میں شامل تمام مضامین اس سے قبل رسالہ غالبؔ نامہ کے میر تقی میرؔ نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس تنقیدی و تحقیقی جائزے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جو نقدِ میر میں اضافے کا سبب ہو، مضامین سب وہی ہیں۔ کسی نئے مضمون کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے اس کی اشاعت بھی سال ۲۰۰۰ء میں ہوئی۔

حدیث میرؔ

مقبول احمد لاری کی مرتب کردہ ''حدیث میرؔ'' ۱۹۶۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ کتاب اتنی خوبصورت ہے کہ دیکھنے میں البم کا شبہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی اُردو کے پہلو بہ پہلو ہندی رسم الخط دیکھ کر مقبول احمد لاری کی سوجھ بوجھ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یقیناً اس کتاب سے غیر اردو داں طبقہ بھی مستفید ہوا ہوگا۔ یہ مقبول احمد لاری کا اہم کام ہے۔ میر کی ذات کے رنگا رنگ جلوؤں کے متعلق مقبول احمد لاری نے خود لکھا ہے:

> .....غور سے دیکھئے تو ان (میرؔ) کی ذات میں ایک باکمال شاعر ہی جلوہ گر نہیں ہے ایک تذکرہ نگار بھی چھپا ہوا ہے، جنگوں میں شریک ہونے والا ہی سامنے نہیں آتا، صلح کا پیغامبر بھی دکھائی دیتا ہے، خواب وخیال کی دنیا میں بسنے والا ایک سخنور ہی نہیں ملتا۔ اپنے عہد کا ایک تاریخ نویس بھی مشغول کار نظر آتا ہے ان کے کلام میں ان کے عہد کے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آپ بیتی بھی ملتی ہے اور عوام کے دل کی وہ دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں جو ہر عہد کے انسانوں سے منسوب کی جاسکتی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر صرف کل کا نہیں آج کا بھی شاعر

ہے جس نے ہمارے احساسات و جذبات کی ترجمانی مختلف زاویوں سے کی ہے شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ایک دیدہ ور شاعر کی حیثیت سے ان کے احساسات عصری بھی ہیں۔ آفاقی بھی ہیں ان کے دل میں سب کی جگہ ہے۔ ۲۶

مقبول احمد لاری نے اس ایک اقتباس میں میرؔ کی ساری خصوصیات کو یکجا کر دیا ہے۔

حدیثِ میرؔ تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اوّل کا عنوان حدیثِ ذات ہے، جس میں تین مضامین شامل ہیں یہ مضامین میرؔ کی زندگی اور ان کے عہد کا احاطہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن، حسن واصف عثمانی، نادم سیتاپوری کی کاوشیں اس حصہ میں شامل ہیں۔

دوسرے حصّے کا عنوان حدیثِ کائنات ہے اس حصے کے مضامین درج ذیل ہیں۔

میرؔ دہلوی	اختر اورینوی
میرؔ کی شاعری	ٹھاکر پرشاد سنگھ
میرؔ کی شاعری کا پس منظر	شری رام ناتھ سمن
میرؔ کی اپج اور پرکھ	حسن عسکری پلکھنوی
میرؔ کی صوفیانہ شاعری مختصر تعارف	رسول احمد ابودھ
میرؔ کی مثنویاں	ڈاکٹر سلام سندیلوی
میرؔ کے کلام میں طنز و ہجو	غلام احمد فرقت کاکوروی
میرؔ کا فارسی کلام	اختر علی تلہری
میرؔ کی زبان	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
میرؔ تقی میرؔ۔ ایک تأثر	ڈاکٹر کملا سنکرتائین
میرؔ اور جذباتی ہم آہنگی کی جستجو	سید احتشام حسین
میرؔ۔ ماضی سے مستقبل تک	نظیر صدیقی
میکدے میں میرؔ	ڈاکٹر سید عبداللہ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں	شبیہ الحسن نونہروی

تیسرے حصے کا عنوان حدیثِ فن ہے، جس میں سید مسعود حسن رضوی اور مالک

رام کے مضامین شامل ہیں۔

حدیث میر میں شامل مضامین میں سے بعض پر اس مقالے کے مختلف ابواب میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ جن اہم مضامین کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے ان پر اس حصے میں تنقیدی تبصرہ کیا جائے گا۔

حسن عسکری کا مضمون ''میرؔ کی اپج اور پرکھ'' کلام میرؔ کی روشنی میں میرؔ کے کردار کی چند خصوصیات کو سامنے لاتا ہے کہ میر خود اعتماد ہونے کے ساتھ ایک حساس انسان تھے یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تباہی و بربادی اور مغل تمدن کے ذہنی زوال کو میر نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔

اختر علی تلہری کے مضمون ''میرؔ کا فارسی کلام'' میں میرؔ تقی میر کی فارسی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میر کی فارسی شاعری خسرو اور فیضی کی طرح بلند تو نہیں مگر میرؔ نے بزم فارسی کو بڑی خوش سلیقگی اور حسن سے سجایا ہے۔

نظیر صدیقی اپنے مضمون ''میرؔ۔ ماضی سے مستقبل تک'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''میرؔ کی شاعری کے اجزائے ترکیبی تین ہیں''(۱) ذاتی محبت کا المیہ (۲) ان کے زمانے کا المیہ اور (۳) انسانی زندگی کا المیہ'' ۲۷

نظیر صدیقی نے اس نکتہ کی طرف تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں۔

> '' شاعری بالخصوص غزل میں مختلف قماش کے الفاظ کا استعمال سیکھنے والے میر سے بہتر رہ نما پانے کی توقع نہیں کر سکتے۔ انھوں نے عربی اور فارسی تراکیب کے علاوہ ہندی کے نرم و شیریں الفاظ کو غزل میں جس فنکارانہ طور پر استعمال کیا ہے وہ ان کے کمال کا ایسا رخ ہے جس سے موجودہ اور آئندہ دور کے شاعروں کو بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ۲۸

میرؔ کی اس صلاحیت کا اعتراف تقریباً سبھی اہم ناقدین نے کیا ہے کہ میرؔ نے اپنے کلام میں ہر طرح کے الفاظ کا استعمال جس خوبی سے کیا ہے وہ ان کا خاصہ ہے، نظیر صدیقی نے اس میں اضافہ یہ کیا کہ موجودہ اور مستقبل کے شعراء بھی میر سے فیض اٹھاتے رہیں گے۔

حدیث میرؔ میں یوں تو مضامین کی تعداد کافی طویل ہے مگر ان میں سے زیادہ تر مضامین کا

ذکر آچکا ہے لہٰذا ان کو یہاں نظر انداز کیا گیا ہے۔ حسن عسکری، اختر تلہری اور نظیر صدیقی کے علاوہ رسول احمد ابودھ، ڈاکٹر سلیم سندیلوی، غلام احمد فرقت کاکوروی اور شجاعت علی سندیلوی کے مضامین میں کلام میرؔ کے مختلف نکات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میرؔ کی زبان میں درد واثر اور سوز و گداز کا سبب ان کے ورثہ اور ماحول کو قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ کو گفتگو میں یہ کمال یونہی نہیں حاصل ہوا بلکہ

''میرؔ کی زبان میں یہ اثر دل کے الم کے دفتر لکھنے کی بدولت ہوا یہ دفتر الم خود ان کی زندگی کے حالات و واقعات ہیں، میر نے زبان اور زندگی کے تعلق کو ہمیشہ قائم رکھا۔۔۔۔۔ یہ خوبی بغیر وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کے ناممکن ہے میر نے حیاتِ انسانی اور گردوپیش کے حالات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اس کو اپنے دل کی گلابی سے رنگین و معطر کیا، اور اس انداز سے بیان کیا کہ سننے والے دل تھام کر رہ گئے۔ میرؔ کی زبان کی مقبولیت و محبوبیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ پرتکلف الفاظ کا استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ بات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ الفاظ کے جوہری ہیں اور ایک کامل صناع کی طرح ان کا استعمال حسب موقع کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ۲۹

افکار میرؔ

''افکار میر'' (دسمبر ۱۹۶۷ء) ان اہم مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً میرؔ پر شائع ہوتے رہے۔ اس کے مؤلف ایم حبیب خاں ہیں۔ افکار میرؔ کے تعارف میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے۔

''اُردو ادب کے پورے سرمائے کا جائزہ لیا جائے تو میرؔ کے علاوہ ہمیں کوئی اور ایسا شاعر نہیں ملتا جس کی عظمت کا اعتراف ہر دور

میں یکساں طور پر کیا گیا ہے۔ میرؔ کا کلام ایک ایسا جادو ہے جو کسی دلیل اور محبت کے بغیر دلوں پر اثر کرتا ہے۔ ۳۰

ایم حبیب خاں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی تالیفی کاموں کا اہم سلیقہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے خود بھی کئی مضامین لکھ کر اس کتاب کو جامع اور مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ افکار میر چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ان چار ابواب میں تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی مضامین شامل ہیں۔ خود ایم۔ حبیب خاں نے اپنے شاملِ کتاب مضمون ''میرؔ کی عظمت'' میں لکھا ہے۔

''ان (میرؔ) کے یہاں تلملانا اور تڑپنا نہیں ہوتا بلکہ خودداری اور سنجیدگی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔'' ۳۱

کتاب کے چاروں ابواب مختلف عنوانات پر مشتمل ہیں۔ باب اوّل حیات اور تصانیف جس میں قاضی عبد الودود، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر حنیف نقوی اور خود ایم۔ حبیب خاں کے دو مضامین شامل ہیں۔

باب دوم کا عنوان فکر و فن ہے۔ اس حصّے میں میرؔ پر لکھنے والے تمام اہم ناقدین کے مضامین کو شاملِ کیا گیا ہے۔ فہرست درج ذیل ہے۔

میرؔ تقی میرؔ	بابائے اُردو مولوی عبد الحق
میرؔ کے مطالعے کی اہمیت	پروفیسر آل احمد سرور
میرؔ کی عالمگیر مقبولیت	فراق گورکھپوری
میرؔ اور نئی غزل	محمد حسن عسکری
میرؔ اور ان کی شاعری	علی سردار جعفری
میرؔ اور ہم	مجنوں گورکھپوری
میرؔ کی غزل	ڈاکٹر سید عبد اللہ
میرؔ کا ایک نقاد محمد حسین آزاد	ڈاکٹر سید عبد اللہ
میرؔ کی غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی
میرؔ کی فارسی غزل	اختر علی تلہری
زبانِ میرؔ کی خصوصیات	پروفیسر نثار احمد فاروقی

ان تمام مضامین پر مقالے کے مختلف ابواب میں گفتگو کی جا چکی ہے باب سوم۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر ابو محمد سحر اور ڈاکٹر نعیم احمد کے مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین میر کی مثنویوں، قصائد اور شہر آشوب پر لکھے گئے ہیں۔ آخری باب میں میر کے کلام کا مختصر سا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

میر تقی میرؔ عالمی سیمینار

۱۹ر ستمبر ۱۹۹۹ء میں غالب اکیڈمی ٹورانٹو کینیڈا کے زیر اہتمام ''میر تقی میرؔ عالمی سیمینار'' کا انعقاد کیا گیا۔ اس سیمینار میں پیش کردہ مقالات کتابی شکل میں مارچ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئے۔ جس کے مرتب ڈاکٹر اطہر رضوی ہیں اس کتاب میں شائع ہونے والے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔	میرؔ کا فن اور پاگل پن۔	ڈاکٹر خالد سہیل
۲۔	میرؔ کا لب ولہجہ	ڈاکٹر شاہد حسین
۳۔	میرؔ اپنے زمانے کی معتبر ترین آواز	پروفیسر آفاق احمد
۴۔	میرؔ کی مثنویات کا تہذیبی مطالعہ	ڈاکٹر ظلِ ہما
۵۔	میر کا دورِ جنوں	ڈاکٹر نعیم چودھری
۶۔	غزلیات میرؔ میں موضوعات کی تلاش	پروفیسر منظر ایوبی
۷۔	میرؔ کی تاریخی حسیت	ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۸۔	میرؔ تقی میرؔ آئینہ ایام میں	ڈاکٹر فرمان فتحپوری
۹۔	میرؔ کی شخصیت۔ ان کے کلام میں	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی
۱۰۔	میر ہمارے عہد میں	ناصر کاظمی (مرحوم)

شمس الرحمٰن فاروقی، ناصر کاظمی اور خالد سہیل کے مقالات پر تنقیدی تبصرہ مختلف ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا مضمون ''میر کی تاریخی حسیت'' خاصا اہم ہے۔ میر کے عہد کے تاریخی واقعات ان کے کلام میں زندہ و جاوید ہوئے ہیں۔ میر کی اس فنکاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے لکھا ہے۔

''میر نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن ان
کی تاریخی حسیت نے عصری کوائف سے جو ان کی زندگی اور ذہن
سے ناقابل شکست طور پر جڑے ہوئے تھے۔ ان کو محسوس کیا تھا۔
معلوم کو محسوس میں بدلنا ہی آرٹ ہے۔'' ۳۲

تنویر احمد علوی نے میر کی حسیت کی داد دیتے ہوئے ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میر اپنے عہد کے واقعات کو محسوس کر کے اسے اپنے کلام میں پیش کرنے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میر کا تاریخ سے بالواسطہ رشتہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک زندہ رشتہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''۔۔۔۔۔احمد شاہ ابدالی کی افواج جب شہر دہلی کو لوٹتی ہیں
تو میر اس کے چاہے عینی شاہد نہ ہوں لیکن انھوں نے ان واقعات کو
اس طرح اپنے طور پر محسوس کیا، جیسے وہ ان کے سامنے گذر رہے
ہوں اور وہ اس منظر نامے کو سپرد قلم کرتے وقت اپنی آنکھوں سے یہ
سب دیکھ رہے ہوں۔۔۔۔۔۔وہ آگرے سے دہلی آئے تھے اور
دہلی پہنچ کر انھوں نے اس کی خاک دامن گیر سے اپنا دلی رشتہ کچھ
اس طرح استوار کیا کہ آئندہ پھر کبھی اس کا تار نہ ٹوٹا۔ دہلی کے دل
کی دھڑکن ان کے اپنے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہوگئی۔ ۳۳

میر کی غزلوں پر تنقیدی تبصرہ کرتے ہوئے تنویر احمد علوی لکھتے ہیں کہ غزل رمز وایماء کا فن ہے، جزئیات و تفصیلات غزل کے دائرہ کار میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے دشنہ و خنجر کہہ کر ناز و غمزہ مراد لیا۔ میر کے یہاں جب ہم ان علامات پر غور کرتے ہیں تو ''دہلی اور شمالی ہند کی شکست و ریخت کی تاریخ ان اشعار کے پس منظر سے بجلیوں کی طرح جھانکتی ہے۔ اور لوح و فکر و خیال پر اپنا عکس ڈالتی ہے ان کے ایک شعر کی تشریح کرتے ہوئے تنویر احمد علوی میر کی شاعری کا میر کی تاریخی حسیت سے رشتہ کچھ اس طرح قائم کرتے ہیں ؎

درہمی حال کی ہے ساری مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

"میر جس کو"درہمی حال" کہہ رہے ہیں اور جوان کے
دیوان میں ورق بہ ورق اور صفحہ بہ صفحہ دیکھی جا سکتی ہے وہی تو اس
دور کی تاریخ کی روداد بھی ہے۔" ۳۴

مفلسی، ویرانی، قتل وغارت گری اس دور کی دلی کے ایسے نقوش تھے جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ دہلی کی گلیوں اور آس پاس کی بستیوں کے حالات کا اندازہ میرؔ کے اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔ کہیں بات اشاروں میں کی گئی ہے تو کہیں بالکل واضح انداز میں۔

تنویر احمد علوی نے لکھا ہے کہ غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کی دلی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے انھیں حالات سے دلی میرؔ کے دور میں ۱۷۵۷ء میں گذر چکی تھی لہٰذا غالبؔ کے یہاں جو شہر آرزو کا ماتم ہے اسے میر کے اشعار میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر چودھری محمد نعیم

ڈاکٹر چودھری محمد نعیم کا خصوصی کام میر تقی میرؔ کی آپ بیتی "ذکرِ میرؔ" کا فارسی سے انگریزی ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کی ابتدا میں لکھا گیا دیباچہ تنقیدی نقطۂ نظر سے خاصا اہم ہے۔ ٹورنٹو سیمینار میں ڈاکٹر نعیم نے "میر کا دورۂ جنوں" عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے خود لکھا ہے کہ ان کے موضوع کا تعلق سوانح سے زیادہ اور شاعری سے کم ہے۔"

"میر کی شاعری" فرمان فتحپوری کا مضمون ہے فرمان فتحپوری کی نئی تخلیق "میر کو سمجھنے کے لیے" شائع ہو چکی ہے۔" اپنے مقالے میں فرمان فتح پوری نے میرؔ کو ایک حوصلہ مند اور ناکامیوں سے کام لینے والا شاعر قرار دیا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔میر تقی میرؔ جس حوصلہ مندی اور پامردی
کے ساتھ زمانے کی سختیوں سے گزر گئے، اپنی مدافعتی قوتوں اور
جذبوں کو تصعید و تطہیر کر کے ناموافق حالات پر قابو پالیا۔ جس سلیقے
سے ناکامیوں کو کامیابی کا وسیلہ بنالیا، اور جس سلیم الطبعی و خوش
اسلوبی سے اپنے آپ کو تباہی سے بچالیا وہ ہر شخص کے بس کی بات
نہیں۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو زمانے کی سختیوں کے سامنے سپر

ڈال دیتا، اندر سے بکھر جاتا، خود ٹوٹ پھوٹ جاتا، یاس و ناامیدی کی تصویر بن کر رہ جاتا اور شعر گوئی کا حوصلہ چھوڑ دیتا اور اگر شعر گوئی پر مائل ہوتا تو اس کی شاعری۔۔۔۔۔۔۔۔ایک طرح کی مرثیہ نگاری، سوز خوانی اور نوحہ گری ہوتی۔ لیکن میرؔ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ان کی رجائی طبیعت نہ تو آشوب زمانہ سے کبھی مغلوب ہوئی اور نہ اس میں افتادگی و فنا آمادگی کے آثار پیدا ہوئے بلکہ ہمت و حوصلہ اور خود اعتمادی و خودنگری کی ایک روشن لکیر ان کے کلام میں بہرحال نمایاں رہی۔'' ۳۵؎

میرؔ کے یہاں یورش آلام کے باوجود اعتدال و توازن کا سبب فرمان فتح پوری ان کی ابتدائی زندگی اور تربیت و حالات کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے والد اور چچا نے انھیں جو انسان دوستی، احترام آدمیت اور رضائے الٰہی پر یقین رکھنے کی تلقین کی تھی اسی لیے میرؔ کی شخصیت معتدل رہی اور بقول فرمان فتح پوری

''ان کی شاعری کی سطح المیہ و حزنیہ سہی، حقیقت میں عاشقانہ و نشاطیہ ہے۔'' ۳۶؎

فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ:

''میرؔ کی شاعری کو پڑھنے کے لیے کسی لغت کی ضرورت ہے نہ فرہنگ کی ان کا کلام بے انتہا سادہ و سلیس ہے مگر'' میرؔ کی سادگی حد درجہ پرکار و معنی خیز ہے انھوں نے انتہائی سادہ اور کم سے کم لفظوں میں بعض اشعار میں انتہائی گہرے اور زیادہ سے زیادہ معنی سمو دیے ہیں۔'' ۳۷؎

کلیاتِ میرؔ

کلیاتِ میرؔ بھی نقدِ میرؔ کے سلسلے میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں یہ کلیات وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ میر کا کلیات اور ان کا دیوان کئی لوگوں نے مرتب کیا ہے جس میں کلیاتِ میرؔ مرتبہ عبدالباری آسی، کلیاتِ میرؔ مرتبہ ظل عباس عباسی، کلیاتِ میر مقدمہ سید

احتشام حسین، دیوانِ میر مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری، فرہنگِ کلیاتِ میر فیروز احمد برکاتی وغیرہ شامل ہیں۔ان کلیات اور فرہنگ کے مقدمے میرؔ تنقید میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں حالانکہ ان کے مرتبین نے زیادہ تر تحقیقی بحثیں کی ہیں جو کلیاتِ میرؔ کے نسخوں اور متن کی قرأت سے متعلق ہیں، لیکن بعض جگہوں پر خاص طور پر سید احتشام حسین کے مضمون میں میرؔ شناسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس لیے میر تنقید میں ان مقدمات کی اہمیت مسلّم ہے۔کلیات میرؔ کا سب سے قدیم نسخہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ اب نایاب ہے۔

کلیاتِ میر مرتبہ عبدالباری آسی

عبدالباری آسی کا مرتب کردہ کلیات میرؔ ۱۹۴۰ء میں طبع ہوا۔اس میں عبدالباری آسی کا مقدمہ اور آخر میں فرہنگ شامل ہے۔ بقول فرید احمد برکاتی عبدالباری آسی نے اپنے مرتبہ کلیات میں کئی اہم اضافے بھی کیے ہیں مثلاً انھوں نے دو مثنویوں (جنگ نامہ اور ہجو شخصے ہیچ مداں) کے علاوہ ترجیع بند در منقبت علیؓ کے ابتدائی بند، اور آٹھویں بند کے تین شعر نیز دو غیر مطبوعہ غزلوں کو اپنے مرتّب کردہ کلیات میں شامل کیا۔

کلیات میرؔ ظل عبّاس عبّاسی

ظلِ عباس عباسی نے ''کلیات میرؔ'' مکمل چھ دیوان غزلیات ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ظلِ عباس عباسی نے اس کلیات کو علمی مجلس دہلی سے شائع کیا تھا۔ بعد میں یہ ترقی اردو بیورو سے شائع ہوا۔

ظلِ عباس عباسی نے لکھا ہے کہ ''یہ کلیات میر فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ) ۱۸۱۱ء کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہے''۔مگر اس کلیات میں ظلِ عباس عباسی کا مقدمہ نہ ہونا عجیب سی بات ہے۔کلیات کی ابتداء میں چند تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں جن میں سے زیادہ تر کا ذکر مقالے کے مختلف ابواب میں آچکا ہے اس لیے یہاں انحراف کیا جارہا ہے۔مگر رشید احمد صدیقی کے یہ اقوال میرؔ کی شاعری کی چند اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

''میر ہماری تہذیب کے ترجمان اور حسن کار ہیں۔''[۳۸]

مزید لکھتے ہیں:

> جہاں تک حسن و عشق کا تعلق ہے میرؔ نے ہمعصر نہیں بلکہ ہمہ عصر روح کو گرفت میں لے لیا ہے یہ امتیاز دُنیا کے چند ہی شاعروں کے نصیب میں آیا ہے کیا تعجب، میر جیسا شاعر پیدا کرنے میں فلک کو برسوں سے زیادہ ''پھرنا'' پڑا ہوا۔ ۳۹

رشید احمد صدیقی کے تعارف کے علاوہ کلیاتِ میرؔ (ظلِ عباس عباسی) میں قاضی عبدالودود، ظلِ عباس عباسی، پروفیسر آل احمد سرور، اور فراق گورکھپوری کے مضامین شامل ہیں۔

کلیات میر دو جلدوں میں ۱۹۷۲ء میں رام نرائن لال بینی مادھو نے الٰہ آباد سے شائع کیا۔ پہلے حصہ میں غزلیات کے چھ دواوین شامل ہیں۔ اس جلد کا مقدمہ سید احتشام حسین کا تحریر کردہ ہے۔ جلد دوم کا مقدمہ ڈاکٹر مسیح الزماں نے لکھا ہے اور بقول فرید احمد برکاتی دوسری جلد میں ان تمام منظومات کے علاوہ جو نسخۂ آسی میں شامل ہیں بعض غیر مطبوعہ مثنویاں اور مراثی بھی شامل ہیں۔

دیوانِ میر نسخۂ محمود آباد (مخطوطہ ۱۲۰۳ھ ''محیات میرؔ'') مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری مطبوعہ ۱۹۷۳ء یہ میرؔ کے دیوانِ اوّل کا نسخہ ہے جس میں غزلیات کے علاوہ رباعیات اور کچھ منظومات بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اسے ایک طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر فرید احمد برکاتی کی ''فرہنگ کلیات میرؔ'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی یہ دراصل مصنف کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے اس مقالے میں پیش لفظ کے علاوہ مصنف کا مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں فرہنگ میر کی اہمیت اور مقصد سے لے کر میرؔ کے لسانی اور ادبی پس منظر پر تنقیدی نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے مضامین میں ''عہدِ میرؔ'' کی زبان اور وحید الدین سلیم ''زبان میر اور جمیل جالبی، زبان میر جدید تنقید کی روشنی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

فرہنگ کلیاتِ میر ایک قابل قدر تحقیقی کام ہے میرؔ کے مطالعے کا یہ ایک اچھوتا پہلو تھا جسے فرید احمد برکاتی نے پورا کیا۔ میر کی زبان کے بارے میں بھلے ہی یہ کہا جائے کہ سادہ و سلیس ہے مگر میرؔ نے جس طرح سے اسے شاعری کی زبان بنایا ہے وہ ان کا کارنامہ ہے اس لیے

مطالعہ میر کے وقت ایک مبسوط فرہنگ کی ضرورت اکثر پڑ سکتی ہے۔

بقول سید محمد عقیل رضوی

''اُردو میں میر تقی میر پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام ہے۔'' ۴۰

متفرق مضامین اور کتب

''میر صاحب کا خاص رنگ'' ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مضمون ہے یہ مضمون اکتوبر ۱۹۴۵ میں رسالہ ''ساقی'' میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے میر کی شاعری میں ''امرد پرستی'' پر اظہار خیال کیا ہے اور اس بات کی شکایت کی ہے کہ اربابِ نقد نے میر صاحب کی شاعری کے اس نہایت اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۹۷۸ء۔۱۹۲۷ء)

خلیل الرحمٰن اعظمی اُردو کے اہم شاعر و نقاد ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میر پر ان کے کسی مضمون تک میری رسائی نہ ہو سکی مگر ان کے شعری مجموعے ''نیا عہد نامہ'' کے دیباچے میں میر کی شاعری کے متعلق ان کے خیالات ضرور ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جب انھوں نے ''کلیات میر کا مطالعہ بنظر غائر کیا تو دیکھا کہ میر کے یہاں غم کی پرستش کے بجائے ہر جگہ غم سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ موجود ہے''۔

''کلیات میر کے مطالعے کے دوران مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری داخلی دنیا میں کچھ دریچے کھل گئے ہیں جن سے ہو ہو کر ایسی ہوائیں آ رہی ہیں جو مجھے محبت، رفاقت، خلوص، ہمدردی اور دلدہی اور دلاسائی کا پیغام دے رہی ہے، میں نے اس کلیات کو اپنے سینے سے لگایا اسی آئینہ میں اپنی ذات کا مشاہدہ کرنا میرا معمول بن گیا۔۔۔۔۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ان کو بھی اپنے زمانے میں اسی نوع کی تنہائی سے واسطہ پڑا تھا۔ انھوں نے بھی اپنے سامنے ایک بساط کو الٹتے اور بھری پری بزم کو درہم برہم

ہوتے دیکھا تھا اور اس کے باوجود بھی انسان اور انسانی زندگی پر تو
ان کا اعتماد باقی رہا تھا ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ میرؔ کی آواز کو اپنی آواز سمجھنا
میرے لیے محض غزل گوئی یا شاعری کا راستہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ میری
پوری زندگی کا مسئلہ تھا۔ اس آواز کا سراغ مجھے نہ ملتا تو میری روح
کا غم جو اندر سے مجھے کھائے جا رہا تھا۔ نہ جانے مجھے کن اندھی
وادیوں میں لے جاتا۔" [۱۴۱]

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی زندگی کے غموں کا مداوا میرؔ کی شاعری میں تلاش کیا۔ وہ نہایت واضح انداز میں اس کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں میرتقی میر کے لب ولہجہ اور آہنگ کے سہارے اپنی افسردگی، حرماں نصیبی، شکستگیٔ دل اور ذاتی درد و غم کی مکمل عکاسی کی ہے۔

نورالحسن ہاشمی کی کتاب "دلی کا دبستانِ شاعری" پہلی بار ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں دبستانِ دلّی کے نمائندہ شاعروں کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ نورالحسن ہاشمی نے میرؔ کی سوانح اور شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں درد و غم کا شاعر قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"ان (میر) کی تمام آرزوؤں اور حسرتوں کا خون ہو گیا
اور یہی خون ہے جو ہم ان کے کلام میں جاری اور ساری دیکھتے
ہیں چوں کہ غزل میں گہرے غم و اندوہ، ہجر و مصائب کے
معاملات ایک خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں اس لیے میرؔ کی
طبیعت کے لیے غزل مناسب ترین ٹھہری، نتیجہ یہ ہوا کہ غزل
گوئی میں سرتاج الشعرا ٹھہرے۔" [۱۴۲]

نورالحسن ہاشمی کا خیال ہے کہ میرؔ کے اشعار نشتر کی طرح دوسروں کے دل میں اتر جاتے ہیں لیکن نورالحسن ہاشمی میر کے اشعار میں تہہ داری کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

"میر کے اشعار گہرے سمندر کی طرح بہ ظاہر ساکن و

خاموش ہیں لیکن ان کے اندر بے پناہ گہرائیاں پوشیدہ ہیں''۔۴۳؎

نورالحسن ہاشمی نے میرؔ کی شخصیت اور شاعری کو ہم آہنگ کرتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں کلامِ میرؔ کی گہرائی اور تہہ داری کی طرف اشارہ کیا ہے وہ میرؔ کو غزل کا سرتاج الشعراء قرار دیتے ہیں اور غزل کو ان کی طبیعت کے لیے مناسب ترین ٹھہراتے ہیں۔ نورالحسن ہاشمی نے چند صفحات میں اس بات پر زور دیا ہے کہ میرؔ کی زندگی اور ان کے عہد کے واقعات ان کی شاعری کا حصہ بن گئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی شعرالہند ۱۹۴۹ء میں طبع ہوئی اس کتاب کے پہلے صفحے پر لکھا ہے۔

شعرالہند

حصّہ اوّل

جس میں قدماء کے دور سے لے کر دورِ جدید تک اُردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل کی گئی ہے اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے۔۴۴؎

شعرالہند میں مولانا عبدالسلام ندوی نے میرؔ و سوداؔ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''--------قدماء کے دور کے جو محاسن ہیں وہ دونوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً غزل گوئی کا داخلی پہلو دونوں برتتے ہیں، یعنی دونوں کی غزلیں جذبات و واردات سے لبریز ہوتی ہیں، سادہ اور لطیف تشبیہات دونوں کے یہاں موجود ہیں، فارسی زبان کی دلآویز ترکیبوں کو دونوں استعمال کرتے ہیں، اسی طرح اس دور کے معائب بھی دونوں کے یہاں کم وبیش موجود ہیں، جابجا زبان دونوں کی فحش اور مبتذل ہے۔ کہیں کہیں سبک مضامین دونوں باندھ جاتے ہیں، شتر گربگی یعنی کلام کی ناہمواری دونوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔''۴۵؎

عبدالسلام ندوی نے ان دونوں عظیم شاعروں کی تحسین کے ساتھ ان کی خامیوں کی طرف بھی جابجا اشارے کیے ہیں۔

"میر تقی میرؔ اور خارجی حالات کی ترجمانی"

سید محی الدین قادری زور کا اہم مضمون ہے جس میں انھوں نے میرؔ کی شاعری میں خارجی حالات کی ترجمانی کو خاص اہمیت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہ سمجھنا چاہئے کہ میر نے کائنات اور اس کی فطرت کے متعلق کوئی قابلِ وقعت مرقع نہیں پیش کیا۔ اس بارے میں ان کی مثنویاں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں جب ہم ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میر کی شاعری میں خارجی حالات کے مرقعوں کی کمی نہیں ہے"۔ ۳۶

قادری زور لکھتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری زیادہ تر ان کی اپنی زندگی کی تصویر کو پیش کرتی ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ میر صرف اسی میں کھو کر رہ گئے۔ میر نے زندگی کے دوسرے واقعات کو بھی بخوبی پیش کیا۔

مسیح الزماں کی کتاب مراثی میرؔ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اصل میں یہ میرؔ کے مرثیوں کا انتخاب ہے۔ جسے اس دور کی خاص انجمن محافظ اردو نے شائع کیا۔ اس انتخاب میں مسیح الزماں کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس میں انھوں نے مراثی میرؔ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس انتخاب کو مراثی میرؔ کے اوّلین انتخاب ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جس میں میرؔ کے کل اکتالیس مرثیے اور سلام شامل ہیں۔ اور یہ مجموعہ بقول مسیح الزماں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> میر کے مرثیوں کا مطالعہ کرتے وقت انیسؔ یا ان کے معاصرین کا کلام سامنے رکھ کر ان سے موازنہ کرنا ایسی ہی غلطی ہوگی جیسے کسی بارہ سال کے بچے کی ایک پچیس سال کے جوان سے زور آزمائی کرانا۔ ان کے مرتبے کا اندازہ ان کے معاصرین

اور پیش روؤں کے مرثیوں کے پس منظر میں ہی ہو سکتا ہے اور جب ان کے ماحول، حالات اور معاصرانہ تخلیقات کے ساتھ ہم ان کے مرثیے دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں اپنے عہد کے کامیاب مرثیہ گو نظر آتے ہیں۔ میر کے یہ مرثیے ان کی غزلوں کے مقابلے میں کم درجہ سہی لیکن اردو مرثیے کی تاریخ میں ان کا درجہ واضح اہم اور ممتاز ہے۔ اور اس صنف سخن کے ارتقاء میں ان کے خدمات فراموش نہیں کیے جا سکتے۔[۴۷]

لیکن ایک اہم بات جس کی طرف مسیح الزماں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ میرؔ کے مرثیوں میں وہ درد و کسک اور نشتریت نہیں ہے جو ان کی غزلوں میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میر کے مرثیوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

امداد امام صابری کی کتاب ''تلامذۂ میرؔ'' ایک دلچسپ کتاب ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس میں میر کے شاگردوں کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ امداد امام صابری نے لکھا ہے کہ میرؔ آسانی سے کسی کو اپنا شاگرد نہیں بناتے تھے۔ وہ ہمیشہ شاگرد بنانے کے معاملے میں محتاط رہے۔

میرؔ صاحب شاگرد بنانے میں بڑے محتاط تھے جب تک اپنے اصولوں پر پرکھ نہیں لیتے تھے شاعری کے قابل و لائق اور موزوں نہیں سمجھتے تھے، یعنی جو بھی طبع سلیم اور ذہن لطیف اور معقول استعداد کا مالک ہوتا تھا اس کو وہ اپنا شاگرد بناتے تھے۔''[۴۸]

امداد امام صابری نے میر کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست دی ہے، جن میں بیگم، پروانہ، تجلّی (میر حسن صاحب) جان، خادم، عرش (میر کلّو) فیض (میر فیض علی) قابلِ ذکر ہیں۔

رسالہ ''تحریر'' میں **عابد رضا بیدار** کا مضمون ''میرؔ کا مطالعہ'' ۱۹۶۷ میں

شائع ہوا۔ اس میں عابد رضا بیدار نے لکھا ہے کہ میرؔ صرف دل کے داغوں کی بہار دیکھنے والے شاعر نہیں تھے بلکہ انھیں دنیا کی تمام اشیاء سے دلچسپی تھی وہ خاصے عملی اور خاصے دنیا ساز آدمی تھے۔ ان کی زبان دلی کی گلیوں کی زبان تھی۔

مالک رام نے اپنے مضمون ''میرؔ کی عظمت'' میں کلام میرؔ پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''۔۔۔۔۔۔ان (میرؔ کے) اشعار میں کہیں بھی کسی ایسی کیفیت یا جذبے کا بیان نہیں، جو ہماری اس گوشت پوست کی دنیا میں پیش نہ آتا ہو۔ حسن وعشق کا گھاؤ، ان کے باہمی تعلقات، ہجر ووصال کے معاملات یہ سب فطری حادثے ہیں ۔۔۔۔۔۔ میر نے اپنے خیالات اور جذبات واحساسات کو جس زبان اور خاص کر جس لہجے میں بیان کیا ہے، ان کا حصہ ہو کے رہ گیا ہے۔'' ۴۹

احمد جمال پاشا نے اپنی کتاب ''ہجویاتِ میرؔ'' میں میر کی بے دماغی، یاسیت، قناعت اور صاف گوئی کو ان کے ہجوگو ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

> ''میر کی ہجویات میں بیبا کی ہے مگر اوباشی نہیں، بس معلوم ہوتا ہے کہ ایک جہاندیدہ شخص نصیحت کے پیرائے میں زمانے کے گرم وسرد سے آشنا کر رہا ہے۔'' ۵۰

احمد جمال پاشا نے میر کی ہجویات کو ان کے زمانے کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور اخلاقی بدحالی کے لازوال مرقعے کہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میرؔ کی شخصیت اور شاعری کو ان کے زمانے کے حالات کی روشنی میں سمجھنے کے لیے ''ہجویات میر'' کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

''میرؔ کی شاعری کا مزاج'' ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کا مضمون ہے۔ یہ رسالہ ''تحریر'' میں ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ صدیق الرحمٰن میرؔ کو ایک حوصلہ مند انسان قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں میرؔ اپنی حالت پر محض روتے ہی نہیں ہنستے بھی ہیں

وہ زندگی کے غموں کے بوجھ تلے دبنے کے باوجود اس بوجھ کو کم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ان کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ ان کا کلام ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔اپنے انداز اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ ہمیں اپنے بہت قریب لگتے ہیں اور ان کی آواز ہمیں اپنے دل کی دھڑکنوں میں سنائی دیتی ہے ان کے کلام کا جادو یہ ہے کہ وہ سننے والے کو ''من تو شدم تو من شدی'' کی منزل پر لے آتا ہے۔ ۵۱

صدیق الرحمٰن قدوائی میرؔ کو ایک ایسا شاعر قرار دیتے ہیں جس کی ذاتی محرومیوں اور ناکامیوں کے ڈانڈے اس دور کے سماج کے انتشار و اضمحلال سے جاملتے ہیں۔انھوں نے لکھا ہے:

> ''۔۔۔۔۔میرؔ کے غم کا سبب ان کی ذاتی محرومیاں اور ناکامیاں ضرور تھیں مگر اس ذاتی غم کے ڈانڈے ایک قطعاً غیر شعوری عمل کی بنا پر اس وقت کے اجتماعی انتشار و اضمحلال سے جا کر ملتے ہیں۔ دراصل میرؔ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا عروج و زوال ملک کے عروج و زوال کا آئینہ ہوتا تھا۔ برہمی اور انتشار کے اس دور میں جو سب پر بیتی وہی میر پر بھی بیتی۔۔۔۔ میرؔ اپنے معاشرے سے الگ نہیں جو کچھ ان پر گزری وہ سب پر گزر رہی تھی۔'' ۵۲

اُردو کے ایک مشہور ناقد **شوکت سبزواری** کو سرے ہی سے میرؔ کی استادی سے انکار ہے۔وہ میرؔ کے بارے میں چلی آرہی یاس و حرماں نصیبی کی روایت کا ایک حصہ ہیں۔ان کے خیال میں:

> میرؔ نظر اٹھا کر کائنات کو دیکھتے ہی نہیں اور اگر کبھی خونِ دل کھانے اور آنسو بہانے سے فرصت پاتے ہیں اور باغِ جہاں کا کوئی شگفتہ پھول نظر پڑ جاتا ہے تو وہ انھیں لہو بھرا ساغر نظر آتا ہے۔'' ۵۳

شوکت سبزواری نے میرؔ پر براہ راست کوئی مضمون نہیں لکھا ہے ان کا مضمون میرؔ و غالبؔ بھی ان کی کتاب فلسفۂ غالب پر اثر لکھنوی کے تبصرے کا جواب ہے۔ جس میں

انھوں نے غالبؔ کو عظیم شاعر اور میرؔ کو زندگی کا نوحہ خواں دکھانے کی کوشش کی ہے۔''

باقر مہدی کا مضمون ''میر اور ہم'' خاصا دلچسپ اور اہم ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میرؔ نے دوبار دہلی کو اجڑتے دیکھا اور خود انھوں نے ۱۹۴۷ء میں دہلی کے فسادات کی تباہی دیکھی دونوں خوش نصیب تھے کہ ان ہنگاموں میں بچے رہے وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ سے ان کا پہلا تعلق اسی وقت قائم ہوا تھا اور انھوں نے میرؔ کے رنگ میں غزلیں کہنی شروع کر دیں۔ باقر مہدی لکھتے ہیں:

> ''میرؔ تو اپنے عہد کے سچے ترجمان تھے۔۔۔۔ میر کی آنکھیں۔۔۔۔۔ وہ تاریخی آنکھیں ہیں جو مظالم کو آنسوؤں کی زبان میں رقم کرتی ہیں اور یہ آنسو ایسے تھے کہ آج تک وہ کا غذ نم ہے۔''۵۴

باقر مہدی لکھتے ہیں کہ صبر، عشق اور غم میرؔ کی اہم شاعرانہ خصوصیات ہیں اس تثلیث کی بدولت ہی وہ زندگی کا سامان کر سکے۔

ان کے خیال میں میرؔ کی شاعری کارزارِ حیات کی سب سے دلکش آواز ہے۔ ان کی نرمی و گھلاوٹ ان کے درد میں مسرت تلاش کر لینے کے سبب ہے۔

سلیم احمد اپنے تنقیدی رویے کے لیے مشہور ہیں۔ وہ تنقید میں جس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں وہ تنقید کو تعریض بنا دیتی ہے۔ انھوں نے میرؔ پر کتاب لکھی ہے لیکن اس کا نام ''غالبؔ کون؟'' ہے۔ یہ کتاب ستمبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے مختلف عنوانات شاعری اور شخصیت، شخصیت مثبت اور منفی، شخصیت انا اور اصول حقیقت، شخصیت انا اور شعور، شخصیت انا اور لاشعور، شخصیت اور اسلوب وغیرہ سے کتاب کے نفسیاتی مطالعہ ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن سلیم احمد کے مضحکانہ رویے نے پوری کتاب کو ایک غیر سنجیدہ کتاب بنا دیا ہے۔ پوری کتاب میں میرؔ کی تعریف میں کم جملے ملیں گے لیکن غالبؔ کی ہجو میں زیادہ۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے 'غالبؔ کون؟' کے بارے میں لکھا ہے۔

> ''میرؔ کو غالبؔ سے بڑھانے کی حد تک سلیم احمد نے بھی استاد (حسن عسکری) کی ہاں میں ہاں ملائی۔ عسکری نے جو کچھ چھوٹے چھوٹے مضمونوں میں کہا اسی کو سلیم احمد نے چھوٹی سی

کتاب۔ ''غالب کون'' میں اپنے بے مثال، شگفتہ لیکن غیر تنقیدی
رنگ میں مفصل دہرا دیا۔'' ۵۵

شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ناقد کا سلیم احمد کے لہجے/ زبان کو بے مثال اور شگفتہ قرار دینا بھی محلِ نظر ہے۔ جہاں تک نقدِ میرؔ کا تعلق ہے سلیم احمد کو نقدِ میر میں ایک غیر سنجیدہ، غیر تنقیدی انداز کے لیے یقیناً یاد رکھا جائے گا ان کی ایک سو ساٹھ صفحے کی کتاب ''نقدِ میر'' میں کوئی اضافہ نہیں کرتی اور شاید اسی لیے ان کے بعد اس لب و لہجے کو کسی نے نہیں اپنایا۔

کاظم علی خاں کی کتاب ''غزلیات میرؔ کا تنقیدی جائزہ'' ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں ''میر کی حیات اور شخصیت سے لے کر ان کے کلام کے موضوعات اور ان کی شاعری کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کاظم علی خاں کا خیال ہے کہ ''معیاری اور جامع تنقید کے لیے شاعر کے عہد کے خارجی ماحول، شاعر کی داخلی کیفیت اور اس کے فنی پہلوؤں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ اس لیے میرؔ کے مطالعہ کے وقت وہ میرؔ کے عہد کے خارجی ماحول اور ان کے کلام پر اس کے اثرات کی نشاندہی کے علاوہ، میر کی ذاتی زندگی اس کے مصائب اور پھر آخر میں ان کی شاعری کی فنی خصوصیات پر تفصیل سے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ہم سرسری طور پر بھی ان (میرؔ) کے دیوان پر نظر ڈال
کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے کلام پر خارجی
ماحول کے زیر اثر ایک کسک، غم اور حزنیہ عنصر کی گہری چھاپ لگی
ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ خارجی ماحول کے ساتھ ساتھ میر کی زندگی
کے ذاتی مصائب نے بھی ان کی غزلوں کو حزنیہ لہجہ دیا۔'' ۵۶

کلامِ میرؔ پر ان کے ماحول اور شخصیت کے اثرات کی نشاندہی کے علاوہ کاظم علی خاں نے ان کی شاعری کو جذبہ و احساس کی شاعری قرار دیا ہے۔ کاظم علی خاں کا خیال ہے کہ

''میر کی شاعری وجدان کی سرکردگی میں جذبات و
واردات کی مصوری ہے۔'' ۵۷

وہ دردوغم کو میرؔ کی شاعری کا بنیادی عنصر قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ میرؔ کی ذاتی زندگی اور خارجی حالات کو ٹھہراتے ہیں۔ کاظم علی خاں کا ایک اور اہم مضمون ''میرؔ اور لکھنؤ'' رسالہ آجکل ۱۹۸۴ء اور غالب نامہ (جولائی ۲۰۰۰ء) میں شائع ہوا ہے۔ یہ تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے۔ جس میں مصنف نے لکھنؤ شہر سے میرؔ کی وابستگی پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عقیل رضوی (۱۹۲۸ء) اُردو کے اہم ناقدوں میں ہیں۔ مرثیہ کی سماجیات، نئی علامت نگاری، غزل اور مختلف موضوعات پر ان کی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میرؔ پر ان کے کسی مضمون تک میری رسائی نہ ہوسکی۔ ان کا ایک مضمون ''مجھے گفتگو عوام سے ہے'' ترقی پسند تحریک کے پچاس سالہ سفر میں شامل ہے، اس مضمون میں انھوں نے میرؔ کی شاعری، میرؔ کی زبان اور میرؔ کے عوامی لب و لہجے کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس مضمون کا احاطہ بہت وسیع ہے اور ڈاکٹر عقیل رضوی نے بعض دوسرے اہم شعراء پر بھی گفتگو کی ہے لیکن جہاں بھی انھوں نے میرؔ کا حوالہ دیا ہے وہ میرؔ کو ایک نئے نقطۂ نظر سے سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔

> ''ان (میرؔ) کی غزل میں سب طرح کے اشعار موجود ہیں کبھی کبھی بہت معمولی اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو محض رعایت لفظی کا شوق ہیں مگر مخاطب کے دل میں اپنے محسوسات کو اتار دینے کا فن گفتگو میں سامع کو متاثر کرنے کی جو کوشش میرؔ کے یہاں ملتی ہے بہت کم ان کے ہم عصروں کے یہاں ملے گی۔۔۔۔۔ میرؔ کی تمام شاعری خصوصاً غزلوں میں باتوں پر خاصا زور ہے۔ یعنی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، کس سے کہہ رہے ہیں اور کیسے کہہ رہے ہیں اور یہیں سے انھوں نے ''پر مجھے گفتگو عوام سے ہے'' والی بات لی ہے۔ اور پھر غزل کا عموماً یہی مزاج بن گیا۔ داغؔ نے بھی میرؔ سے یہی مکالمے اور باتیں، والی صفت اڑائی تھی۔'' ۵۸

ڈاکٹر عقیل رضوی نے اپنے مضمون میں اس بات پر زور دیا کہ میرؔ اپنے عہد کے

عام انسان کی زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں اور یہ میرؔ ہی کا اثر ہے جو عام زبان محاورے اور عام زندگی کے حوالے اردو غزل کا حصہ بن گئے۔

پروفیسر احمد علی نے اپنی کتاب ایک سنہری روایت (The Golden Tradition) میں میر کا تقابل انگریزی رومانی شعراء سے کیا ہے، یہ کتاب کولمبیا یونیورسٹی امریکہ سے (۱۹۷۳ء) میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہماری رسائی سے باہر ہے لیکن باقر مہدی نے اس کے کچھ اقتباسات کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''ان کی (احمد علی) کی رائے میں میر کے پائے کا شاعر انگریزی رومانی شعراء میں کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔احمد علی کا خیال ہے کہ میر کے ذہن کی جستجو ہمیں ان اشعار سے کرنی چاہئے جو میر نے دل کو محور بنا کر کہے تھے۔'' ۵۹

ڈاکٹر یوسف حسین خاں (۱۹۰۲ء۔۱۹۷۹ء) اردو کے مشہور محقق و ناقد ہیں۔ اقبالؔ اور اردو غزل پر ان کی کتابیں تحقیق و تنقید میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ میر تقی میر پر ان کا کوئی مضمون یا کتاب میری نظر سے نہیں گذری لیکن اردو غزل میں انھوں نے بہت سی جگھوں پر میر کے حوالے بھی دیئے ہیں اور اپنی تنقیدی رائے کا بھی اظہار کیا ہے اور چونکہ میر پر ان کا تبصرہ میرؔ تنقید کا ایک حصہ ہے اس لیے یہاں پر ان کا حوالہ ضروری سمجھا گیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اردو غزل میں میرؔ کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ میرؔ کے کلام سے درد و غم کی تصویر ابھرتی ہے لیکن وہ میرؔ کو قنوطی یا غم والم کا شاعر نہیں مانتے۔ ان کے خیال میں میرؔ اپنے غم سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان میں سوز و گداز کو جینے کا سلیقہ بنانے کی صلاحیت ہے۔

> ''۔۔۔۔قدماء میں میرؔ تقی میرؔ نے اپنے کلام میں درد والم اور ناکامی اور مایوسی کی جھلکیاں دکھائیں اور اس سلیقے سے دکھائیں کہ ان کی نظیر آج تک نہ پیدا ہوئی۔ میر کے سوز و گداز میں انفرادی رنگ ہے جس

> کی تاثیر کی کوئی حد نہیں ہے۔۔۔۔۔انھوں نے جس غم کا ذکر کیا ہے وہ زندگی کی اساسی حقیقت ہے اس کے بغیر انسانی سیرت نہیں بن سکتی۔ اور اس کی پوشیدہ قوتیں اور صلاحیتیں نہیں اُبھر سکتیں۔ ٦٠

اس طرح یوسف حسین خاں نے میرؔ کے یہاں سوز و گداز کے باوجود وہ توانائی اور زندگی دیکھی جو انسان کو بلند اور ارفع منزلوں تک پہنچاتی ہے۔

قاضی عبدالستار کا مقالہ ''اردو شاعری میں قنوطیت'' پی ایچ ڈی کے لیے لکھا گیا یہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ مقالے میں شامل میرؔ و سودا والے باب میں قاضی عبدالستار نے میرؔ کی شاعری پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے انھوں نے پہلے ہی اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں قنوطیت کی موجودگی کے معنی یہ نہیں کہ وہ حقیقت میں قنوطی ہے۔ عظیم سے عظیم رجائی شاعر کے یہاں بھی قنوطیت کی لے مل سکتی ہے اور بڑے سے بڑے قنوطی شاعر کے کلام میں رجائی آہنگ مل سکتا ہے یہ ضرور ہے کہ کسی بھی شاعر کے کلام پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل اس عہد کے خارجی حالات و حوادث پر نظر رکھنی چاہئے۔ میرؔ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ''میرؔ کی قنوطیت پر بحث کرنے سے پہلے ان خارجی حالات و حوادث کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ جنھوں نے میرؔ کی زندگی کو اندوہ و الم کی آماجگاہ بنادیا۔۔۔۔۔۔ یہ اشعار صرف میرؔ کے عہد اور صرف میرؔ کے دل سے نکل سکتے ہیں۔ داخلی اور خارجی زندگیوں کی شکستوں نے ان میں شعری صداقت اور تاثیر کا جادو بھر دیا ہے شاید انھیں اشعار کو خواجہ احمد فاروقی نے ''دل و دلی کے مرثیے'' کہا ہے۔ تشبیہات کی تلاش میں۔۔۔۔۔۔ مزاج سے زیادہ مشاہدہ۔۔۔۔۔۔ شاعر کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان تمام اشعار کی تشبیہات دلی کے کھنڈروں سے تراشی گئی ہیں۔'' ٦١

قاضی عبدالستار میرؔ کو قنوطی قرار دیتے ہیں لیکن بار بار ہماری توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں کہ میرؔ کی اس قنوطیت کا سبب ان کے ذاتی و خارجی حالات تھے۔ انھوں نے لکھا

ہے کہ میرؔ اپنی ذاتی وسماجی زندگی میں بری طرح ناکام رہے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی اور ان کے عہد کی دلّی، دونوں کی عکاس ہے۔

> ''میر اپنی ذاتی اور سماجی زندگی میں بری طرح ناکام رہے۔ ہر طرح کے مصائب ذہنی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی انھیں اٹھانے پڑے۔ اس صورت حال میں ''خیال'' جس پر شاعر کا دارومدار ہوتا ہے اور جسے ذاتی، سماجی اور تاریخی عوامل اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں سر سے پیر تک خون میں نہایا ہوا۔ میر کے حصے میں آیا۔۔۔۔۔۔ اپنی زندگی کی بربادی اور خوابوں کی شکست کے بیان میں میر نے جس انداز بیان اور اپنے خیال تفہیم کے لیے جو سہارے لیے ہیں وہ ایک طرف تو میر کی ناکامی حیات کے غماز ہیں اور دوسری طرف دلّی کی سوگواری کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔'' ۶۲

قاضی عبدالستار کے مقالے کا عنوان ''اُردو شاعری میں قنوطیت'' ہے اس لیے وہ میرؔ کو قنوطی شاعر ضرور قرار دیتے ہیں لیکن میرؔ کی قنوطیت کا سبب وہ عہد میرؔ کے حالات کو ٹھہراتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عبدالستار کہیں نہ کہیں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں۔

پروفیسر شکیل الرحمان اُردو کے اہم جمالیاتی ناقد ہیں ان کا بنیادی کام جمالیات پر ہے۔ انھوں نے غالب، میر اور بعض دوسرے شعراء کا کامیاب جمالیاتی مطالعہ کیا ہے۔ میر پر ان کا مضمون جابر حسین نے اردو مرکز عظیم آباد پٹنہ سے کتابی شکل میں ''میر شناسی'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ شکیل الرحمٰن میرؔ کو شدید جمالیاتی احساس کا شاعر مانتے ہیں۔ شروع میں انھوں نے ہندوستانی جمالیات اور بالخصوص شرنگاررس کی روشنی میں میرؔ کی غزل میں ان کے تڑپتے ہوئے جذبات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

> ''میر سے زیادہ سے زیادہ جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ میر تجربوں کو شدت عطا کرنے اور جذبوں سے ''لطف اندوز'' کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ میر صاحب نے

> اپنی حُسن پسندی کا اظہار کھل کر کیا ہے۔ان کی شاعری حسن کے حسّی ردعمل کی ایک بڑی خوبصورت شاعری ہے۔''۶۳

میرؔ کے مطالعے میں شکیل الرحمٰن نے ان کے حسّی اور جمالیاتی تجربے کو بنیاد بنایا ہے۔ اپنے اس مطالعہ سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میرؔ "Pleasurable Sensation" کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے دعوے کی دلیل میں میرؔ کے اشعار سے تفصیلی بحث کی ہے۔انھوں نے میرؔ کے شعر

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''میر صاحب نے حسنِ آفاق اور حسنِ زندگی کو جس طرح ایک شعر میں فنکارانہ انداز میں سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔یہ شعر اچانک حسن جمال کے ارفع امیج (Image) کو پیش کردیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ زندگی کے حسن کے تئیں بیدار کرتا ہے۔میرؔ کی تخلیقی اور تخیلی فکر کا کرشمہ یہ ہے کہ ان کے بعض 'امیجز' اپنے Sense Impressian کی گہرائی سے قاری کے احساساتی تاثر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہاں تخیل، تصوّر اور فینسی (Fancy) کی آمیزش سے ایک خوبصورت شعری جمالیاتی تجربہ سامنے آیا۔''۶۴

پروفیسر شکیل الرحمٰن کا مقالہ ''میر شناسی'' نقدِ میر میں اس لیے ایک اضافہ ہے کہ انھوں نے تفصیل سے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو فلسفۂ جمال کی روشنی میں اہم ہوسکتے تھے۔ یہ مقالہ ان کے دوسرے جمالیاتی مطالعوں کی طرح ضخیم نہیں ہے اور اس میں صرف میرؔ کی غزلوں پر ہی گفتگو کی گئی ہے لیکن میرؔ کے مطالعے کے سلسلے میں یہ ایک اہم کڑی ہے۔

ڈاکٹر شفیقہ پروین کی کتاب موثراتِ میرؔ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔اس میں انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت شاعری اور کلام میرؔ پر اظہار خیال کیا ہے

جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے شفیقہ پروین نے میرؔ کے بعد آنے والے شعراء پر اُن کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے انھوں نے ''غزل میں روایت اور تجربہ'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے اور ایلیٹ و کارلایل و دوسرے ناقدین کے حوالے سے روایت کی اہمیت اور اس سے استفادہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے خیال میں:

> ''جدید شاعر یا ادیب کو روایت پرست اور کلاسیکی ہونا چاہیے ورنہ اس کے فن کے نیست و نابود ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔۔۔ ۶۵

وہ مزید لکھتی ہیں کہ:

> روایت کی جڑوں کو کاٹ کر نئی زبان، نیا انداز نیا اسلوب، نئی فضا اور نیا رنگ تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ مگر روایت کی اندھا دھند تقلید بھی ٹھیک نہیں لیکن زبان کی خصوصیات کو سمجھنے اور اس کے ارتقاء کو دیکھنے کے لیے فنکار کو کسی بھی صورت میں کلاسیک اور روایت سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔'' ۶۶

شفیقہ پروین نے مزید لکھا ہے کہ میر ایک ایسا شاعر ہے جس نے آنے والی نسل کو اپنے کلام سے اس قدر متاثر کیا ہے کہ شعراء اس کی تقلید میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء کے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس عہد کے شعراء نے میر کے یہاں پناہ پائی۔ اس زمانے کے واقعات نے شعراء کو جن حالات سے دوچار کیا اس کا مداوا انھیں میر کے یہاں نظر آیا، خصوصاً ناصر کاظمی نے میرؔ کی زبان اور لہجے کو اپنایا، وہ اپنے پرسوز انداز کے سبب میرؔ کے سب سے قریب تھے۔ شفیقہ پروین نے خلیل الرحمٰن اعظمی، معین احسن جذبیؔ، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، ابن انشاء، شاذ تمکنت، حسن نعیم، شہریار اور بشیر بدر کے یہاں میرؔ کے اثرات کی نشاندہی کی ہے اور مثالوں کے ذریعہ اپنی بات کو مدلّل انداز میں کہنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کلیاتِ میرؔ کے مقدمے ہوں یا فرہنگِ میرؔ کا مقدمہ ان سب میں میر کی شاعرانہ خصوصیات کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے گذشتہ صفحات میں میرؔ پر شائع ہونے والے خاص نمبر اور مضامین کے مجموعوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اگر غور

سے دیکھا جائے تو یہ خاص نمبر اور مجموعے میر تنقید میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں ان کی اہمیت کے دو پہلو ہمارے سامنے بالکل واضح ہیں اوّل یہ کہ ان رسائل اور مجموعوں نے میرؔ کی مقبولیت کے احاطے کو وسیع کیا اور انھیں عام قاری تک پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ ان سے میرؔ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور میرؔ کے بارے میں ایک نیا شعور پیدا ہوا۔ دوسرے ادباء اور ناقدین نے میرؔ شناسی کے نئے نئے پہلو پیدا کئے اور میرؔ پر ہر زمانے کی روش کے مطابق لکھا گیا مثلاً نیرنگِ میر کا خاص نمبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا اور غالب نامہ کا میر تقی میرؔ نمبر سنہ ۲۰۰۰ء میں سنہ ۱۹۲۸ء اور ۲۰۰۰ء کے درمیان تاریخ کا ایک وسیع عرصہ ہے اگر ان رسائل کے مضامین کو غور سے دیکھا جائے تو میرؔ تنقید کا پورا Development ارتقاء ان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میرؔ کی کلاسکی بازیافت سے جدید ترین نقطۂ نظر تک ان خاص نمبروں اور مضامین کے مجموعوں میں مل جاتا ہے اسی لیے خاص طور پر اس باب میں ان کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ساتھ ہی یہ مضامین میرؔ تنقید کے ابعاد کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس کا مطالعہ اگلے صفحات میں کیا گیا ہے۔

حواشی

۱۔ محمد حسن عسکری، میر کی فنی شخصیت، مشمولہ رسالہ ساقی میرؔ نمبر۔ کتب خانہ انجمن ترقی کراچی۔ ۱۹۵۸ء

۲۔ محمد حسن عسکری۔ پیش لفظ۔ ص۔ ا۔ ساقی میرؔ نمبر مرتبہ محمد حسن عسکری کتب کانہ انجمن ترقی کراچی ۱۹۵۸ء

۳۔ محمد حسن عسکری۔ پیش لفظ۔ ص۔ ا۔ ساقی میرؔ نمبر مرتبہ محمد حسن عسکری کتب کانہ انجمن ترقی کراچی ۱۹۵۸ء

۴۔ ڈاکٹر سلامت اللہ خاں۔ کیا میرؔ قنوطی تھے؟۔ ص۔ ۱۵۹۔ مشمولہ دلی کالج میگزین میرؔ نمبر۔ کوہ نور پریس۔ ۱۹۶۲ء

۵۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری، بزبان میرؔ کی خصوصیات۔ ص۔ ۳۴۴۔ مشمولہ رسالہ نقوش میر تقی میر نمبر (۵) شمارہ ۔ ۱۲۶

۶۔ حسن واصف عثمانی، میرا اپنے تاریخی پس منظر میں۔ ص۔ ۱۷۱۔ ۱۵۹۔ مشمولہ رسالہ نقوش میر تقی میرؔ نمبر ۲۰) شمارادارہ فروغ اردو لاہور نومبر ۱۹۸۰ء

۷۔ ڈاکٹر امرناتھ، میر تقی میرؔ۔ ص۔ ۲۹۸۔ مشمولہ رسالہ نقوس میر تقی میرؔ نمبر نومبر ۱۹۸۰ء

۸۔ شبیہ الحسن نونہروی، مدت رہی گی یاد یہ باتیں ہماریاں۔ ص۔ ۳۲۷، ۳۲۶۔ مشمولہ رسالہ نقوش میر تقی میر نمبر (۲) شمارہ ۱۲۶، ادارہ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۸۰ء

۹۔ شبیہ الحسن نونہروی، مدت رہی گی یاد یہ باتیں ہماریاں۔ ص۔ ۳۲۸۔ مشمولہ رسالہ نقوش میر تقی میر نمبر (۲) شمارہ ۱۲۶، ادارہ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۸۰ء

۱۰۔ شبیہ الحسن نونہروی، مدت رہی گی یاد یہ باتیں ہماریاں۔ ص۔ ۳۳۰۔ مشمولہ رسالہ نقوش میر تقی میر نمبر

(۲) شمارہ ۱۲۶، ادارہ فروغ اردو لاہور نومبر ۱۹۸۰ء
۱۱۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ ''میر کی عشقیہ مثنویاں'' مشمولہ رسالہ نقوش میرؔ نمبر نومبر ۱۹۸۰ء
۱۲۔ وارث علوی، میر اور جدید ذہن۔ صفحہ۔ ۵۱۔ مشمولہ رسالہ آجکل میر تقی میرؔ نمبر اردو پبلیکشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۴ء
۱۳۔ عبدالمغنی، میر کا تصور انسان، صفحہ۔ ۷۰۔ مشمولہ رسالہ آجکل میر تقی میرؔ نمبر اردو پبلیکشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۴ء
۱۴۔ محمود ہاشمی، میرؔ کی شاعری کا اسم اعظم۔ صفحہ۔ ۲۷۔ مشمولہ رسالہ آجکل میر تقی میرؔ نمبر اردو پبلیکشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۴ء
۱۵۔ محمود ہاشمی، میرؔ کی شاعری کا اسم اعظم صفحہ ۳۷ مشمولہ رسالہ آجکل میر تقی میرؔ نمبر اردو پبلیکشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۴ء
۱۶۔ ڈاکٹر حنیف، میر اور بندش الفاظ صفحہ ۹۱۔ ۹۲ مشمولہ رسالہ آجکل میر تقی میرؔ نمبر اردو پبلیکشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۴ا
۱۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میرؔ کی شخصیت ان کے کلام میں۔ ص۔ ۴۷۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء
۱۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میرؔ کی شخصیت ان کے کلام میں۔ ص۔ ۵۰۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء
۱۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میرؔ کی شخصیت ان کے کلام میں۔ ص۔ ۵۴۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میر نمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء
۲۰۔ شمیم حنفی، میر اور غالبؔ۔ ص۔ ۳۴۵۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء
۲۱۔ شمیم حنفی، میر اور غالبؔ۔ ص۔ ۳۴۴۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء
۲۲۔ شمیم حنفی، میر اور غالبؔ۔ ص۔ ۳۴۵۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء
۲۳۔ شمیم حنفی، میر اور غالبؔ۔ ص۔ ۳۴۸۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء
۲۴۔ شمیم حنفی، میر اور غالبؔ۔ ص۔ ۳۵۲۔ مشمولہ رسالہ غالب نامہ میر تقی میرؔ نمبر، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی، جولائی ۲۰۰۰ء

۲۵۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، تاثراتی دبستانِ تنقید کا تخلیق کار، میر، مشمولہ غالب نامہ میر تقی میرؔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی جولائی ۲۰۰۰ء

۲۶۔ مقبول احمد لاری، دیباچہ حدیث میر ص نہیں آل انڈیا میر اکیڈمی۔ لکھنؤ ۱۹۶۷ء

۲۷۔ نظیر صدیقی، میر۔ ماضی سے مستقبل تک ص ۱۹۱ مشمولہ حدیث میر آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۶۷

۲۸۔ نظیر صدیقی، میر۔ ماضی سے مستقبل تک ص ۱۹۷ مشمولہ حدیث میر آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۶۷

۲۹۔ شجاعت علی سندیلوی، میرؔ کی زبان ص ۱۵۷ مشمولہ حدیث میر آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۶۷

۳۰۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، تعارف مشمولہ افکار میر، مرتب ایم حبیب خاں۔ ص۔ ۸۔ لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی دسمبر ۱۹۶۷

۳۱۔ ایم حبیب خاں میر کی شاعرانہ عظمت۔ ص۔ ۱۷۔ مشمولہ افکار میر، مرتب ایم حبیب خاں۔ ص۔ ۸۔ لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی دسمبر ۱۹۶۷

۳۲۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، میرؔ کی تاریخی حیثیت۔ ص۔ ۱۴۱۔ مشمولہ میر تقی میرؔ عالمی سیمینار ٹورانٹو، کینیڈا، مارچ ۲۰۰۰ء

۳۳۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، میرؔ کی تاریخی حیثیت۔ ص۔ ۱۴۵۔ مشمولہ میر تقی میرؔ عالمی سیمینار ٹورانٹو، کینیڈا، مارچ ۲۰۰۰ء

۳۴۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، میرؔ کی تاریخی حیثیت۔ مشمولہ میر تقی میرؔ عالمی سیمینار ٹورانٹو، کینیڈا، مارچ ۲۰۰۰ء

۳۵۔ فرمان فتح پوری، میرؔ کی شاعری۔ ص۔ ۱۷۵۔ مشمولہ میر تقی میرؔ عالمی سیمینار مرتب اطہر رضوی، غالب اکیڈمی ٹورانٹو، کینیڈا، مارچ ۲۰۰۰ء

۳۶۔ فرمان فتح پوری، میرؔ کی شاعری۔ ص۔ ۱۸۴۔ مشمولہ میر تقی میرؔ عالمی سیمینار مرتب اطہر رضوی، غالب اکیڈمی ٹورانٹو، کینیڈا، مارچ ۲۰۰۰ء

۳۷۔ فرمان فتح پوری، میرؔ کی شاعری۔ ص۔ ۱۸۷۔ مشمولہ میر تقی میرؔ عالمی سیمینار مرتب اطہر رضوی، غالب اکیڈمی ٹورانٹو، کینیڈا، مارچ ۲۰۰۰ء

۳۸۔ رشید احمد صدیقی، تعارف مشمولہ کلیاتِ میر مرتبہ ظلِ عباس عباسی۔ صفحہ ۴۔ جلد اوّل۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۳

۳۹۔ رشید احمد صدیقی، تعارف مشمولہ کلیاتِ میر مرتبہ ظلِ عباس عباسی۔ صفحہ ۵۔ جلد اول۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۳

۴۰۔ سید محمد عقیل رضوی مشمولہ فرہنگ کلیاتِ میرؔ ڈاکٹر فرید احمد برکاتی، آفسیٹ پریس گورکھپور ۱۹۸۸ء

۴۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ نیا عہد نامہ۔ ص۔ ۱۵۔ (شاید فروری ۱۹۴۶ء)

۴۲۔ نورالحسن ہاشمی، دلّی کا دبستانِ شاعری۔ ص۔ ۱۶۵۔ شائع کردہ ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ۔ طبع دوم ۱۹۶۵ء

۴۳۔ نورالحسن ہاشمی، دلّی کا دبستانِ شاعری۔ص۔۱۶۷۔ شائع کردہ ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ۔

۴۴۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔شعرالہند حصہ اوّل ۱۹۳۹۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء

۴۵۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔شعرالہند۔ص۔۳۹۔ ۱۹۳۹۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء

۴۶۔ سید محی الدین قادری زور۔میرتقی میرؔ اور خارجی حالات کی ترجمانی۔ص۔۳۷۔نگار۔جنوری،فروری ۱۹۵۰ء

۴۷۔ مسیح الزماں۔مراثی میرؔ۔ص۔۴۸۔مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۵۱ء

۴۸۔ امداد امام صابری۔تلامذۂ میرؔ۔ص۔۸۔۷۔فقرا کاڈمی،کمال دین بلڈنگ،راولپنڈی۔۱۹۶۵ء

۴۹۔ مالک رام "میرؔ کی عظمت"۔ص۔۳۰۔رسالہ نیا دور۔۲۶ رجنوری ۱۹۶۷ء۔مطبوعہ نو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ۔

۵۰۔ احمد جمال پاشا۔ہجویاتِ میرؔ۔صفحہ۔۱۶۔۱۹۶۷ء۔شاہی پریس۔لکھنؤ۔

۵۱۔ صدیق الرحمٰن قدوائی۔میرؔ کی شاعری کا مزاج مشمولہ رسالہ تحریر۔ص۔۱۰۵۔شمارہ نو جلد۔۳۔۱۹۶۹ء

۵۲۔ صدیق الرحمٰن قدوائی۔میرؔ کی شاعری کا مزاج ۔ص۔۹۲۔سہ ماہی رسالہ تحریر۔علمی مجلس دلی۔مرتبہ مالک رام۔۱۹۶۹ء

۵۳۔ ماہنامہ آجکل دہلی۔۱۵رمئی ۱۹۶۹ء ۔ص۔۵۔

۵۴۔ ماہنامہ جامعہ۔دہلی۔جولائی،ستمبر ۱۹۹۷ء۔ص۔۶۳۔

۵۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعرِ شور انگیز جلد اوّل ص۔۲۷۔قومی کونسل برائے فروغِ زبانِ اردو ۱۹۹۰ء

۵۶۔ کاظم علی خاں۔غزلیاتِ میرؔ کا تنقیدی جائزہ۔ص۔۱۲۔۱۰۔الواعظ صفدر پریس لکھنؤ۔جولائی ۱۹۷۲ء

۵۷۔ کاظم علی خاں۔غزلیاتِ میرؔ کا تنقیدی جائزہ۔ص۔۳۵۔ جولائی ۱۹۷۲ء

۵۸۔ ترتیب قمر رئیس۔عاشور کاظمی۔ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر۔ص۔۴۴۱۔فوٹو آفسیٹ پرنٹرس۔دہلی۔۱۹۸۷ء۔

۵۹۔ باقر مہدی۔میرؔ اور ہم۔ماہنامہ جامعہ۔دہلی۔جولائی،ستمبر۔۱۹۹۷ء ۔ص۔۷۲۔

۶۰۔ یوسف حسین خاں اُردو غزل۔ص۔۱۳۰۔معارف پریس اعظم گڑھ۔۱۹۷۷ء

۶۱۔ قاضی عبدالستار۔اُردو شاعری میں قنوطیت۔ب ت۔ ب ص۔

۶۲۔ قاضی عبدالستار۔اُردو شاعری میں قنوطیت۔ب ت۔ ب ص۔

۶۳۔ شکیل الرحمٰن۔میرؔ شناسی۔ص۔۲۳۔۲۰۔پاکیزہ۔آفسیٹ،پٹنہ۔مئی ۱۹۹۸ء

۶۴۔ شکیل الرحمٰن۔میرؔ شناسی۔ص۔۲۳۔۲۰۔پاکیزہ۔آفسیٹ،پٹنہ۔مئی ۱۹۹۸ء

۶۵۔ ڈاکٹر شفیقہ پروین موثراتِ میرؔ صفحہ ۲۸۔دارالفرقان کاٹھی دروازہ رینہ واری،سری نگر،کشمیر

۶۶۔ ڈاکٹر شفیقہ پروین موثراتِ میرؔ صفحہ ۳۲۔دارالفرقان کاٹھی دروازہ رینہ واری،سری نگر،کشمیر

باب ششم

تنقیدِ میرؔ کے مختلف ابعاد

جہاں تک تنقید میرؔ کے ابعاد کا تعلق ہے، اگر اس پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ میر تنقید میں وہ تمام صورتیں نظر آتی ہیں جو اردو میں تنقید کی ابتداء سے ہم عصر تنقید تک رائج رہی ہیں۔ میر کے بارے میں غالبؔ یا اقبالؔ کے مقابلے میں کم لکھا گیا ہے لیکن اپنے عہد میں میر کی بے انتہا مقبولیت اور اہم شعراء کے اس اعتراف کے باوجود کہ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں" اردو تنقید کی میر کی طرف کم توجہی کے سلسلے میں گذشتہ ابواب میں لکھا جا چکا ہے۔ اس کے باوجود کہ میر کے بارے میں کم لکھا گیا ہے میرؔ تنقید میں فنی، جمالیاتی، نفسیاتی، سماجی، اسلوبیاتی اور تشریحی، ہر نقطۂ نظر مل جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر عہد میں اہم ناقدین نے میر کی طرف توجہ دی اور اپنے زمانے کے اندازِ نقد کے مطابق تفہیم میرؔ کی کوشش کی۔

اُردو میں تنقید، تنقیدی بصیرت یا تنقیدی شعور، جو بھی نام دیا جائے اس کی ابتداء تذکروں سے ہوتی ہے۔ تذکروں کی تنقید کو اہمیت دی جائے یا نہ دی جائے لیکن اس کی تاریخی اہمیت اور اپنے عہد میں ان آراء کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے جب بھی تنقید کا ذکر آتا ہے تو بات تذکروں سے ہی شروع کی جاتی ہے۔ اردو شعراء سے متعلق فارسی و اردو میں لکھے جانے والے تذکروں کی تعداد تقریباً ۸۷ ہے۔ میر کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ چند کو چھوڑ کر ان تمام تذکروں میں میرؔ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

بعض تذکروں کے مولفین میر سے ناخوش تھے۔ خاص طور سے میر کے ہمعصر فتح علی الحسینی گردیزی نے نکات الشعراء کے جواب میں اپنا تذکرہ لکھا اور اس تذکرے میں میر کے تذکرے کا حوالہ تک نہیں دیا لیکن میر کی شاعرانہ حیثیت و مرتبے کو وہ نظر انداز نہ کر سکے۔ اسی لیے وہ میرؔ کو 'سخن سنج'، 'معنی ایجاذ' اور 'تلاش معنی بیگانہ' جیسی اصطلاحات کے ذریعہ یاد کرتے ہیں۔ گردیزی کا میر کے شاعرانہ مرتبے کا اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ مخالفین بھی ان کے قدردان تھے۔ گردیزی کے علاوہ تذکرۂ شورش کے مصنف میر غلام حسین شورشؔ اور مسرت افزاء کے مؤلف ابوالحسن نے میر کے کلام سے زیادہ ذاتی پرخاش کو اہمیت دی۔

حیات میرؔ میں ان تین تذکرہ نگاروں کے علاوہ جن اہم تذکرہ نگاروں نے میرؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے تاثرات قلمبند کئے ان میں لچھمی نرائن شفیقؔ، قدرت اللہ شوقؔ، مبتلاؔ، ابراہیم، مصحفیؔ، خوب چند ذکاؔء، اعظم الدولہ سرور اور میر حسن نے کلام میرؔ کی ان اہم خصوصیات کی نشاندہی کی جن پر بعد میں ہمارے ناقدین نے نقد میرؔ کی بنیاد رکھی۔ ان تذکرہ نگاروں نے تقریباً دوسو سال قبل میرؔ کی زندگی میں میرؔ کے کلام میں نازک خیالی، معنی آفرینی، تہہ داری جیسی اہم خوبیوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ میرؔ اپنی زندگی میں ہی اتنے مقبول و معروف تھے کہ ذاتی تاثرات کے ساتھ ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا جانے لگا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرؔ کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کیا گیا۔ زبانِ میرؔ میں روزمرہ اور محاورہ، تشبیہ اور استعارات، نازک خیالی و معنی آفرینی سب کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا۔ اس طرح میرؔ کی تنقید کے سلسلے میں تذکروں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

میرؔ کی وفات کے بعد لکھے گئے تذکروں میں بھی ان کی عظمت اور بڑائی کے اعتراف کا سلسلہ قائم رہا۔ ورنہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی کی صلاحیتوں کا اعتراف خود اس کے زمانہ زندگی میں کم کیا گیا ہے۔ انتقال کے بعد میرؔ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ ان کی زندگی میں لکھے گئے تذکروں سے زیادہ مفصل اور تنقیدی ہے۔ احد علی خاں یکتا میرؔ کے یہاں سحر کار، سلطان اقلیم فصاحت، فرمان فرمائے کشور بلاغت، سخن قادر غزل و طرز گفتہ کہ ہیچکس نمی تواند، محاوراں افتادان اور ممتنع جیسی صفات کا ذکر کرتے ہیں۔ گارساں دتاسی اور کریم الدین انھیں افصح و فصحاء اور ابلغ بلغاء، اشعر شعراء قرار دیتے ہیں۔ احمد حسین سحر لکھنوی ادائے معانی، عاشقانہ مضمون، اور کلام میں شور انگیزی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ احمد حسین اپنے تذکرے میں سب سے پہلے میرؔ کی حرماں نصیبی اور یاس انگیزی کا ذکر کرتے ہیں۔

ان تذکروں کے علاوہ تاریخی تذکروں کے ضمن میں ''آبِ حیات''، ''گلِ رعنا''، ''اعجازِ سخن'' اور ''جواہرِ سخن'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان تذکرہ نگاروں نے شعراء کے بارے میں لکھتے وقت تاریخی ترتیب کو مدنظر رکھا۔ ان تذکروں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ اردو کی ادبی تاریخ کی طرف پہلا قدم ہیں۔ ان تذکروں میں میرؔ سے متعلق ظاہر کی گئیں آراء پہلے کے تذکروں سے زیادہ جامع ہیں۔ محمد حسین آزاد نے میرؔ کو واردات قلبیہ کا شاعر قرار دیا۔ ان کی

تحقیقی کوتاہیوں کی طرف اکثر محققین نے نشاندہی کی ہے لیکن میر تنقید میں ان کی رائیں ایک زمانے تک سکہ رائج الوقت رہی ہیں۔ گل رعنا کے مصنف نے میر کے متعلق آزاد کے قائم کردہ مفروضات کو رد کرتے ہوئے میر کی حمایت میں قلم اٹھایا۔ البتہ ان کی شاعری پر عبدالحی کوئی تنقیدی رائے نہ دے سکے۔ ''اعجازِ سخن'' میں شیر علی خاں نے میر کی شاعری میں تشبیہ و استعارے اور لب ولہجہ جیسی خصوصیات کی نشان دہی کی۔ مولوی محمد مبین چریا کوٹی نے میر کی خودداری، بیباکی اور نازک مزاجی کا ذکر کرتے ہوئے انھیں ''درد و تاثیر کا شاعر قرار دیا۔

تذکروں میں میر کے متعلق لکھی گئی آراء کا مطالعہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ خواہ تذکرہ نگاروں نے اپنی بات کہتے وقت تاثراتی انداز اختیار کیا مگر ان کو کہیں نہ کہیں شعر کی جمالیاتی اور فنی قدروں کا شعور ضرور تھا خود میر نے نکات الشعراء میں جس طرح چھٹے طرز کو انداز کا نام دیا اور ''انداز'' کی تشریح وتعبیر کی وہ ان کی ناقدانہ صلاحیت کی دلیل ہے۔ حالانکہ ہمارے بعض ناقدین (کلیم الدین احمد) نے تذکروں کی تنقید کو قابل اعتنا نہیں سمجھا لیکن دوسرے اہم ناقدین نے اس کا اعتراف کیا کہ تذکروں کا ہر جملہ، ہر لفظ اپنے اندر ایک جہان معنی سمیٹے ہوئے ہے اور جن میں تنقید وتحسین کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آج جس بات کو ہمارے ناقدین تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ تذکرہ نگار اسے اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ خود اگر ہم کلام میر کے متعلق لکھی گئی مختصر آراء کا بغور جائزہ لیں تو اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تذکرہ نگاروں نے ان مختصر الفاظ اور جملوں میں میر کی تمام خصوصیات کلام کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تذکروں کی تنقیدی اہمیت سے اس لیے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہمارے کلاسیکی شعراء کے متعلق معلومات کا ذخیرہ تذکروں ہی کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔

تذکروں کے بعد اُردو تنقید کا جو دور شروع ہوا اس کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل مقدمہ شعر وشاعری اور دوسرے شعر العجم، مقدمہ اور شعر العجم میں گو کہ تقریباً ۲۰ سال کا فرق ہے۔ لیکن یہ دونوں کتابیں اُردو تنقید کے بنیادی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔

نقد میر کے سلسلے میں حالی اور شبلی کے عہد میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ حالی کلام میر میں نیچرل شاعری اور دھیمے لہجے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شبلی موازنہ انیس ودبیر میں ایسا الجھے کہ میر کی طرف توجہ دینے کا انھیں موقع ہی نہیں ملا۔ امداد امام اثر مولانا آزاد کے

اثرات سے باہر نہیں نکل سکے۔ وہ میرؔ کو واردات قلبیہ کا شاعر قرار دیتے ہیں اور بس۔

مولوی عبدالحق، محمد حسین آزاد کے بعد نقدِ میرؔ کے سلسلے میں پہلا اہم نام ہے۔ مولوی عبدالحق نے میرؔ کی یاد کو ایک بار پھر تازہ کر دیا اور ان کے بہتر نشتروں کی چبھن پھر محسوس ہونے لگی عبدالحق بھی اپنے تنقیدی رویے کے سلسلے میں محمد حسین آزاد سے قریب دکھائی دیتے ہیں انھیں میرؔ کا ہر شعر دردِ دل کی تصویر نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ذکرِ میر پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ میرؔ کے کلام کا بہت سا حصہ آپ بیتی اور اپنے دل کی کیفیت ہے۔ ماموں کی زیادتی کے سبب چاند میں کسی شبیہ کا نظر آنا، ''مثنوی خواب وخیال''، قلبی واردات کی تصویر صرف شاعرانہ خیالات نہیں ہیں بلکہ یہ سب میرؔ کے مایوس وحزیں دل پر گزرے ہوئے واقعات ہیں۔ مولوی عبدالحق میرؔ کی شاعری اور شخصیت کے واردات کا ربط قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے کلام کو پڑھ کر ان کی سیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں میرؔ کے ایک ایک لفظ میں ان کے قلبی واردات واحساسات کا نقشہ موجود ہے وہ شعر میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں کہ کس طرح سے ان کی زندگی ہمیشہ غم والم کی آماجگاہ بنی رہی گویا وہ اور ان کا کلام ایک ہو گئے ہیں خود میرؔ نے اپنی اس کیفیت کو اپنے اشعار میں بخوبی بیان کیا ہے۔

یا روئے یا رُلایا اپنی تو یونہی گذری

لیکن ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق میرؔ کی یاسیت انگیزی کے ذکر کے ساتھ بعض ایسے اہم فنی و جمالیاتی نکات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جن کو کلام میرؔ کی اہم خصوصیات قرار دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میرؔ کے کلام میں مشکل استعارات اور بعید از قیاس مبالغہ موجود نہیں ان کا انداز بیان سادہ ہے اسے ہم سہل ممتنع کا نام دے سکتے ہیں مگر سہل ممتنع کی تعریف عبد الحق ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے لکھا ہے کہ میرؔ کی شاعری بظاہر سمندر کی سطح کی طرح دیکھنے میں معمولی اور بے شور وشر نظر آتی ہے مگر اس کی تہہ میں زبردست جوش یا درد چھپا ہے میرؔ نے سادہ وسلیس الفاظ اور معمولی تراکیب میں بڑے بڑے معنی پوشیدہ کر رکھے ہیں۔

عبدالحق نے اپنے دعوے کی دلیل میں میرؔ کے اشعار سے انتخاب بھی دیا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میرؔ نے نکات الشعراء میں لکھا تھا۔ ''اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد''۔ خود میرؔ نے فارسی تراکیب کا استعمال اِسی نقطہ نظر کے تحت کیا ہے۔

مندرجہ بالا باتیں میرؔ کے فن کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اگر ان نکات کو ذہن میں رکھ کر میرؔ کی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چاہے تذکرے ہوں یا ان کے بعد کے مطالعات، میرؔ کی شاعری کی فنی خصوصیات پر ناقدین نے تبصرہ ضرور کیا۔ حالانکہ عبدالحق کو میرؔ کا اہم نقاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود نقدِ میرؔ کے سلسلے میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مولوی عبدالحق کا مقدمہ انتخاب میرؔ ''آبِ حیات'' کے بعد میرؔ کی شعری خصوصیات پر لکھا گیا اہم ترین مقدمہ ہے۔ جس میں انھوں نے میرؔ کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے۔ بعض اہم خصوصیات کی نشاندہی کی ہے اور میرؔ کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے یہاں فارسی تراکیب کے استعمال کی وضاحت کی ہے۔

رسالہ نیرنگ کا ''میرؔ نمبر'' جولائی ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ اس میرؔ نمبر کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ اس کی اشاعت سے قبل میرؔ پر نہ تو کوئی باقاعدہ کتاب لکھی گئی تھی اور نہ ہی کسی دوسرے رسالے کا کوئی میرؔ نمبر شائع ہوا تھا۔ اس رسالے میں پہلی بار میرؔ کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا، میرؔ کی غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ غرض کوئی ایسی صنف نہیں جس کا ذکر اس رسالے میں. لکھنے والے مصنّفین نے اپنے مضامین میں نہ کیا ہو۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ اس رسالے کے مصنّفین مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق سے زیادہ مولانا الطاف حسین حالؔی کے تنقیدی خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ رسالے کے ایڈیٹر عزیز اللہ خان عزیز ہوں یا عزیزؔ لکھنوی، سہاؔ مجددی ہوں یا دوسرے مصنّفین سب کی تحریروں پر حالؔی کا اثر غالب نظر آتا ہے۔

عزیز اللہ خاں عزیز نے لکھا ہے کہ میر تقی میرؔ حقیقی شاعر ہیں، صداقت، محاکات، سادگی، بیان کی صفائی، بلندی خیال، باریکی، جوش، روانی وسلاست، ایجاز واختصار اور جدت ادا جیسی تمام لفظی ومعنوی خوبیوں سے میرؔ کا کلام آراستہ وپیراستہ نظر آتا ہے۔ اسی رسالے کے دوسرے مصنف عزیزؔ لکھنوی میرؔ کے ''فارسی کلام'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ذکر میرؔ دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلا کہ اکثر اشعار ان کے حالات اور واقعات پر مبنی ہیں''۔

''رسالہ نیرنگ'' میں لکھنے والوں میں سہاؔ مجددی کا مضمون بھی خاصا اہم ہے وہ بھی ''واقعیت، جوش اور سادگی کو شعر کی اہم خصوصیات قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی تخیل اور

محاکات کو شعر کے بنیادی اجزاء۔ جوش سے ان کی مراد انفعال یا تاثر ہے۔ یہ تمام خصوصیات میرؔ کے یہاں موجود ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ شعر کی امتیازی شان ''اسلوب بیان'' کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ؛

> ''شاعر کے کمال کا اندازہ اس کے 'تخییل اور اسلوب بیان'
> سے ہوتا ہے۔ لہٰذا میرؔ کی اہم خصوصیات انفعال اور اسلوب بیان کی
> سادگی ہے میر صاحب کی انفعالیت و تاثر، رنج والم غم اور یاس کی کیفیت
> سے معمور ہے اس لیے اس میں ایک ہی قسم کی اثر خیزی اور ایک ہی قسم کا
> رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ انفعال و تاثر کی افراط، سوز و گداز اور
> اسلوب بیان کی سادگی میر صاحب کے کلام کے عناصر ترکیبی ہیں۔'' ۱

اس رسالے میں شامل جعفر علی خاں اثرؔ کے مضمون میں بھی کہیں کہیں حالیؔ کے زیر اثر سماجی اثرات موجود ہیں مثلاً انھوں نے لکھا ہے کہ

> ''میر جس پر آشوب زمانے میں تھے اور جو واقعات انھوں
> نے دیکھے یا سنے اور جن مصائب کا ان کو اپنی عمر کے ایک بڑے حصے
> تک سامنا ہوا ان سب کے نقوش ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ۲

لیکن ساتھ ہی اثر میرؔ کی شاعری کو تمام صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں میرؔ کے کلام میں تخییل و محاکات کے بہترین نمونے ملتے ہیں، سلاست، صفائی، حسن بندش، لطف، تشبیہ و استعارہ ہر ایک درجۂ کمال پر موجود ہے۔ پھر بھی میرؔ نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے ہر شعر کی تہہ میں ایک عظیم الشان راستی پنہاں ہے۔

اس رسالے کے مصنفین میں شامل عشرت رحمانی اپنے مضمون ''خیابانِ میر'' میں لکھتے ہیں۔

> ''میرؔ کے تمام کلام میں بیجا تشبیہوں اور استعاروں،
> بھونڈے اور بعید از قیاس مبالغوں کا ذکر نہیں، نہ کہیں ایہام ہے،
> نہ فارسی آمیز اغلاق و اشکال، خیالات میں پاکیزگی ہے جذبات
> میں رفعت ہے واردات و کیفیات صحیحہ کو اس دلکش انداز اور مؤثر

پیرائے میں ادا کیا ہے کہ بیساختہ ''آہ'' نکل جاتی ہے نہایت
سلیس فصیح اور شستہ ہے۔'' ۳؎

عشرت رحمانی میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیت ''سادگی'' قرار دیتے ہیں۔ میر پر گزرنے والے واقعات کی دلکش ادائیگی انھیں متاثر کرتی ہے۔ رسالہ ''نیرنگ'' کے مضامین میں حالیؔ اور شبلیؔ کے اثرات واضح طور سے موجود ہیں اور کہیں کہیں محمد حسین آزاد کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ان مضامین میں تاثراتی جمالیاتی اور سوانحی اندازِ نقد سے کام لیا گیا ہے۔ نیرنگ کے بعد شائع ہوئی میرؔ پر پہلی باقاعدہ کتاب صفدر آہ کی ''فلسفۂ میر'' سے نقدِ میر میں سماجی تنقید کے آثار بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ صفدر آہ صرف میرؔ کی شاعری میں تاریخی عناصر سے ہی بحث نہیں کرتے بلکہ کلام میر پر سماجی اثرات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، امداد امام اثر، اور مولوی عبدالحق کے بعد ترقی پسند تحریک نے نقدِ میر پر بھرپور توجہ دی۔ یہ تحریک ہمارے اُردو ادب کی سب سے توانا تحریک تھی جس نے اُردو ادب اور تنقید پر بڑے دُوررس اثرات مرتب کیے۔ ترقی پسند تحریک نے قدیم کلاسیکی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے ادب کا رشتہ معاصر زندگی سے جوڑا اس تحریک نے ذوق و وجدان سے پرے سماجی شعور اور ادب میں زندگی اور مقصدیت کا نظریہ پیش کیا۔ اس تحریک کے زیرِ اثر ادب کا تاریخی اور سماجی مطالعہ شروع ہوا اور جیسے جیسے ترقی پسند تحریک کو فروغ ہوتا گیا میر کے سمجھنے، پڑھنے اور ان کے مطالعے کے انداز میں واضح تبدیلی نظر آنے لگی۔ آزاد اور عبدالحق کے اثر سے ناقدین باہر نکلے اور کلامِ میرؔ پر از سرِ نو غور کرنا شروع کیا۔ ترقی پسند ناقدین نے میرؔ کی شاعری میں یاسیت و قنوطیت اور وارداتِ قلبیہ کے بجائے زندگی کے تمام رنگوں کی تلاش شروع کی۔ وہ رنگ خواہ تاریخی ہو یا سماجی یا سیاسی غرض ہر اعتبار سے کلام میر کا مطالعہ کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک سے میرؔ کی شاعری کی نئی تفہیم و تعبیر سامنے آئی۔ تذکروں سے لے کر عبدالحق اور نیرنگ کے میرؔ نمبر تک میر تقی میر پر جو یاسیت اور حزن والم کا لیبل لگا ہوا تھا وہ ہٹ گیا اور میرؔ زندگی سے محبت کرنے والے حوصلہ مند شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون ''میرؔ اور ان کی شاعری'' ۱۹۳۵ء میں واضح طور پر اس طرف اشارے کیے کہ اگر ہم کسی شاعر کی گذشتہ زندگی سے

واقف ہوں تو اس کی نفسیاتی گرہوں اور مخفی واردات تک کامیابی سے پہنچ سکتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون ''میر اور ہم'' کا عنوان ہی یہ سوچ کر رکھا کہ ادب اجتماعیت کا ترجمان ہے۔ اپنے مضمون میں انھوں نے کلامِ میر کی تفہیم وتشریح کے لیے تاریخی سیاق وسباق سے واقفیت اور تاریخ اور فن پارے کے باہمی ربط کو ضروری قرار دیا۔

مجنوں گورکھپوری کے علاوہ علی سردار جعفری، احتشام حسین اور محمد حسن نے بھی میر کی شاعری سے ترقی پسند تحریک کے زیراثر نئے نئے مفاہیم ومطالب اخذ کیے۔ علی سردار جعفری نے لکھا ''میر نے غزل کو اپنے عہد کا آئینہ بنادیا۔'' جعفری نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ ''میر نے پنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست وریخت کو علامتوں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ محمد حسن نے میر کے عہد کو آج کے زمانے کے مماثل قرار دیا۔ انھوں نے لکھا کہ جس طرح سے موجودہ صنعتی عہد میں فرد سب کے ساتھ ہو کر بھی تنہا ہے اور عہدِ حاضر کا انسان جس طرح شکستہ حال ہے وہی حالت میر کے دور کے انسان کی بھی تھی۔

غرض یہ کہ ترقی پسندوں نے کلامِ میر کو نئے معنی ومفہوم عطا کیے۔ انھوں نے میر کی شاعری میں ان کے عہد کی تصویر کی ہی تلاش نہیں کی۔ بلکہ میر کو ایک ایسا شاعر قرار دیا جو غموں، مصیبتوں اور پریشانیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ میر غموں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ دل پرخوں کی اِک گلابی سے لڑنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ ایک نیا رخ تھا جو بڑا توانا اور مضبوط رخ تھا جس نے بہت گہرا اثر میر کے مطالعے پر ڈالا۔

ترقی پسند نقطۂ نظر کے بعد میر تنقید کا ایک بڑا دور ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء تک میر شناسی کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اور اس دور میں مطالعۂ میر کے تین واضح ابعاد نظر آتے ہیں۔ پہلا کلاسیکی سوانحی اور فنی نقطہ نظر رکھنے والا جس میں صفدر آہ، جعفر علی خاں اثر، خواجہ احمد فاروقی، سید عبداللہ اور فراق کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان لوگوں نے میر کا مطالعہ بہت تفصیل سے کیا اور ان تمام اثرات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو میر کی شاعری مثلاً غزلوں، مثنویوں اور دوسری اصناف میں مل سکتے تھے۔ صفدر آہ کو میر کے پہلے ایسے ناقد ہونے کا فخر حاصل ہے جس نے میر پر سب سے پہلی باقاعدہ کتاب لکھی۔ ان کی اہم تصنیف ''فلسفۂ میر'' ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ جس میں انھوں نے میر کی زندگی کے اہم

واقعات، ان کے کردار، عہد میر کی زبان، میر کی تصنیفات، میر کی شاعری اور خصوصیات شاعری پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے لکھا کہ ''میر کی شاعری سادہ و سلیس ہے تصنع کے ناپاک ہاتھ ان کی شاعری تک کبھی نہ پہنچ سکے۔'' صفدر آہ ''فلسفۂ میر'' میں کہیں کہیں میر کی شاعری کو ان کی زندگی سے بھی ہم آہنگ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''میر کا کلام ان کی زندگی اور ان کے کردار کی جیتی جاگتی تصویر ہے ان کی دوسری کتاب ''میر اور میریات'' ہے جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کا پہلا حصہ سوانحی، تاریخی اور تہذیبی ہے اور دوسرے حصے میں میر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ صفدر آہ اپنی دونوں تصانیف میں ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید کے اثرات ان کی دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔ ''میر اور میریات'' کے دیباچے کا یہ جملہ اس طرف بخوبی اشارہ کرتا ہے کہ ''میر جیسا بڑا شاعر ایک اہم پس منظر کے بغیر نہیں پیدا ہوتا''۔

صفدر آہ کی فلسفۂ میر کے بعد ۱۹۴۷ء میں جعفر علی خاں اثر کا انتخاب کلام میر ''مزامیر'' کے عنوان سے شائع ہوا جعفر علی خاں اثر پہلے بھی میر پر بہت سے مضامین لکھ چکے تھے مگر ان کا مطالعہ جمالیاتی اور فنی نوعیت کا تھا۔ فلسفۂ میر کے بعد لکھی گئی پہلی مبسوط کتاب خواجہ احمد فاروقی کی ''میر حیات اور شاعری'' ہے یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں میر کی حیات اور شاعری پر ان کے عہد کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے۔

> ''۔۔۔۔۔۔ان (میر) کی شاعری کی پشت پر اُردو کے
> ارتقاء کی تاریخ ہے اور اس میں برسہا برس کی روایات، تمدنی
> وراثت، تاریخی اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے۔'' ۶۲

خواجہ احمد فاروقی کی یہ رائے تنقید میر کے سلسلے میں کئی بنیادی اشارے کرتی ہے، مثلاً یہ کہ میر کی شاعری اُردو کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر نے زبان کا جس طرح استعمال کیا ہے اور عام بول چال کے الفاظ سے جو فائدہ اٹھایا ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ اسی لیے خواجہ احمد فاروقی نے اسے اُردو کے ارتقاء کی تاریخ قرار دیا ہے ساتھ ہی ان کے یہاں میر کے تاریخی ماحول کے ان کے کلام پر اثرات کی نشاندہی بھی بخوبی کی گئی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ میر نے شعر نہیں کہے بلکہ دل

اور دلی کے مرثیے کہے ہیں۔

بقول خواجہ احمد فاروقی میرؔ کی غزلوں میں سماجی شعور پایا جاتا ہے۔ تاریخی سچائیاں جھلکتی ہیں۔ جہاں انھوں نے اپنے انفرادی جذبات کا اظہار کیا ہے وہاں بھی اجتماعی حقیقتیں الفاظ کے جھروکوں سے جھانکتی ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی نے میرؔ کو خوددار ضبط کرنے والا اور زندگی کی پریشانیوں کا مقابلہ ہمت وحوصلہ سے کرنے والا شاعر قرار دیا۔ اس طرح انھوں نے میرؔ کو کئی انداز میں پرکھا، میر کی شاعرانہ خصوصیات داخلیت، خارجیت، تصورِ حسن وعشق، فلسفۂ غم، نشتریت، سہل ممتنع اور خاص طور پر میرؔ کے انتخاب الفاظ کی داد دیتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی نے ان کے یہاں ہندی اور فارسی الفاظ کے امتزاج سے اردو زبان کو وسعت بخشنے کی بات کہی۔ اس طرح خواجہ احمد فاروقی کے یہاں سوانحی، سماجی، جمالیاتی اور فنی عناصر ایک ساتھ یکجا ہو گئے ہیں۔

اثرؔ لکھنوی کو تو میرؔ کا پرستار کہا گیا ہے۔ انھوں نے میرؔ کے خلاف بہت سی بدگمانیوں کا طلسم توڑا۔ ان کا اندازِ تنقید فنی، جمالیاتی وتشریحی ہے۔ مزامیر میں میرؔ پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے میر کے محاسن شعری پر گفتگو کی ہے:

> ''میر کی شاعری تمام ظاہر ومعنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ تخیل اور محاکات کے بہترین نمونے علاوہ دیگر محاسن مثلاً سلاست، صفائی حسنِ بندش، لطف، تشبیہ واستعارہ اور ہر ایک درجۂ کمال پر موجود، پھر لطف یہ کہ باوجود اس ہمہ گیر تخیل اور قوتِ اختراع کی آخری حدوں پر پہنچنے کے میر نے ''حقیقت'' کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔۔۔۔۔۔ زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس کی مصوری میر نے بہترین الفاظ اور مؤثر ترین پیرائے میں نہ کی ہو ان کے اکثر اشعار سہل ممتنع ہیں۔ اور صاف وسادہ الفاظ میں معانی کا ایک دریا موجزن ہے۔'' ۵

اس ایک اقتباس سے ہی اثرؔ لکھنوی کا فنی انداز تنقید نمایاں ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ اقتباس اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اثرؔ لکھنوی کہیں نہ کہیں سماجی نقطۂ نظر بھی رکھتے تھے۔ بہر حال میر کا مطالعہ انھوں نے واضح طور سے جمالیاتی وفنی انداز میں کیا۔

صفدر آہ، جعفر علی خاں اثر، خواجہ احمد فاروقی، سید عبداللہ، نثار احمد فاروقی یہ وہ ناقدین ہیں جنھوں نے میرؔ کے مطالعے میں میرؔ کے یہاں پائی جانے والی جمالیاتی اور فنی خوبیوں کی بھی نشاندہی کی۔ میرؔ کی زندگی اور حالات پر تفصیل سے گفتگو کی، شاعری پر سوانحی اثرات کا مطالعہ کیا اور ساتھ ہی میر کی زبان، الفاظ اور ان الفاظ کی معنویت کا مطالعہ کر کے میرؔ کی عظمت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

فنی و جمالیاتی انداز تنقید سید عبداللہ کے یہاں بھی ملتا ہے مگر ان کا زیادہ زور میر کی شاعری میں سوانح پر ہے۔ وہ سوانح کے حوالے سے شاعری یا شاعری کے حوالے سے سوانح کے عناصر کو نشان زد کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میرؔ کی نفسیات، سوانح اور شاعری سب آپس میں خلط ملط ہو جاتی ہیں کہیں کہیں وہ سماجی تنقید سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور میرؔ کو زندگی کے زخموں پر پھاہا اور مرہم رکھنے والا شاعر بھی قرار دیتے ہیں۔

جعفر علی خاں اثرؔ، خواجہ احمد فاروقی، سید عبداللہ اور نثار احمد فاروقی اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ترقی پسند تحریک کا عروج دیکھا۔ یہ ناقدین براہِ راست ترقی پسند تحریک سے وابستہ تو نہیں رہے لیکن ان پر تحریک کا اثر ضرور پڑا۔ جعفر علی خاں اثر، خواجہ احمد فاروقی یا نثار احمد فاروقی بنیادی طور پر جمالیاتی ناقد ہیں۔ وہ ادبی تخلیق میں فنی محاسن، زبان کے نکات اور بدیع و بیان پر توجہ دیتے ہیں۔ مطالعہ میرؔ کے سلسلے میں سید محمد عبداللہ کے مضامین سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرؔ کو بہتر طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اثرؔ لکھنوی کلامِ میر سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اس لطافت کلام کو دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جس خوبصورتی سے میرؔ کے کلام کے محاسن کو واضح کیا ہے اس نے تفہیمِ میرؔ میں آنے والی نسلوں کی مدد کی۔ نثار احمد فاروقی ایک محقق اور اسکالر ہیں انھوں نے ''ذکر میر کے ترجمے، دلی کالج میگزین کے ''میرؔ نمبر'' کی ترتیب اور میرؔ پر اپنے مضامین کے ذریعہ میرؔ کی فنی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی وہ صرف سوانحی اور سماجی مطالعہ نہیں کرتے بلکہ میرؔ کے محاسن خواہ وہ زبان سے تعلق رکھتے ہوں اظہار بیان سے یا فکر سے انھیں واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح مطالعہ میرؔ کے اس فنی و جمالیاتی نقطۂ نظر میں ان تمام ناقدین کی تاریخی اہمیت ہے۔

اُردو تنقید میں یہ دور تنقیدی نظریات کے فروغ کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس

زمانے میں بہ یک وقت تفہیم وتنقید کے کئی رجحانات نظر آتے ہیں۔ جمالیات اور فنی تنقید اور ترقی پسند تنقید کے تحت میرؔ تنقید میں جو اضافے ہوئے ان کا ذکر کیا جاچکا ہے کم وبیش اسی عہد میں نفسیاتی دبستان کو بھی فروغ ہوا۔ تنقید کا یہ رجحان بھی مغربی اثرات کے تحت آیا۔ مشہور ماہر نفسیات فرائڈ کے نظریۂ لاشعور و یونگ کے نظریۂ نسلی لاشعور (Archy typal) اور ایڈلر کے 'احساس' (Complexes) کے نظریات کے تحت ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ یوں تو فرائڈ، ایڈلر اور یونگ نفسیات میں ایک دوسرے سے الگ دبستاں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اردو تنقید میں جہاں کہیں کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کا نفسیاتی مطالعہ کیا گیا ہے وہاں کبھی علاحدہ کسی نقطۂ نظر کے تحت کبھی کسی نفسیاتی نقطۂ نظر کے تحت اور کبھی سب کو ملا کر شاعر کی تفہیم کی کوشش کی گئی۔

میرؔ تنقید کے ابعاد میں نفسیاتی تنقید کو بھی ایک رجحان کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ بعض ناقدین نے میرؔ کا مطالعہ نفسیاتی محرکات کے تحت کیا ہے اور ان کے نہاں خانوں میں جھانک کر ان کی شاعری میں پوشیدہ نفسیاتی محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ مطالعہ نہ صرف یہ کہ میرؔ کی شاعری کو ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے بلکہ خود میرؔ کی زندگی سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ خاص طور پر شبیہ الحسن اور خالد سہیل کے مضامین میں مطالعۂ میرؔ کا یہ رخ دیکھا جاسکتا ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر گذشتہ ابواب میں آچکا ہے۔

تنقید کے جدید رجحانات میں جدیدیت (Modernism) کے تحت آنے والے رجحانات لسانیاتی تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید وغیرہ سے مابعد جدیدیت تک کئی رجحانات ہیں جن کے تحت جدید اور قدیم ادب کو سمجھنے کی کوشش کی گئی یہ تمام رجحانات بنیادی طور پر جدیدیت کی شاخیں ہیں۔ مطالعۂ میرؔ کے ابعاد میں یہ رخ بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان نظریات کے تحت جن ناقدین نے میرؔ پر قابلِ ذکر کام کیا۔ ان میں شمس الرحمٰن فاروقی گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، وارث علوی، حامدی کاشمیری، قاضی افضال حسین، اور محبؔ عارفی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ جنھوں نے نوتنقید، ہیئتی تنقید اسلوبیاتی تنقید یا کسی اور رجحان کے تحت میرؔ کی تشریح وتعبیر کا کام انجام دیا۔

قاضی افضال کی کتاب ''میرؔ کی شعری لسانیات'' میں میرؔ کی شاعری کا مطالعہ ہیئتی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ ہیئتی تنقید میں ان تمام شاعرانہ وسائل کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے جنھوں نے کسی شاعر کے کلام کو عظیم بنایا۔ یہ فن کارانہ وسائل دراصل عمل اظہار کو سطح پر نمایاں کر کے اسے ادب پارے کا پیش منظر بنا دیتے ہیں۔ قاضی افضال حسین کی کتاب میرؔ کی شعری لسانیات میں میر کی شاعری کی تحسین و تنقید کی بنیاد ہیئت و زبان کے بعض بنیادی معتقدات پر رکھی گئی ہے انھوں نے میرؔ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے لسانی رویے کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ ہیئت پسندوں کے نزدیک ادب ایک لسانی ساخت ہے مگر ادب میں برتی جانے والی روزمرہ کی زبان حاوی محرک یا جمالیاتی وظیفے کے ہاتھوں منقلب ہو جاتی ہے یہی میر نے بھی کیا۔ ان کی زبان روزمرہ ہونے کے باجود فن کارانہ وسائل کے ذریعہ شاعری کی زبان میں منقلب ہو گئی۔ قاضی افضال حسین نے ان تمام لسانیاتی رویوں کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے میرؔ کی زبان کو تبدیل کر دیا۔ اس طرح قاضی افضال حسین نے ہیئتی نقطۂ نظر سے میر کا مطالعہ کیا اور ابعادِ میر میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔

تنقید کا اہم رجحان اسلوبیاتی تنقید بھی رہا ہے گوپی چند نارنگ کی ''اسلوبیات میرؔ'' اس کی نمائندہ کتاب ہے۔ بقول شارب ردولوی

> ''اسلوبیات کے پیش نظر ادبی تحریریں زبان کے وسیلے سے مطالعہ کا ایک گوشہ ہیں اس نقطۂ نظر کے تحت ایک خیال کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے جس میں سے مصنف کسی ایک طریقے کو شعوری، لاشعوری، ذاتی پسند یا قاری کے مطالبات کے تحت مخصوص الفاظ یا تراکیب کے انتخاب کی شکل میں اختیار کرتا ہے۔''[۶]

گراہم ہاگ کا کہنا ہے۔

> ''اسلوبیات دراصل زبان کا مطالعہ ہے'' [۷]

اسلوبیات عام طور پر زبان کے استعمال سے بحث کرتی ہے اور زبان کے استعمال کے بے شمار پہلو ہیں ان میں سے اسلوبیاتی مطالعہ کرنے والا نقاد کسی پہلو پر زیادہ زور دے سکتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے ''اسلوبیات میرؔ'' میں کلام میر کا جائزہ لیتے وقت تخلیقی اظہار کے جملہ

امکانات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جن کا استعمال میرؔ نے کیا۔ گوپی چند نارنگ تمام لسانی امتیازات کو نشان زد کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے میرؔ کی شناخت ممکن ہو۔ ان امتیازات کو انھوں نے مندرجہ ذیل اقسام میں بیان کیا ہے۔

۱۔ صوتیاتی : یعنی آوازوں کے نظام سے جو امتیازات قائم ہوتے ہیں۔ ردیف و قوافی کی خصوصیات یا معکوسیت، ہکاریت یا غنیت کے امتیازات، مصمتوں اور مصوتوں کا تناسب وغیرہ۔

۲۔ لفظیاتی : خاص نوع کے الفاظ کا اضافی تواتر، اسماء، اسمائے صفت، افعال وغیرہ کا تواتر اور تناسب، تراکیب وغیرہ)

۳۔ نحویاتی : کلمے کی اقسام میں سے کسی کا خصوصی استعمال، کلمے میں دروبست وغیرہ۔

۴۔ بدیعی : (rhetorical) بدیع و بیان کی امتیازی شکلیں، تشبیہ، استعارہ کنایہ، تمثیل، علامت، امیجری وغیرہ۔

۵۔ عروضی : امتیازات، اوزان، بحروں، وغیرہ کا خصوصی استعمال اور امتیازات [8]

گوپی چند نارنگ نے اپنے بیان کردہ ان تمام امتیازات کی تلاش میرؔ کے کلام میں کی۔ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"اسلوبیات میر" میں سارے ادبی مباحث اپنی ذہنی غذا اسلوبیاتی تجزیے سے حاصل کرتے ہیں اور یہ اسلوبیاتی تجزیہ نحوی بھی ہے، صرفی بھی اور صوتیاتی بھی"۔ [9]

گوپی چند نارنگ نے میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیت سہل ممتنع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"------میر کے یہاں جس بڑے پیمانے پر زبان کی عام ساخت یعنی جملے کی ساخت برقرار رہتی ہے ان کی قدرت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔-----دو مصرعوں میں دو Nodes کا وقوع فطری ہے (اگر مصرعے نحوی طور پر مربوط ہوں یعنی ایک میں خبر ہو اور دوسرے میں مبتدا تو Node ایک ہی ہوگا۔ لیکن میرؔ کے

یہاں اکثر و بیشتر تین یا اس سے زیادہ Nodes ملتے ہیں یہ
بالذات نحوی واحدے اوران کی فطری ساخت سہل ممتنع کی وہ اسلوبیاتی
نبیاد ہے جس کی وضاحت قدیم شعریات میں ناممکن تھی۔"۱۰

گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ میرؔ کی زبان میں آگرہ کی برج بھاشا اور دہلی کی کھڑی بولی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ وہ میرؔ کو پوری اُردو کا شاعر قرار دیتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ نے جس خوبصورتی سے میرؔ کی شاعری کا اسلوبیاتی تجزیہ کیا ہے وہ ان کی ناقدانہ بصیرت کا آئینہ دار ہے اور میرؔ تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

نقدِ میرؔ میں جدیدیت پر کسی طرح کی بھی گفتگو شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے کے بغیر نامکمل کہی جائے گی۔ اُردو میں جدیدیت کا آغاز ۶۰۔۱۹۵۵ء سے ہوا۔ جدیدیت نے دوسری اصناف کے ساتھ اُردو تنقید پر بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ تنقیدِ میرؔ پھر اس سے کیسے علاحدہ رہ سکتی تھی۔ حامدی کاشمیری، قاضی افضال حسین، گوپی چند نارنگ نے ہیئتی، اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے میرؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا۔ نقدِ میرؔ کے اسی سلسلے کو شمس الرحمٰن فاروقی نے نوتنقید New Criticism کے زیر اثر "شعر شور انگیز" لکھ کر ایک نئی فکر کا اضافہ کیا۔ شعر شور انگیز میں ایک طرف انھوں نے کلاسیکی شعریات کی بازیافت کی تو دوسری طرف نو تنقید کے نقطۂ نظر کے زیر اثر "متن" کو اہمیت دی۔ اُردو میں شمس الرحمٰن فاروقی نوتنقید کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں ان کی تنقید پر اسلوبیاتی تنقید کے اثرات بھی صاف جھلکتے ہیں۔ بقول شارب ردولوی:

مغربی نقادوں میں شمس الرحمٰن فاروقی سب سے زیادہ
آئی اے رچرڈس سے متاثر ہیں۔ وہ نوتنقید کے اصولوں پر آئی
اے رچرڈس کی طرح ہی زور دیتے ہیں"۔۱۱

شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں متن کے مطالعے سے ہی ہم فن پارے کے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ادب کیا ہے؟ اور اس کو حل کرنے کی

صورت یہ ہے کہ بجائے نظری اور عملی تنقید کی خشک کتابوں کی ورق
گردانی کی جائے خود ادب ہی کو پڑھا جائے اور پرکھا جائے۔"[۱۲]

اس اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی اُن تمام نظریات سے زیادہ جو مطالعۂ ادب یا ادب کی اقدار کے تعین کے سلسلے میں رائج ہیں ''متن'' کو اہمیت دیتے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے۔

''شمس الرحمٰن فاروقی ادبی تخلیق کی Close Reading کے
قائل ہیں وہ ادبی تخلیق کے سطحی معنوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس
کی داخلی ہیئت میں پوشیدہ مفاہیم کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ ان کی نگاہ میں استعارے، علامت، رعایت لفظی اور دوسری
صنعتوں کی خاص اہمیت ہے جو شعر میں تہہ داری اور معنوی وسعت
پیدا کرتی ہیں وہ ایک طرف زبان و بیان کی خوبیوں اور صنعتوں کے
حسن کی نشاندہی کرتے ہیں تو دوسری طرف علامت اور شعری
ساخت میں اشاراتی نظام کے مطالعے پر زور دیتے ہیں۔'' [۱۳]

شمس الرحمٰن فاروقی کی تفہیم غالب اور شعر شور انگیز اُردو میں متن کے مطالعے کی بہت کامیاب مثالیں ہیں۔ خصوصاً میر پر لکھی گئی شعر شور انگیز'' ان کے ادبی نقطۂ نظر کی واضح مثال ہے۔ اس کتاب کی چاروں جلدوں میں انھوں نے ''متن'' کی Close Reading کے ذریعہ محاسن کلام میر کی جس طرح تلاش کی ہے وہ اُردو میں نوتنقید کی خوبصورت مثال ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو اُردو تنقید میں ایک ناقد اور ایک شارح کی حیثیت سے منفرد مقام حاصل ہے انھوں نے تفہیم میر کے سلسلے میں ایک نئے تنقیدی نظریہ کو پیش کیا ہے یہ نظریہ نو تنقید کے مغربی رجحان سے شروع ضرور ہوا لیکن اس کی آبیاری فارسی بدیع اور سنسکرت کا دیہ شاستر سے ہوئی جس نے شعر فہمی کا بالکل نیا نظریہ پیش کیا اس نظریہ سے کسی کو کہیں پر جزوی اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت یا کوئی بھی جدید تر رجحان جس کے تحت اُردو ادبیات کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اس نے میر تنقید کو کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر کیا ہے۔

جہاں تک میرؔ تنقید کے ابعاد کا تعلق ہے کلاسیکی نظریے سے مابعد جدیدیت تک اس میں جو ابعاد (Dimensions) آئے ان کا مختصراً جائزہ یہاں پر پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی تفصیلی بحث متعلقہ ابواب میں آچکی ہے۔ اس باب کا مقصد اس بات کی طرف توجہ دلانا تھا کہ تنقید کے جتنے ابعاد عصرِ حاضر تک ملتے ہیں ان سب کی روشنی میں میرؔ کے کلام کو پرکھا گیا ہے اور ہر عہد میں ان کے مطالبات اور رائج نظریات کے تحت میرؔ کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

میرؔ تنقید کی ابتدا اگر تذکروں سے تسلیم کرلی جائے تو ۱۷۵۲ء سے ۲۰۰۵ء تک ۲۵۳ سال میں فکر و نظر کی جتنی تبدیلیاں اُردو تنقید میں آئیں وہ سب میرؔ تنقید میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

حواشی

۱۔ سہا مجددی، میر تقی میرؔ اور ان کا کلام، ص۔۳۲۔ مشمولہ رسالہ نیرنگ میر تقی میرؔ نمبر مطبع سعیدی، ریاست رامپور جولائی ۱۹۲۸ء۔

۲۔ جعفر علی خاں اثر، گلشن میر۔ ص۔۲۷۔ مشمولہ رسالہ نیرنگ میر تقی میرؔ نمبر مطبع سعیدی، ریاست رامپور جولائی ۱۹۲۸ء۔

۳۔ عشرت رحمانی، خیابان میرؔ۔ ص۔۱۱۵۔ مشمولہ رسالہ نیرنگ میر تقی میرؔ نمبر مطبع سعیدی، ریاست رامپور جولائی ۱۹۲۸ء۔

۴۔ خواجہ احمد فاروقی، میرؔ حیات اور شاعری۔ ص۔۴۸۔ انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ جولائی ۱۹۵۴ء

۵۔ جعفر علی خان اثر، مزامیر۔ ص۔۲۵۔ مقدمہ جلد اول کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی ۱۹۴۷ء

۶۔ شارب ردولوی۔ جدید اُردو تنقید اصول و نظریات۔ ص۔۴۹۴۔ اتر پردیش اُردو اکادمی ساتواں ایڈیشن ۲۰۰۲ء

۷۔ Style and stylistics and Graliam Houg PIX

۸۔ گوپی چند نارنگ، اسلوب، اور اسلوبیات۔ ص۔۲۷۲۔ مشمولہ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت ندیم احمد۔ بھارت آفسٹ دہلی ۲۰۰۲ء

۹۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میر، صفحہ۔۲۵۔۲۵۔ ناز۔ آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۰۔ گوپی چند نارنگ، اسلوبیات میر، صفحہ۔۳۶۔ ناز۔ آفسیٹ ورکس دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۵ء

۱۱۔ شارب ردولوی، نو تنقید شکاگو تنقید، تعبیر، قاری اساس تنقید مشمولہ نصاب برائے ایم۔اے اُردو، برائے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد مرتبہ پروفیسر محمد ظفر الدین طبع اوّل ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۸۶۔۱۷۸۔

۱۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ لفظ و معنی۔ ص۔۱۱۔ شب خون کتاب گھر الہ آباد ۱۹۶۸ء

۱۳۔ شارب ردولوی، نو تنقید، شکاگو تنقید، رد تعبیر، قاری اساس تنقید، مشمولہ ادبی تنقید۔ نصاب برائے اُردو برائے نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد، مرتبہ پروفیسر محمد ظفر الدین، طبع اوّل ۲۰۰۵ء، صفحہ ۱۷۸۔۱۸۶۔

کتابیات

کتابیات

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	پبلشر	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱۔	احد علی خان یکتا	دستور الفصاحت	ہندوستان پریس	رامپور	۱۹۴۳ء
۲۔	ابوالحسن امراللہ الہ آبادی	مسرت افزا (مرتبہ) عطا کاکوی	ادارہ تحقیقات عربی و فارسی	پٹنہ	۱۹۶۸ء
۳۔	احمد حسین سحر	بہارِ بے خزاں	کوہ نور پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۶۸ء
۴۔	اسپرنگر	یادگار شعراء	نشاط پریس ٹانڈہ	فیض آباد	۱۹۸۵ء
۵۔	اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی	گل عجائب	اتر پردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۶۔	الطاف حسین حالی	مقدمہ شعر و شاعری	ایم کے آفسٹ پرنٹرز	دہلی	۱۹۹۴ء
۷۔	امداد امام اثر	کاشف الحقائق	مکتبہ جامعۃ الادب اردو بازار	لاہور	۱۹۵۶ء
۹۔	ایم کے فاطمی	اُردو تذکروں میں نکات کی اہمیت	سرفراز پریس ناداں محل روڈ	لکھنؤ	۱۹۶۲ء
۱۰۔	امیر حسن نورانی	میر تقی میر حالات زندگی اور انتخاب کلام	رام کمار بکڈپو	لکھنؤ	۱۹۵۷ء
۱۱۔	امداد امام صابری	تلامذہ میر	کوہ نور پریس	راولپنڈی	۱۹۶۵ء
۱۲۔	عبدالستار بیدل ایم۔اے عظیم آبادی	اشعارِ میر	لالہ رام نرائن بک سیلر	الہ آباد	۱۹۵۳ء
۱۳۔	بھگوان داس ہندی	سفینۂ ہندی (مرتبہ) عطا کاکوی	ـ	پٹنہ	۱۹۵۸ء
۱۴۔	باصر کاظمی	انتخاب کلام میر	ـ	ـ	۱۹۸۹ء
۱۵۔	بینی نرائن	دیوانِ جہاں	لیبل لیتھو پریس	پٹنہ	۱۹۵۹ء

۱۶۔	جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی	مزامیر جلد اول	کتابی دنیا لمیٹڈ	دہلی	۱۹۴۷ء
۱۷۔	جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی	مزامیر جلد دوم	دیال پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۴۷ء
۱۸۔	جمیل جالبی	محمد تقی میر	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	۱۹۸۳ء
۱۹۔	حامدی کاشمیری	انتخاب غزلیات میر	ترقی اردو بیورو	نئی دہلی	۱۹۸۸ء
۲۰۔	حامدی کاشمیری	کارگہہ شیشہ گری	جے کے آفسٹ پرنٹرز	دہلی	۱۹۸۲ء
۲۱۔	حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (مرتب)	نکات الشعراء	نظامی پریس	بدایوں	۱۹۲۲ء
۲۲۔	حنیف نقوی	شعرائے اردو کے تذکرے	نسیم بک ڈپو	لکھنؤ	۱۹۷۶ء
۲۳۔	حکیم میر قطب الدین باطن	گلستانِ بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۲۴۔	خورشید احمد	متن و معنی	رائل پرنٹرس	علی گڑھ	۲۰۰۱ء
۲۵۔	خوب چند ذکاء	عیار الشعراء	انجمن ترقی اردو ہند	علی گڑھ	۔
۲۶۔	خواجہ حمید اورنگ آبادی	گلشن گفتار (مترجم ایم۔کے۔فاطمی)	سرفراز پریس نادان محل روڈ	لکھنؤ	۱۹۶۳ء
۲۷۔	خواجہ احمد فاروقی	میر حیات اور شاعری	انجمن ترقی اردو	علی گڑھ	۱۹۵۴ء
۲۸۔	رالف رسل	تین مغل شاعر (Three Mughal Poets)	فوٹو لیتھوگرافی	لندن	۱۹۶۸ء
۲۹۔	سعادت خاں ناصر	خوش معرکۂ زیبا (قلمی)	نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ	لکھنؤ	۱۹۷۱ء
۳۰۔	سید مسعود حسن رضوی ادیب (مرتب)	تذکرہ گلشنِ سخن	انجمن ترقی اردو ہند	علی گڑھ	۱۹۶۵ء

۴۶۔	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد اوّل	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	۱۹۹۰ء
۴۷۔	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد دوم	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	۱۹۹۱ء
۴۸۔	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد سوم	قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان	نئی دہلی	۱۹۹۲ء
۴۹۔	شمس الرحمٰن فاروقی	شعر شور انگیز جلد چہارم	قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان	نئی دہلی	۱۹۹۴ء
۵۰۔	شمس الرحمٰن فاروقی	لفظ و معنی	شب خوں کتاب گھر	الہ آباد	۱۹۶۰ء
۵۱۔	شکیل الرحمٰن	میرؔ شناسی	پاکیزہ آفسیٹ پریس	پٹنہ	۱۹۹۸ء
۵۲۔	شبیہ الحسن نونہروی	تنقید و تحلیل	سرفراز قومی پریس	لکھنؤ	۱۹۵۸ء
۵۳۔	شیر علی خاں سرخوش	اعجاز سخن	ٹری پرنٹنگ ورکس	لاہور	۹۵۔۱۹۹۴ء
۵۴۔	شفیقہ پروین	موثرات میر	دارالفرقان کاٹھی دروازہ رینہ واری	سری نگر کشمیر	۲۰۰۵ء
۵۵۔	صدرالدین خاں آزردہ	تذکرہ آزردہ	انجمن ترقی اُردو	پاکستان	۱۹۷۴ء
۵۶۔	صفدر آہ	فلسفۂ میرؔ	ــ	ــ	۱۹۳۶ء
۵۷۔	صفدر آہ	میرؔ اور میریات	اجمل پریس	بمبئی	۱۹۷۲ء
۵۸۔	صدیق حسن، نورالحسن خاں	شمع انجمن و نگارستان (مرتبہ) عطا کاکوی	دی آرٹ پریس	سلطان گنج، پٹنہ	۱۹۶۸ء
۵۹۔	علی ابراہیم خاں خلیل	گلزار ابراہیم (مرتبہ) کلیم الدین احمد	دائرۂ ادب	پٹنہ	۱۹۷۴ء
۶۰۔	عبدالغفور نساخ	سخن شعراء	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۶۱۔	علی الحسینی گردیزی	تذکرۂ ریختہ گویان	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۹۵ء
۶۲۔	عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقاء	انجمن ترقی اردو	پاکستان	۱۹۵۱ء

۶۳۔	عبدالمغنی (عبدالحق کی تنقید نگاری)	مولوی عبدالحق ادبی اور لسانی خدمات	انجمن ترقی اُردو ہند	نئی دہلی	۱۹۹۲ء
۶۴۔	علی سردار جعفری	پیغمبرانِ سخن	مکتبہ گفتگو	بمبئی	۱۹۷۵ء
۶۵۔	عبادت بریلوی	میر تقی میر	ادارۂ ادب وتنقید ظفر سنز پرنٹرس	لاہور	۱۹۸۵ء
۶۶۔	عبادت بریلوی	کلیاتِ میر	اُردو دُنیا	کراچی	۱۹۵۸ء
۶۷۔	عبادت بریلوی	جہانِ میر	ادارۂ ادب وتنقید	لاہور	۱۹۸۰ء
۶۸۔	علی الحسینی گردیزی	تذکرۂ ریختہ گویان	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۹۵ء
۶۹۔	غلام حسین شورش	تذکرۂ شورش	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۷۰۔	غلام ہمدانی مصحفی	ریاض الفصحاء	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۷۱۔	غلام ہمدانی مصحفی	تذکرہ ہندی	انجمن ترقی اردو ہند	دہلی	۱۹۳۳ء
۷۲۔	غلام ہمدانی مصحفی	عقدِ ثریا	انجمن ترقی اردو ہند	اورنگ آباد	۱۹۳۴ء
۷۳۔	فرمان فتح پوری	تذکروں کا تذکرہ نمبر (سالنامہ نگار)	انٹرنیشنل پریس	کراچی	۱۹۶۴ء
۷۴۔	قیام الدین قائم	مخزنِ نکات	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۷۵۔	قدرت اللہ شوق	طبقات الشعراء	مجلس ترقی ادب	لاہور	۱۹۷۰ء
۷۶۔	قطب الدین باطن	گلستانِ بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۷۷۔	قدرت اللہ قاسم	مجموعہ نغز	نیشنل اُردو اکادمی دریا گنج	دہلی	۱۹۳۳ء
۷۸۔	قدرت اللہ گوپاموی	نتائج الافکار	دی آرٹ پریس	پٹنہ	۱۹۶۸ء
۷۹۔	قاضی افضال حسین	میر کی شعری لسانیات	نشاط پریس ٹانڈا	فیض آباد	۱۹۸۳ء
۸۰۔	قاضی افضال حسین	انتخابِ غزلیات میر	اترپردیش اُردو اکادمی	لکھنؤ	۱۹۸۴ء
۸۱۔	قاضی عبدالودود	میر	پاکیزہ آفسیٹ	شاہ گنج، پٹنہ	۱۹۹۵ء
۸۲۔	قاضی عبدالودود	عیارستان	لیبل لیتھو پریس رمنا	پٹنہ	۱۹۵۷ء
۸۳۔	قاضی عبدالستار	اُردو شاعری میں قنوطیت (غیر مطبوعہ)	-	-	-

میرؔ پر مختلف رسائل کے خاص نمبر، مضامین کے مجموعے اور کلیاتِ میرؔ

رسائل کے میرؔ نمبر

۱۔	آجکل شمارہ ۸	اُردو پبلی کیشنز ڈویژن	نئی دہلی	مارچ	۱۹۸۴ء
۲۔	دلّی کالج میگزین	کوہِ نور پریس	دہلی	نومبر	۱۹۶۲ء
۳۔	ماہنامہ ساقی	کتب خانہ انجمن ترقی	کراچی	ستمبر	۱۹۵۸ء
۴۔	غالبؔ نامہ شمارہ (۲)	غالبؔ انسٹی ٹیوٹ،	دہلی	جولائی	۲۰۰۰ء
۵۔	نقوش شمارہ ۱۲۵	ادارہ فروغ اُردو	لاہور	اکتوبر	۱۹۸۰ء
۶۔	نقوش شمارہ ۱۲۶	ادارہ فروغ اُردو	لاہور	نومبر	۱۹۸۰ء
۷۔	نقوش شمارہ ۱۳۱	ادارہ فروغ اُردو	لاہور	اگست	۱۹۸۳ء
۸۔	نیرنگ (ماہنامہ)	مطبع سعیدی	رام پور	جولائی	۱۹۲۸ء

مضامین کے مجموعے

۱۔ ایم حبیب خاں (مرتب) افکارِ میر لبرٹی آرٹ پریس دہلی دسمبر ۱۹۶۷ء

۲۔ اطہر رضوی (مرتب) میر تقی میرؔ عالمی سیمنار (کنیڈا) ایلائڈ ٹریڈرس دہلی مارچ ۲۰۰۰ء

۳۔ مقبول احمد لاری (مرتب) حدیث میرؔ آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ نومبر ۱۹۶۷ء

۴۔ نذیر احمد (مرتب) میر تقی میرؔ تنقیدی و تحقیقی جائزے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی ۲۰۰۰ء

کلیات

۱۔	اکبر حیدری (مرتب)	دیوانِ میرؔ	۔	سری نگر	۱۹۷۳ء
۲۔	سید احتشام حسین	مقدمہ کلیات میرؔ	اسرار کریمی پریس	الٰہ آباد	۱۹۷۲ء
۳۔	ظلِ عباس عباسی	مقدمہ کلیات میرؔ	ترقی اُردو بیورو	نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۴۔	عبدالباری آسی	مقدمہ کلیات میرؔ	مطبع نول کشور	لکھنؤ	۱۹۴۰ء
۵۔	فرید احمد برکاتی	فرہنگ کلیات میرؔ	لاہوتی پرنٹ ایڈز پرنٹنگ پریس	دہلی	۱۹۸۸ء

Meer Tanqeed

Tazkaron Se Asr-e-Haazir Tak

Dr. Reshma Parveen

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com
978-81-8223-487-1